

18493

۹-هـ

۱۳۰۵ ی ۶۵

اندر سن بهی و صوبه دار اعظم
پند که نیای سکه گمان شود غا

۲۰/۱	۱۷۹	از اراضی جمعی
۵۵/۵	۱۹۳	از اراضی دولتی
۲۵/۵	۱۶۵	از اراضی دولتی
۱۵/۵	۱۶۵	از اراضی دولتی

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۵۵۶۰۳۱ Accession No. ۱۲۵

Author پ. ا. انڈرسن

Title سترکے سیاسی سیکالٹورڈ

This book should be returned on or before the date last marked below.

سلسلہ کتابت اسلامیہ جامعہ عثمانیہ

ہند کے سیاسی مسلک کا نشوونما

(۱۸۱۸ء تا ۱۸۵۸ء)

جی۔ انڈرسن اور ایم۔ صوبیدار کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ

انس

محمد عبدالستار صاحب ایم۔ اے ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن)

(سابق صدر انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ)

رکن سرشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کراچی

۱۳۵۴ھ م ۱۳۴۴ھ ق ۱۹۳۸ء

الطبع بمطبع دارالکتاب الاسلامیہ جامعہ عثمانیہ

یہ کتاب مسرزا نگمنس گرین اینڈ کمپنی کی
اجازت سے جن کو حق اشاعت حاصل ہے
اُردو میں ترجمہ کر کے طبع و شایع کی گئی ہے

ہند کے سیاسی مسلک کا نشو و نما

فہرست مضامین

صفحہ	
۱	پہلا باب : ہند کے سیاسی مسلک کی تائیس
۲	پُر امن ترقی کا دور
۵	ہند کے سیاسی مسلک کا مفہوم
۷	ہند کے سیاسی مسلک کے طریقے
۱۰	ہند کے سیاسی مسلک کے مقاصد
۱۵	ماؤنٹ اسٹوارٹ افنٹمن اور اس کا سیاسی مسلک
۲۱	ہندومت کی اصلاح
۲۵	پہلی برہمن سماج کے عبادت خانے کا وقف نامہ
۲۸	سارنچ میں موہن رائے کا درجہ
	برسٹل کے قریب وادی آرنو کے قبرستان میں رام موہن رائے
۳۰	کی قبر کا کتبہ
۳۲	دوسرا باب : عامل و مقنن حکام - قانون مشور بابت ۱۸۳۳ء
۳۳	حکومت ہند کے مقاصد
۳۵	قانون مشور بابت ۱۸۳۳ء کی دفعات کا خلاصہ
۴۰	قانون سازی کے طریقے
۴۸	حکومت ہند کے فرایض

صفحہ

۵۳	صدر حکومت سے ماتحت حکومتوں کے روابط
	تیسرا باب : انتظام عدالت - ہند کے سیاسی مسلک کے نشو و نما میں
۵۸	قانون کی اہمیت
۶۳	برطانوی ہند میں قوانین کی تدوین
۶۶	صدر عدالت کے منضاد کرشمے
۶۸	عدالتوں میں یورپیوں اور ہندوستانیوں کے باہمی روابط
۷۲	کلکتہ کی شورش
۷۷	عدالت کی ذیلی خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری
۸۲	چوتھا باب : سرکاری خدمات
۸۴	تربیت ملازمان دیوانی بہ مقام پہلی سری
۸۶	ہندوستان میں ملازمان دیوانی کی تربیت
۸۹	ملازمت دیوانی (سیول سروس) کی خوبی
۹۱	ہند کی ملازمت دیوانی (سیول سروس) کے لیے طریق مقابلہ
۹۹	سرکاری خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری
۱۰۷	رفع موانع
۱۱۰	سرکاری خدمات میں انگریزی زبان کا استعمال
۱۱۳	پانچواں باب : خلاف انسانیت رسوم کا انسداد
۱۱۵	ستی
۱۲۰	ستی کی موتوفی
۱۳۲	ٹھگی کا پیشہ
۱۳۶	ٹھگوں کا طریق کار
۱۳۸	مقصدیاب ٹھگوں کا ایک گروہ
۱۴۲	کتبہ بہ یادگار ولیم کونڈش بنڈک
۱۴۳	چھٹا باب : نظام تعلیم کی ترقی
۱۴۶	مغربی علوم کا نفاذ

صفحہ

۱۵۰		بہنی میں تعلیم
۱۵۲		نظام تعلیم میں ایک اہم تغیر
۱۷۵		مغربی علوم اور سیاسی ہیجان
۱۷۷		طریقہ جدید کی تنظیم
۱۸۱		دینی تعلیم؛ دینی نصاب
۱۸۲		دینی مدرسے کا انتظام
۱۸۴		تعلیمی مسلک کا بیان
۱۸۹		ساتواں باب: صحافت کی آزادی
۱۹۱		صحافت پر سخت نگرانی
۱۹۲		ہندوستان میں آزاد صحافت کے خطرات
۱۹۶		مطبوعات ہند ۱۸۳۷ء کے اوائل میں
۱۹۸		آزاد صحافت کے فوائد
۲۰۱		صحافت کی آزادی
۲۰۵		مملکت ریویو کی پہلی اشاعت
۲۰۷		آٹھواں باب: کمپنی کا آخری زمانہ
۲۰۸		۱۸۵۳ء کا قانون منشور
۲۱۲		نظام حکومت دو عملی کی تائید
۲۳۰		نظام حکومت دو عملی پر تبصرہ
۲۳۴		محکم ملک پر حکمرانی کا بہترین انتظام حکومت کمپنی کی حمایت میں
۲۴۱		ہندوستان کی آئندہ حکومت
۲۴۷		ہندوستان زیر حکومت تاج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہند کے سیاسی مسلک کا نشو و نما

پہلا باب

ہند کے سیاسی مسلک کی تائیں

۱۸۱۸ء میں مرہٹہ اور برطانوی فوجوں میں جب تک کہ طویل جنگ کا خاتمہ نہیں ہوا ہند کے سیاسی مسلک کے نشو و نما کا کوئی حقیقی موقع نہ تھا۔ اس وقت تک ہندوستان میں برطانیوں سے بیشتر یہ کام لیا جاتا تھا کہ برونی محلوں کے مقابلے میں وہ اپنے مقبوضات کی حفاظت کریں نیز باقاعدہ و باضابطہ حکومت قائم کریں جس کے بغیر کسی قسم کی ترقی ناممکن تھی۔ لیکن جنگ کرکی کے بعد امن و امان کا ایسا طویل دور جاری رہا کہ ہندوستان میں صدیوں تک اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا اور ۱۸۵۷ء میں سکھوں کی پہلی لڑائی کے چھٹے تک اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا یہ سچ ہے کہ افغانستان، سندھ اور برما میں اس وقت لڑائیاں ہو رہی تھیں مگر ان سے ملک کی عام حالت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اسی زمانے میں برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں سیاسی مسلک کے قائم کرنے کی جانب توجہ کی جو نہ صرف اپنی ماہیت کے لحاظ سے عجیب و غریب امر تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ بہت سے ایسے آدمیوں کا کام تھا جن میں تندر اور علم و فضل کے جوہر موجود تھے۔ ان میں کام کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے قلم میں بھی زور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی سرکاری رُودادیں غیر معمولی واقعات اور دانشمندانہ تجاویز سے لبریز ہیں۔ اتفاق ہے اس وقت انگلستان میں ایسے مدبر بھی موجود تھے جنہیں اصلاحات کی تجاویز پیش کرنے کی فکر تھی جو فی الحال جو سا لہا سال کی جنگ و جدل کے باعث مدت سے ملتوی تھیں۔ دونوں ملکوں یعنی انگلستان اور ہندوستان کی تاریخی مشابہت کو مسٹر رومیش چندر نے ذیل کے الفاظ میں نمایاں کیا ہے:-

* پرامن ترقی کا دور ماقبل کے کسی زمانے میں یورپ اور ہندوستان نے کبھی ایک پشت میں اتنی زیادہ حقیقی ترقی نہیں کی جتنی کہ جنگِ نپولین اور مرہٹوں کی آخری لڑائی کے بعد بیس سال میں مڑنا ہوئی۔

۱۸۵۷ء میں کبسل رے نے خود کو تباہ کیا۔ دارالعوام میں حیثیت ہر دور اس کا جانشین بلند ہمت کیننگ ہو جو ایک اعلیٰ مدبر، قادر الکلام مقرر اور دل سے سچا لبرل (جدت پسند) تھا۔ لارڈ لیور پول کے تحت جو ابھی تک وزیر اعظم تھا دارالعوام کی قیادت پر کیننگ کے تقرر سے ہارنچ انگلستان میں ایک جدید دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اس حریت پسندی کا جو انگلستان میں پیدا ہو رہی تھی سرکاری طور پر پہلا اعتراف ہے۔ اصلاحات جو ایک مدت سے معرض التوا میں

*

Source.—"England and India."

Romesch Chander Dutt.

(Chatto & Windus.)

۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک وزیر اعظم رہا مگر حقیقت میں اقتدار لارڈ کبسل رے کو حاصل تھا جو انہی وفات تک دارالعوام میں اپنی جماعت کا سرمدار رہا۔

پڑی ہوئی تھیں جلد جلد نافذ ہونے لگیں۔ انگلستان کے وحشیانہ ضوابط فوجداری جن کی رو سے معمولی جرائم پر سزائے موت دی جاتی تھی بتدریج تبدیل کیے جا رہے تھے۔ اسی طرح کے سخت قوانین جن کی بنا پر انگلستان کی مزدور ہمیشہ جماعتوں کی حیثیت غلاموں کی سی تھی اور جن کے ذریعے وہ باسانی اپنے آقاؤں کی محکوم بن گئی تھیں منسوخ کر دیے گئے اور بہتر اجرت حاصل کرنے کے لیے مزدوروں کے اجتماع کی مانعت باقی نہ رہی۔ ادنیٰ ترین نہیں بلکہ آخری موضوع بحث کیتھولک فرقے کو غلامی سے نجات دلانا تھا۔ اس فرقے کو ابھی تک دارالعوام میں شصت نہیں دی گئی تھی اور نہ تاج برطانیہ کے زیر حکومت اسے اہم عہدے ہی حاصل تھے۔ کیننگ نے کیتھولک فرقے کو تمام مجبوریوں سے بالکل آزاد کرانے کے لیے شریعت ہی کی۔

۱۸۳۳ء کا قانون اصلاح (۱۸۳۳ء) کے ساہائے مابعد میں اصلاحات کے نفاذ اور آزادانہ قانون سازی کا جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ انگلستان میں تعلیمی حالت بہت تھی اور ۱۸۳۳ء میں آبادی کے ہر گیارہ بچوں میں سے صرف ایک مدرسہ جاتا تھا۔ اس وقت قومی تعلیم کو ترقی دینے کے لیے حکومت نے تھوڑی سی رقم منظور کی۔ اسی سال بچوں کو کارخانوں میں کام پر لگانے سے روکا گیا۔ وہ قواعد جن سے کابل اور بیشہ و رفعتیوں کو بھیک مانگنے کی ترغیب ہوتی تھی اور جن کے باعث لوگ حقیقی طور پر محنت و مشقت کی طرف رجوع نہیں ہوتے تھے ۱۸۳۳ء میں تبدیل ہوئے۔ اخبار کے ہر پرچے پر چارپن کا بھاری اور ناقابل برداشت محصول لگنا اگر صرف ایک پینی کر دیا گیا اور اس طرح ۱۸۳۳ء میں اخبار نویسی سے متعلق قیود اٹھادی گئیں۔ ضوابط فوجداری کی مزید ترمیم بھی عمل میں آئی۔

اصلاحات کے اسی جوش و خروش سے نیز رعایا کی خوشحالی کو فروغ دینے کی خواہش سے اس ترقی کے زمانے میں انگلستان اور ہندوستان کا سیاسی مسلک ظہور پذیر ہوا۔ ہندوستان میں بھی اس وقت بلند پایہ اور فراخ چہلہ مدبر برسر حکومت تھے اور ان کے ساتھ انگلستان کے شریٹ اور آزاد خیال مدبر جن کے ہاتھ میں حکومت انگلستان کی باگ تھی کام کر رہے تھے۔ تاریخ ہند کو تاریخ انگلستان سے جدا کر کے پڑھنے کی کوشش کہ یہ معنی ہو چکے کہ کسی

چیز کے نتیجے کو بغیر اس کا سبب معلوم کیے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دونوں ملکوں کے حالات میں ایک ہی قوت عمل کا رفرما تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی رعایا کو حقوق عطا کرنا گویا انگلستان کے قانون اصلاح کا چربہ اتارنا تھا۔ کیننگ، گرے اور لارڈ جان رسل کی مانند منرو، الفنسٹن اور بٹلر اصلاحات کے ولولے رکھتے تھے۔

اسی امن کے زمانے میں برطانوی حکمرانوں نے حکومت کو مفید بنانے کے دشوار کام کے ساتھ ساتھ سیاسی مسلک ہند کی تشکیل کی جانب بھی توجہ کی۔ اس دور میں بٹلر، منرو، ہاؤسٹ، اسٹوارٹ الفنسٹن اور میکاف کے سب سے مشہور لوگ تھے۔ ان لوگوں کے سامنے اس وقت ایسے لاکھوں انسانوں کے لیے اطمینان و سکون بہم پہنچانے کا اہم مسئلہ پیش تھا جو ان سے تقریباً ہر بات میں مختلف تھے اور ایسی معاشرتی رسوم و عادات کی روایات کے تابع تھے جن کو ایک مغربی اکثریت نے معنی اور بعض اوقات خارج از انسانیت سمجھتا تھا۔ انھوں نے مذہب اور معاشرتی نظام کے متعلق مغربی خیالات کے تسلط سے اقوام ہند میں انتشار پیدا کرنے کے تمام منصوبے یک نخت رد کر دیے یہاں تک کہ وہ تحفظ قانون و امن اور عام انتظام ملک میں بھی حزم و احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ کام کرنے لگے اور بے محل جدت طرازی سے حتی الوسع محترز رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ایک ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کی جو ہندوستانی روایات سے بہت کم اختلاف رکھتا تھا اور جس کے تحت اہل ہند اپنی گزشتہ تاریخ کی روشنی میں نشوونما پا کر ذاتی رسوم اور مذہبی اعتقادات کو بحال رکھ سکتے تھے۔ جس راستے پر ان لوگوں نے چلنے کا عزم کیا تھا وہ حقیقت میں خطرناک تھا۔ ایک طرف اندرونی بے اطمینانی کا اندیشہ تھا اور دوسری جانب لندن کی مجلس نظایا کلکتہ کے انگریز باشندوں کی معن ظعن کا خوف تھا۔ لیکن اس وقت کے برطانوی حکمران اس قسم کی مشکلات سے مرعوب نہ ہوئے اور انھوں نے اپنے نہایت بلند پایہ تدبیر کا ثبوت دیا۔ انھوں نے امن بھی برقرار رکھا، باضابطہ حکومت کا ممکن العمل نظام بھی قائم کر لیا، ملک کی

مادی ضروریات پر بھی توجہ کی اور ساتھ ہی ساتھ رعایا کے قدیم معاشرتی و مذہبی نظام کو بھی بحال رکھا۔ لیکن جو رسوم بدیہی طور پر ناشائستہ اور خلاف انسانیت تھیں ان کے استیصال کے لیے وہ پورے طور پر آمادہ ہو گئے۔ جب کبھی رعایا کی مرض الحالی معرض خطر میں ہوتی تو جرات سے کام کرنے میں وہ پیچھے ہٹتے نہ کبھی اس عذر کی آڑ میں بزدلی سے پناہ لیتے کہ معاشرتی رسم و رواج میں مداخلت برطانوی حکومت کی بقا کے لیے خطرناک ہے اور اس لیے قابل نفیس بھی۔ ان کے سیاسی مسلک کی نمایاں خصوصیات ایک طرف صبر و تحمل اور دوسری طرف ہمت و عزیمت تھیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ایک تیز فہم نقاد ایم جی پی نے اس سیاسی مسلک کی اصلیت کی تشریح اپنے مشاہدے کے موافق کی ہے اور سر جان میلکم نے اپنے زیر دست اہل قلم لازموں کو ہدایت کرتے ہوئے اس طریقے کا اظہار کیا ہے جس کے مطابق اس سیاسی مسلک کے بروئے عمل آنے کی اسے توقع تھی اور مسٹر ہولٹ میکینزی نے مندرجہ ذیل اقتباس میں مسلک مذکور کے مقاصد کی توضیح کی ہے۔

* ہند کے سیاسی مسلک کا مفہوم

حکومت کو لازم ہے کہ یورپی تعصبات سے اپنے کو بری کرنے کی خواہش کے ساتھ طاقت بھی رکھے اور ملکی و انتظامی اصول جن کو وہ اب تک قبول کرتی رہی ہے غلط معلوم ہونے کی صورت میں ترک کر دے۔ اُسے عام تادیلوں کو رد کر کے غیر آزمودہ راہوں کی تلاش میں سیدھے راستے کو بھی چھوڑنے پر آمادہ رہنا چاہیے۔ نیز مقامی سیاسی مسلک کا اکثر یہ اعتقاد ہوا کرتا ہے کہ حکومت دینی و خداوند بننے کی خوش گوار پوشش یا سہل الحصول غرض ترک کر دے جس پر بیشمار لوگ آج کل اعتماد رکھتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ مسلسل مداخلت کی

* Source: (i). "Administrative Problems of British India"

M. Chailley.

(Macmillan & Co.)

عادت چھوڑے اور خواہ کتنی ہی مدت درکار کیوں نہ ہو اُس وقت کا انتظار کرے جب کہ وہ مناسب طریقے پر دخل دے سکے۔ جب لوگ کام کرتے رہیں اور واقعات رونما ہوتے رہیں تب وہ خاموش اور بظاہر غیر متوجہ رہے، اپنے پرستشہ کی نظر پڑنے کا موقع دے، نکتہ چینی برداشت کرے اور اُس ماں کی مانند جو اپنے شریکوں کو کبھی کبھی جھڑک دیتی ہے اپنے ہموطنوں کی بھی وہ وقتاً فوقتاً مخالفت کرتی رہے۔ حکومت کو جاننا چاہیے کہ قانون ناقص ہے لیکن اس علم کے باوجود وہ اس کی تبدیلی کے جذبے کو روکے، اُسے کچھ مدت تک ناقابلِ عمل اور نااہل جہدہ داروں کے ساتھ ہی نبھانا چاہیے۔ پھر بھی اُسے عدم مداخلت کو ایک مقررہ قاعدہ نہ بنالینا چاہیے، ضروری تبدیلیوں کو بروئے کار لانے کا مناسب موقع ڈھونڈنا چاہیے۔ اُسے معلوم ہو گا کہ رعایا اپنی قدیم رسوم اور ادارات کے ساتھ بڑی وابستگی رکھتی ہے اور ہماری تہذیب و تمدن کو قابلِ کشش اور خوش گوار نہیں پاتی لہذا اس کی طرف آہستہ آہستہ صبر و ہمت کے ساتھ اسی کی روایتوں کو نتیجہ خیز بناتے ہوئے اُسے لے چلنا چاہیے۔ اُس کی آنکھیں جبر سے نہیں کھولی جاسکتیں، اُس کو بطور خود دیکھنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف انگریزی پہلے لوگ ہیں جنہوں نے اس قسم کے مقامی سیاسی مسلک کی ضرورت کو محسوس کیا ہے نہ میں یہ کہتا ہوں کہ انہوں نے اس خطرناک زمین پر قدم رکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے، اُن کی تاریخ غلطیوں سے پر ہے لیکن انہوں نے اصول بھی قائم کیے ہیں اور ان پر عمل بھی کیا ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں مسلسل طور پر اور باہمیت مجموعی ایک صدی سے زائد مدت تک مختلف اوقات میں وہ ایک خاص مقامی سیاسی مسلک پر جیسا کہ اس کا مفہوم میرے ذہن میں ہے عمل پیرا رہے ہیں۔

چوں کہ وہ خود امیر تھے اس لیے ہندوستان میں پہلے پہل اُن کے روابط نوابوں اور امیروں سے قائم ہوئے لیکن جتنا جتنا انہیں تجربہ

حاصل ہوتا گیا اور وہ ہندوستانی سوسائٹی کی تنظیم کو سمجھنے لگے وہ عام طور پر رعایا سے ملنے جلتے لیجے۔ بہر حال اس نئے میل جول کے بعد انھوں نے اپنے پرانے روابط منقطع نہ کیے۔ ایسے موقعوں پر بھی جب کہ ہندوستانی فرماں روا ان کے نزدیک ناکارہ ثابت ہوئے انہیں بحال رکھا گیا، ان کی حفاظت کی گئی اور اکثر وہ مالک انہیں واپس کیے گئے جو انھوں نے کھو دیے تھے۔ ان انگریزوں نے ان دشمنوں سے بھی کام لیا جو حال میں مغلوب ہوئے تھے مثلاً برہما میں شاہ بیجا کے وزیرا سے جدید برطانوی حکومت نے فائدہ اٹھایا اور ان میں سے جو لوگ ابھی تک زندہ ہیں وہ دلیپے پاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان سے مشورے طلب کیے جاتے ہیں۔

مذکور بالا سیاسی مسلک بار آور ہوا۔ بے شبہ اس کی سخت آزمائش ۱۸۵۷ء میں غدر کے وقت ہوئی تھی لیکن فوجی اور سیاسی غلطیاں اس واقعہ ہائلہ کی تشریح کرتی ہیں اور اگرچہ انگریز اس وقت مایوس ہو گئے تھے تاہم دسپول افد فوجی عہدہ داروں کو اپنے آدمیوں کے متعلق اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک مرتبہ اور یہ رائے قایم کی کہ ہندوستانیوں کے دل ہاتھ میں لے لینا ممکنات سے ہے اور اس طرح اپنا سابق مسلک دوبارہ اختیار کیا۔ فی الحقیقت انھوں نے اس مسلک کو ایک عظیم تر رقبہ پر جاری کر کے ترقی دی اور اسے زیادہ باقاعدہ اور ہر آمیز بنا دیا۔

تقریباً ایسے تمام اشخاص جو اپنے سنجار اور معلومات کی مدد سے مخصوص مسائل پر رائے زنی کرنے کے قابل ہیں اس امر سے اتفاق رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ہماری قوت کا انحصار ان ہندوستانیوں کی رائے عامہ پر ہے

ہند کے سیاسی
مسلک کے طریقے

جن کے دلوں میں اپنے حکمرانوں کی طاقت و دانشمندی اور اعتماد و صداقت کی وقعت نسبتاً زیادہ ہے۔ اگر ہم ہندوستانیوں کی عادات، ادارات اور ان کے مذہب کا لحاظ کرتے رہیں گے اور ان کے ساتھ اعتدال پسندی، نیک مزاجی اور مہربانی سے پیش آتے رہیں گے تو ان کے اس اہم خیال میں اضافہ ہوتا ہوگا اور ہمارے ہر ایسے فعل سے اس میں کمی واقع ہوگی جو ان کے اعتقادات یا توہمات کے خلاف ہو یا جس سے افراد یا کسی فرقے کے ساتھ بھاری غفلت یا بے اعتنائی ظاہر ہو یا یہ مترشح ہو کہ ہم میں وہ سخت پیدا ہو گئی ہے جو عموماً فائین میں پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے ہم ان اصول کو فراموش کر رہے ہیں جن کے ذریعے اس عظیم الشان سلطنت کا قیام عمل میں آیا ہے اور جن کی پابندی ہی سے وہ مامون و مطمئن رہ سکتی ہے۔

ہماری کامیابی اور میانہ روی کی بدولت اس بد انتظامی اور چہرہ دستی کے مقابلے میں جس کا اثر ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر ایک صدی سے زیادہ مدت تک رہا ہے برطانوی قوم کی شہرت اس وقت اس قدر بلند ہے کہ لوگوں نے اپنی حکمرانوں کے تحت سلامتی و خوش حالی کی دھن میں حب وطن کے جذبات کو فراموش کر دیا ہے لیکن یہ ایسے جذبات ہیں جن کا اس علم کے ساتھ ہی کہ ان کا پیدا کرنا ہمارا فرض ہے ابھرتا اور بروئے عمل ہونا ناگزیر ہے۔ باشندگان ہند کو غیر ملکی آقاؤں کی مسلسل محکومیت میں رہنے کی ذلت کا معاوضہ اس احساس پیہم سے ملنا چاہیے کہ انہیں فوائد پہنچ رہے ہیں اور یہ محض ان افراد کی متحدہ مساعی کے ذریعے ممکن ہے جو اعتماد و ذمہ داری کی خدمت پر اس لیے مامور ہوں کہ ایک ایسی حکومت کو ہر دل عزیز بنائیں جو اگرچہ قومی حکومت نہیں ہے لیکن اس کی بنیاد رواداری، انصاف اور حکمت کے اصول پر مضبوطی کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ حکومت کے ہر کارکن کو چاہیے کہ مذکور بالا امور پر غور و فکر کرے اور ان کو سمجھے۔ جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کی رسموں اور زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر اسے قانع نہ رہنا چاہیے۔ اسے ہماری حکومت کی بنیادوں کی جانب رجوع ہو کر اپنی تمام

مخصوص کارروائیوں کو (نیز اپنے طریق کار کو) باقاعدہ ترتیب دینا چاہیے اور ان اصول کا احتیاط سے مشاہدہ کرنا چاہیے جن کے ذریعے حکومت قائم کی گئی ہے اور جو تنہا اس کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس معاملے کی اہمیت کے متعلق میں کوئی رائے اپنے اس یقین کامل کے اظہار سے بڑھ کر نہیں دے سکتا کہ ہر لائق ہمدہ دار کے مقرر فرایض کی انجام دہی سے قطع نظر کوئی ذی ذمہ شخص ایسا نہیں ہے جو طاہری و باطنی طور پر اپنی روزانہ زندگی کے کاروبار میں کچھ نہ کچھ نہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل جب اس کے محکوم حلقے کے خیالات کے ساتھ ساتھ سلطنت کے عام مفاد پر عمل کرنے لگتا ہے تب اس حکومت کو جہاں وہ مامور ہے قوی بنانے یا کمزور کرنے میں غیر محسوس اثر رکھتا ہے۔

آپ سے معمولی امور کے استہام دینے کی درخواست نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ کہ آپ اختیارات رکھیں مگر شاذ و نادر ہی ان کا استعمال کریں، ان خرابیوں کا مطالعہ کریں جو آپ کے خیال میں قابل اصلاح ہوں، تعصبات و توہمات سے متعلق غلطیوں پر خواہ وہ جہادیم نہ ہوں نظر رکھیں اور بد انتظامی کی مصائب بھی پیش نظر رہیں۔ ہاں ہمد محرز ہیں کہ مبالغہ آپ اپنے محدود فرایض کے دائرے سے باہر اگر ملکی مفاد کو عظیم تر مضرت پہنچائیں اور غیر واجب تغیر اور جدید دستور کے ذریعے جس سے مقامی فلاح و بہبود کا امکان ہو عام ترقی کی دھیمی مگر یقینی فائدہ میں رکاوٹ یا وقت پیدا کریں کوئی شے آپ کو ان تمام باتوں پر ثابت قدم نہیں رکھ سکتی بجز ان لگاتار کوششوں کے جن سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہو اور آپ کے دل و دماغ کو ہندوستان میں برطانوی طاقت کی نوعیت اور اس سلطنت کی حیثیت پر جس پر یہ طاقت مسلط ہے غور و فکر کرنے کی عادت پڑے۔ سلطنت ہند جو اپنے تمام علاقوں اور حکومتوں کے ساتھ متعدد فرقوں اور قوموں پر مشتمل ہے (گو بطور استعارہ کیوں نہ ہو) درحقیقت ایک وسیع و قدیم عمارت کی مانند خیال کی جاسکتی ہے جس میں وضع داری و خوبصورتی تو ہے لیکن اس کے اکثر حصے شکستہ حالت میں ہیں اور کم و بیش سب ویران ہو گئے ہیں تاہم یہ ایک کل عمارت ہے اور اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے متصل ہیں

اس کی بنیادیں مستحکم ہیں اور محرابیں عین چوٹی تک ایک دوسرے پر قائم ہیں۔ ہم اب اس کے مالک ہیں اور اگر ہماری یہ خواہش ہو کہ ہم اس میں اضافہ کریں اور اسے برقرار بھی رکھیں تو ہمیں اس کی وضع اور ساخت نیز اس کے ہر حصے کی فونی اور خرابی سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا پتھر بھی نہ ٹھاننا چاہیے جب تک کہ خالی شدہ جگہ کے پر کرنے کے لیے کوئی دوسرا موزوں پتھر تیار نہ ہو ورنہ غفلت کے باعث ہم ایک ایسے ملک میں اپنے اور دوسرے کے سروں پر آفت ڈھا بیٹھیں جہاں ہمیں اپنی غفلت و مشہرت کی یادگار قائم کرنے کی بھید تمنا ہے۔

* ہند کے سیاسی
مسلک کے مقاصد کی بہتر تقسیم کر سکتے ہیں اور بالآخر حسب ذیل تدابیر میں سے چند یا تمام کے ذریعے بصورت ضرورت مالگزاروں میں سختی بخشنے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

مالکان ارضی کے ذمے واجب الادا رقم کا بندوبست طویل مدت کے لیے اس طرح کیا جائے کہ حصول کے نینیں سے سرکاری مالگزاری کئے اور یہ کے علاوہ باقی زائد آمدنی مالگزاری ان کے حق میں ایک حوصلہ افزا ملکیت ثابت ہو اور یہ سب کچھ پیمائش زمین اور وثیقہ تحسیر کے ساتھ عمل میں آئے تاکہ بندوبست کی شرائط کے متعلق سارے فنکو کو رفع ہو جائیں۔ اہل یورپ امدان کی اولاد کو بسانے کی کوشش کی جائے اور انہیں ترغیب دلائی جائے کہ وہ اپنی قوت قابلیت اور سرمائے کو زراعت میں صرف کریں۔ ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم اور تمدن کی تعلیم دی جائے۔

* Source.—Views of Holt Mackenzie in reply to questions from the Board of Control and reported to the House of Commons in 1832. Quoted in Calcutta Review, No. LVI.

لازمت کے فائدہ میں ہندوستانیوں کا حصہ بڑھایا جائے۔ مسلحی مگر بتدریج پتہ زور مساعی کے ذریعے ملک کے نظم و نسق کو زیادہ مقبول عام بنایا جائے۔ ملک کے اندر و سالی آمد و رفت میں آسائیاں پیدا کرنے کی غرض سے مقبول رقم کفایت اور اقصیاط سے خرچ کی جائے۔ ہندوستان میں یا انگلستان اور ہندوستان کے مابین تمام غیر ضروری رکاوٹیں جو تجارت کے منہر و غ میں حایل ہوں دور کی جائیں۔ ہندوستان میں سود کے قانون کو منسوخ کر کے تجارتی قانون کا ایک عمدہ نظام عام طور پر جاری کیا جائے اور کاروبار، عجلت کے ساتھ کم مصارف میں طے پانے کے لیے عدالتیں قائم کی جائیں۔

خوبی کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے افراد یا جماعتوں کا لحاظ کیے بغیر عہدہ داروں کی تنخواہوں کا ان کے کام کی نوعیت کے مطابق تعین کیا جائے، مزید برآں سیول حکومت میں انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کو محفوظ و برقرار رکھا جائے۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی کارکنوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور انہیں مقبول بھتہ و جواہل یورپ کے مقابلے میں کم ہوا دیا جائے۔ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے تمام یورپی عہدہ داروں کے اختیارات کو (جن میں جج، مجسٹریٹ اور اضلاع کے کلکٹر سب کو شامل کرتا ہوں) ان کارروائیوں تک محدود کیا جائے جن میں ان کی مداخلت ناگزیر ہو۔ ایک یا دو غیر ملکی فرد کے بالکلیہ توسط سے دس لاکھ ہندو انسانوں کے کاروبار چلانے کی کوشش کے لغو ہونے کا کافی اعتراف کیا جائے اور اس اصول کو بروئے کار لایا جائے کہ ہمیں فی الواقع سیول حکومت میں کامیابی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہمیں رعایا کی اعانت حاصل نہ ہو۔ ان ملازموں کو جو عارضی طور پر انگلستان سے مستعار لیے گئے ہیں ایسے تمام فرائض سے رفتہ رفتہ سبکدوش کیا جائے جن کی انجام دہی انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ جماعتوں کی بجائے افراد کا عام طور پر زیادہ تقرر کیا جائے۔ مقامی حکومتوں خاص کر صدر حکومت کو ان ذیلی امور کی ذمہ داری سے فوراً مستثنیٰ کیا جائے جن کو فی الحقیقت وہ کار آمد طریقے پر انجام نہیں دے سکتی۔ بہرکاری عہدہ داروں کی تمام جماعتوں کی جو

حقیقی ذمہ داریاں ہوں ان کی تشریح صاف طور پر کی جائے۔ سارے ہندوستان کے لیے ایک گورنر جنرل اور کونسل کا تقرر کیا جائے اور اس کے اختیارات و فرائض کی ایسی توضیح کی جائے جو درحقیقت اس کے شایانِ شان ہو نہ کہ برائے نام بینوں احوالوں کی فوجوں کو باہم ضم کر کے ایک شخص کے تحت رکھا جائے اور اس متحدہ فوج کے تمام نظم و نسق کو راج برطانیہ کے حوالے کیا جائے۔ برطانیہ کے بیڑے یا ہندوستانی بیڑے کی کجما سے شاہی بیڑے کا ایک حصہ قائم کیا جائے۔ ہندوستانی حکومتوں کے مطلوبہ ذخیرے کی رسد کا بہتر انتظام کیا جائے۔ امور عام کے مصارف کی تنقیح زیادہ سختی سے کی جائے۔ مجلسِ نظام اور مجلسِ نگران کے اختیارات کی ملحدہ و ملحدہ مناسب توضیح کی جائے۔

اربابِ اقتدار کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر طرح کی سہرستی اٹھادی جائے۔ میرے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے فوجی امور میں توپ خانے کے قیام اور دیگر قومی انتظامات کے ذریعے جو انگلستان کے اکثر محکموں میں ضروری تصور کیے جاتے ہیں کفایتی اخراجات کو وسیع کیا جاسکتا ہے جزیرہ لنکا میرے خیال میں حکومت ہند کا جزو ہونا چاہیے۔ سینٹ میلینیا ایک قومی علاقہ تصور کیا جائے اور جو محاصل ہمارے قومی اقتدار اعلیٰ کی بدولت ہندوستان کی رعایا سے لیے جاتے ہیں ان کا تعلق بے شبہ انگلستان کے محاصل ملکی سے سمجھنا چاہیے تاکہ ہمارے مصارف ملکی میں ہر سمیت ایک قومی سمیت اور ہماری ملکی دولت کا بیجا صرفِ قوم کے سرمائے کا اتلاف خیال کیا جاسکے۔

اس زمانے کے تمام برطانوی حکمرانوں میں شاید ماؤنٹ اسٹوارٹ افضلین ہی ایک ایسا شخص تھا جو سیاسی مسلک کے تصور کو جس کی تشریح ایم جی نے اوپر کی ہے قبول کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ زمانہ حال کے باشندگان ہند اسے اپنے دوسرے برطانوی حکمرانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہمزیم احساسات کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ الیٹ انڈیا کمپنی کے تمام محرر ملازموں کی طرح وہ بھی بہت نوعمری میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کی ملازمت کے ابتدائی سال ناگپور اور پونا کی سفارت کے دشوار کام میں ایسے وقت بسر ہوئے

تھے جب کہ مرٹنوں کی متحدہ حکومت کا آخری پیراز واقعات دور تھا اور اس سے بڑھ کر میدان جنگ کے دل سوز فرائض کی انجام دہی درپیش تھی۔ آرٹھر ولزلی کے اشارات کی جانب سے بحیثیت مترجم جب کہ وہ جنگ آسائی میں شریک تھا تو اس کے سردار نے یہ کہا تھا کہ "تم نے اپنے پیشے کا غلط انتخاب کیا ہے، تمہیں ایک سپاہی بننا چاہیے تھا۔" پونا کے رزیڈنٹ کی حیثیت سے وہ ایسے تشویش انگیز زمانے میں کار فرما رہا جو پیشوا کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوا فی الحقیقت وہ ایسے نازک موقعوں پر بھی جب کہ اس کی جان سخت ترین خطرے میں پڑ جاتی تھی حتیٰ الوسع آخر لمحے تک اپنی جگہ پر قائم رہتا اور کرکئی کی برطانوی فوج میں شریک ہونے کے لیے جب سوار ہو کر حلا جا رہا تھا تو پلٹ کر کیا دیکھتا ہے کہ رزیڈنسی کی عمارت سے جسے اس کے ٹکلتے ہی آگ لگا دی گئی تھی شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ جنگ میں بھی اس نے عملی طور پر انتہائی چالاکی اور بہادری کا اظہار کیا اور جو فتح بعد کو نصیب ہوئی اس کے حصول میں بڑی حد تک اسی کا ہاتھ تھا۔ دارالعوام میں کیننگ نے اس کے دلیرانہ کرنل کی ذیل کے الفاظ میں تعریف کی:-

مدرسہ القسطن نے جس کا نام مشرق کی سیاست اور ادب میں ممتاز درجہ رکھتا ہے ایک صبر آزا موقع پر فوجی حرب میں ایسی شجاعت و بہادری کا اظہار کیا جو اگرچہ قابلیت و معاملہ فہمی کے اہم جز ہیں تاہم سیول ملازمت کے لیے اہم نہیں ضروری و صفت نہیں قرار دے سکتے۔ صرف ایک ہی وقت نہیں بلکہ اس معرکہ عظیم کے دوران میں کئی موقعوں پر مدرسہ القسطن نے اپنے ہنر و کمال کے ایسے جوہر دکھائے جن کے ذریعے کسی ملک میں بھی جہاں سہ سالہ شہرت و فضیلت رکھتے ہیں وہ ایک اعلیٰ سہ سالہ ہو سکتا تھا۔

جنگ کے اختتام پر القسطن، پونا کا کاشن بن گیا اور ۱۸۱۸ء میں کیننگ نے اسے منرو اور میلم پر ترجیح دے کر بنگالی کا گورنر مقرر کیا۔ یہ امر تعجب خیز ہو سکتا ہے کہ ہند کے دو فرتے سکھ اور مرہٹے جنہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں برطانوی فوجوں کا نہایت سختی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا

شکست کھانے کے بعد بہت جلد سلطنت برطانیہ کے امن پسند شہری ہو گئے۔ برطانوی راج کو امن پسند طریقے سے سکھوں کے قبول کر لینے میں زیادہ تر مہتری لارنس کی سیاست دانی اور دانشمندی کا دخل تھا جس پر سابق جلد میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے اور جس تیزی اور بظاہر آسانی سے خوفناک گھاٹیوں اور ڈھلوان پہاڑوں والے ملک پر جہاں مرہٹوں کی جنگجو نسل آباد تھی برطانوی حکومت قائم ہو گئی اس میں خاص طور پر الفنسٹن کی شخصیت کا اثر تھا۔ آئندہ اقتباس میں جو مسٹر فارلیٹ کی تحریروں سے ماخوذ ہے ان اصول کی تشریح کی جا چکی جو الفنسٹن کے سیاسی مسلک میں ایک ایسے مسئلے کے حل کرنے کے لیے رہنمائی کرتے رہے جس میں بہت زیادہ استقلال اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس امر کی شہادت کہ الفنسٹن بوقت ضرورت مستقل مزاج رہتا تھا ایک اور واقعے سے بھی ملتی ہے جس کا حوالہ مسٹر فارلیٹ ہی نے دیا ہے۔ جب پیشوا کی بحالی کے لیے چند برہمنوں نے سازش کا جال بچھایا تو الفنسٹن نے فوراً خود کو ایک سخت گیر شخص ثابت کر دکھایا اور اپنے حکم سے سرغنوں کو توپ کے منہ سے اڑا دیا۔ اس فعل کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہوئے گورنر بمبئی نے الفنسٹن کو مشورہ دیا کہ اُسے قانونی گرفت سے محفوظ رہنے کی درخواست کرنی چاہیے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ”اگر میں نے غلطی کی ہے تو مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اگر میں حق بجانب ہوں تو قانونی گرفت کے متعلق مجھے کسی قسم کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

الفسٹن کی قدر و منزلت اس کے زیر حکومت ہندوستانیوں کے سپاس نامے سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے اس کی مراجعت وطن کے وقت اُسے پیش کیا تھا۔ مزید براں ہندوستانیوں نے بیس ہزار پونڈ چندہ دیا جو اس کی یادگار میں مصلیٰ قائم کرنے کے کام آیا۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداء دار البلد میں ان انگریز عالموں نے خطبے دیے جو اسی غرض سے ہندوستان بلائے گئے تھے لیکن بعد کو یہ سرمایہ ایک کالج کی امداد میں لگایا گیا جو آج تک الفنسٹن کے اسم گرامی سے موسوم ہے اور جہاں زمانہ کا

کے بعض نہایت فاضل اور جمہور پسند ہندوستانیوں نے تعلیم پائی ہے۔ اس سے زیادہ موزوں یادگار ایک دور میں مدبر کے اعزاز میں جس نے ہندوستان پر حکومت کی قیام نہیں ہو سکتی تھی۔

* **ماؤنٹ اسٹوارٹ** گزشتہ شاندار اور عظیمہ جنگ کے دوران میں ہونیئر مونی الفنسٹن اور اس کا جوش و خروش اور ہنر و کمال تحقیق کے بہت سے اہل قلم اور فوجی سیاسی مسلک لازموں کی جانب سے ظاہر ہوا اور جو عجیب و غریب صورت حال اس جنگ کے نتائج سے آپ کے احاطہ بمعنی

کے معاملات میں پیدا ہو گئی ہے اس سے میرے نزدیک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام قاعدے سے انحراف کر کے آپ ہی کے لازموں کو ترجیح دینا اس وقت مناسب اور قرین مصلحت ہوگا۔

مزید برآں یہ امر بھی میرے پیش نظر ہے کہ آپ کے لازموں کی تعداد فراتی زیادہ نمایاں ہوگی اگر حکومت انگلستان انھیں کے انتخاب سے اتفاق کرنے پر اپنی آمادگی کا اظہار پہلے ہی ایک اعلان کے ذریعہ کر دے بشرطیکہ مجلس نظامیسی تجویز کرنا مناسب سمجھے۔ کسی ایک شخص کا نام اس قسم کے اعلان میں شامل کرنے سے اس کے مقاصد کے غلط معنی لیے جانے کا اندیشہ باقی رہیگا لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کا نام نہ لینے سے ہر شخص کی نامزدگی کے بارے میں اعتراض ہونے کا پورا پورا موقع برقرار رہیگا۔

وہ اصحاب جن کے ناموں کا میں نے ذکر کیا ہے میرے ہی منتخب کردہ ہیں اور آپ کے زیر حکومت مختلف محکموں میں اور اس منظر کارزار میں جس کا ہم نے بہت ہی تیزی سے مشاہدہ کیا ہے اپنی قابلیت اور ذاتی جوہر کی بدولت

Source.—(i) Letter from Mr. Canning to the Court of Directors. Dated September 21, 1818. (Parliamentary Papers.)

۱۔ اس موقع پر گورنر مہی کے تقریر کی ضرورت نہ تھی۔
۲۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ، الفنسٹن، جان میکمل، تھامس موز۔

مشہور ہیں۔ مجھ کو ان اصحاب کے انتخاب سے دوسروں کی اہانت مقصود نہیں ہے جن کے اعلیٰ و ارفع اوصاف ان کے مقابلے میں بخوبی پیش ہو سکتے ہیں نیز میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تینوں میں سے صرف ایک شخصیت ایسی ہے جس سے مجھے ذاتی واقفیت کا فخر حاصل ہے۔

آپ کے نزدیک ترجیح خواہ کسی کو ہو میرے لیے ہمیشہ یہ امر باعث اطمینان ہو گا کہ جن اصحاب کے نام میں نے خصوصیت کے ساتھ پیش کیے ہیں نہ صرف ان کی لیاقت اور کارگزاری کے متعلق بلکہ آپ کے جملہ ملازموں کی عام قابلیت اور کردار کے بارے میں مجھے اپنے اعلیٰ و منصفانہ خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔
* ایک حاکم کی حیثیت سے مائونٹ اسٹوارٹ الفینسٹن کی کامیابی کا خاکہ

یہ سبب ہوا کہ وہ اس بات کو سمجھ گیا کہ سیاسی ادارات و معاشرتی معمولات جو صدیوں سے قائم ہیں کلیتہً خالی از وصف نہیں ہو سکتے۔ ملک کے نظم و نسق میں اس کی بڑی کوشش یہ رہی کہ رسوم پر یہ روشن ہو جائے کہ انہیں کسی تبدیلی کا خیال دل میں نہ رکھنا چاہیے بجز اس کے کہ بہتر انتظام کی خاطر ان کے ساتھی قوانین میں کچھ رو بہ بدل ہوتا رہے گا۔ اس نے محسوس کیا کہ لوگوں کے نہ صرف حقوق کا بلکہ ان کے تعصبات کا بھی اختتام ہونا چاہیے۔ گورنر جنرل کو وہ لکھتا ہے کہ بہر حال یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک انصاف پسند حکومت بھی منفعت بخش نہیں ہوگی اگر وہ رعایا کی خصال و عادات کے خلاف ہو۔
مائونٹ اسٹوارٹ الفینسٹن جانتا تھا کہ پر ویسی حکومت ہمیشہ کٹھن ثابت ہوگی اور فاتح زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اس بات سے خبردار ہیں کہ خود کا بوجھ تاحداً امکان ہلکا رہے اور زخم بہت ہی کم واقع ہو۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز نے الفینسٹن کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ وہ ستارا کے راجہ کو ایک جاگیر دے یا کوئی چھوٹی سلطنت۔ الفینسٹن نے موخر الذکر صورت اختیار کی کیوں کہ اسے اس امر کی

* Source.—(ii) "Official Writings of Mountstuart Elphinstone." Edited

by G.W. Forrest. (Richard Bentley & Son.)

اہمیت کا علم تھا کہ پیشوا کی رعایا میں سے کچھ لوگوں کے حق میں ایسی حکومت ہونی چاہیے جو ان کے طریقوں کے مطابق ان کی مدد و معاون ہو سکے۔ مستارا پر راجہ کے دوبارہ برسر حکومت ہونے سے قدیم مہارہٹہ سردار پیشوا کی جدید تر حکومت کو تنہا ہی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک حد تک متحد ہو گئے۔ انگریزوں کی آئندہ جولانی ہوئی وہ سیواجی کے خاندان کے خلاف نہ تھی البتہ وہ ایک با اثر حاجب سے جنگ آزماتھے۔ اگرچہ اکثر قدیم گھرانوں نے (جن کا طرز عمل شوکت نمائی کی خاطر بطور یادگار درج رہنا چاہیے) اپنے شکست خوردہ شہزادوں کی مصیبت میں ہاتھ بٹانے کا قصد کیا لیکن کثیر تعداد نے فاتحین کے ساتھ وفا شعار کی کا اظہار کیا۔ ان قدیم خاندانوں کو تنہا ہی سے بچانا اور ان کے اثر و رسوخ کو بحال رکھنا مسٹر افٹنسن نے اپنا فرض اولین سمجھا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسلامی حکومت کے سرداروں کی طرح دکن کے امراء عوام کے نزدیک اجنبی نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے ہم قوم اور ہم مذہب ہیں اور انھیں کی نسل سے ہیں جو اپنی مختاری کے زمانے سے ان کے سردار رہ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں مقامی شہزادوں کی جگہ اپنے نمائندے مقرر کر کے اور ملکی آئین و تنظیم کی بجائے اپنے قوانین نافذ کر کے کبھی یورپی کامیابی حاصل نہیں کی، اس لیے اس نے حتی الوسع اس کام سے بچنے کی کوشش کی جس میں مسلمانوں کو ناکامی ہو چکی تھی۔ اسناد و بناوت کے ساتھ ساتھ مالگزاری کا بند و بست بھی ہو گیا۔ نافذ شدہ قانون اراضی فی نفعہ نانافرنولیس کے نظام کی ابووتی تجویز سے مختلف نہیں تھا جس کے ذریعے سرکاری گامشتے رعایا سے بلا واسطہ معاملہ کرتے تھے طریق رعیت داری کی خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت ہم رعیت سے اور رعیت ہم سے واقفیت حاصل کر سکتی ہے۔ باجی راؤ کے طریق اجارہ داری کی تیغ سے جس کی رو سے اضلاع ٹھیکہ داروں کو پٹے پر دیے جاتے تھے بہت سی شکایتیں دور ہو گئیں۔ مسٹر افٹنسن نے یہ محسوس کیا کہ ہر انقلاب کے ساتھ نئی نئی چیزیں کاہونا بھی ضروری ہے اور اس نے ان کی تعداد ممکن حد تک گھٹانے کی کوشش کی۔

اس نے کلکٹروں کو حکم دیا کہ ان توہم کی پابندی کے سوا جو مسلم سمجھے جائیں کسی اور دستور العمل کو سہ کار ہی کا روبرو رکھے اجراء میں دخل نہ ہوا اور حتی المقدور اس سعی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا کہ عوام کے احساس باطنی میں وہی روح پیدا ہو جائے جس نے کسی وقت ان دیہاتی بجاہتوں اور قدیم اداروں میں جان ڈال دی تھی جو ایک مدت دراز سے قائم ہیں اور جنہیں صدیوں کی لگاتار جفا کا ریل اور بد اعمالیاں پوری طرح معدوم نہیں کر سکی ہیں۔ اس نے دیہات کے حکام کے ناموں و وقار کی حفاظت کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان اور اس کے دیہاتوں اور باشندوں پر حقیقی حکمرانی کرنا ایک اجنبی حکومت کے لیے بڑا کٹھن کام ہے اور یہ مقامی حکومت اور ہندوستانی حکام ہی کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔ مسٹر آکسٹن عدل گسٹری کے اس اہم معاملے کی نسبت انگریزی نظم کے نفاذ اور انجیز حکام کے تقرر میں مہلت کر لے سے باز رہا کیونکہ عوام کے متعلق اس کے علم و تجربے نے یہ اس کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ معاشری حالت اور تمدن کے لحاظ سے جس کا ہند کے لاکھوں باشندوں سے تعلق ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انتظام عدالت میں آسانی، ارزانی اور شتاب کاری ہو۔ ہندوستانی حکومت میں عدل و انصاف کا خاص آلہ کار پنچایت، یعنی دیہات کے بزرگ افراد کی جماعت ہے۔ اس قدیم جماعت کے جہاں کئی نقالیں ہیں وہاں اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ آکسٹن لکھتا ہے: ”چوں کہ اس جماعت کے ارکان اکثر مقامات اور فریقین کے مختلف حالات سے ذاتی طور پر واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے فیصلے بیشتر صحیح ہونے چاہئیں، اور اس طریق تحقیقات کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ جو ”عوام کے گروہ سے منتخب ہوتے ہیں وہ ایسے اصول پر کاربند نہیں ہو سکتے جو مافہم نہ ہوں، یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو قانون کی جھجک و بے اطمینانی کا سد باب کر کے منہ باز کی تیج کٹی کرتی ہے۔ مسٹر آکسٹن کا خیال تھا کہ ملکی طریقے کو مٹانا فاتحوں کا نصب العین نہ ہونا چاہیے بلکہ انہیں ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جو مذکورہ طریقے کی خرابیوں کو دور کر کے اس کی قوت کو از سر نو تازگی بخشیں۔

۱۸۲۹ء میں احاطہ بھٹی کے مقامی باشندوں وغیرہ نے مندرج ذیل سپاس نامہ مائٹلفٹن کو اس کی مراجعت وطن کے وقت پیش کیا۔

* ہم بھٹی اس کے ذیلی علاقوں اور متحدہ عملداریوں کے مقامی شہزادے سردار شریف زادے اور باشندے اپنے نہایت عمیق و دیر پارنچ و طال کو جو اس احاطے کی حکومت سے آپ کے مستغنی ہونے پر ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے ظاہر کرنے کی کوشش کیے بغیر خواہ وہ کسی ہی کمزور کیوں نہ ہو اس ملک سے آپ کی قریبی مفارقت کا خیال نہیں کر سکتے کیونکہ دکن کی کشمیری اور بھٹی کی گورنری کی خدمت پر آپ کے فائز ہونے تک ہم پہلے کبھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ اس بے بہا فائدہ رسائی کی صحیح طور پر قدر دانی کریں جس کا لغو سارے ہندوستان میں برطانوی مملکت کی بدولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے اپنی خوش خلقی، ہمت افزا طرز عمل اور بے تعصبی کے ساتھ ساتھ اس ملک کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور مفاد کی طرف ہر وقت جو توجہ فرمائی، ان کے قدیم قوانین و رسوم کی جانب جو التفات کیا، ان کے درمیان دماغی و اخلاقی ترقی کے عمدہ موقوفوں کو وسعت دینے کی جو پیہم کوشش کی اور آپ نے تمام جماعتوں کی درامی بہتری کا اطمینان دلانے اور صحیح ترین اصول پر ان کی آسودگی کو برٹمانے میں اپنی جو مستند قابلیت صرف کی ان سب اوصاف نے جن کو ہم حیرت سے بہت طویل زمانے تک دیکھ چکے ہیں اور جن سے آپ کی خانگی و سرکاری زندگی کو چار چاند لگ گئے ہیں اس خیال کے قایم کرنے میں ہماری رہنمائی کی ہے کہ برطانوی حکومت کا اثر و غلبہ ایک بڑی بھالائی اور منہ مانگی رحمت الہی ہے جو قادر مطلق ہمارے وطن کو عطا کر سکتا تھا۔

اس وقت جب کہ مائٹلفٹن ایسے حکمران ایک خاص سیاسی مسلک کی تشکیل میں مصروف تھے جس کا مقصد ماضی کی رسوم و روایات کی حفاظت کرنا

* Source.—(iii) "Official Writings of Mountstuart Elphinstone." Edited by G. W. Forrest, pp. 69-70 (Bentley & Son.)

اور بتدریج ارتقاء حیات کی نئی راہوں سے موانعت پیدا کرنا تھا۔ امر لازماً ہم ہو گیا کہ اس سیاسی مسلک کے نشوونما میں خود اہل ہند اپنے حکمرانوں کے شریک کا دل ہونے پر راضی ہوں کیونکہ ان کی امداد کے بغیر اس قسم کا ہر مسلک خواہ کسی ہی اعلیٰ حوصلگی کے ساتھ اس کا تصور کیا جائے قطعی ناکام رہے گا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جماعت ان فوائد سے آگاہ تھی جن کا مغربی اقوام نے میل جول کے ذریعے حاصل ہونا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ملک کی قدیم روایات پر شدت سے کاہنہ تھی۔ اس جماعت کے سروراجہ راجہ رام موہن رائے تھے شاید عظیم ترین شخصیت تھی جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دور میں گزری ہے۔

راجہ رام موہن رائے سلسلہ میں بمقام رادھانگربنگال کے ایک قدیم معزز برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور عربی زبان میں عمود تعلیم حاصل کی۔ کم سنی کے زمانے میں انھوں نے ایک رسالہ جس میں ہندوؤں کے طریقی بت پرستی کو قابل اعتراض ٹھہرایا تھا شائع کر کے اپنی آزاد خیالی کا اظہار کیا۔ یہ واقعہ مضمون زیر بحث (مبت پرستی) پر ان کے مشہور خیالات کے ساتھ مل کر ان کے اور ان کے والد کے درمیان سردہری کا باعث ہوا۔ وہ کچھ مدت تک حکومت بنگال کے تحت ایک خدمت پر مامور رہے جہاں زمینداری کے حساب و کتاب اور اراضی کی پیمائش میں ان کی اعلیٰ مہارت بڑی قدر و قیمت رکھتی تھی لیکن اپنے ہم وطنوں کی ذہنی و اخلاقی ترقی کا خیال سرکاری دفتر کے غیر دلچسپ کام کی بنیاد پر اس نوجوان مصلح پر زیادہ اثر انداز ہوا۔ لہذا انھوں نے اپنی تمام فوست اپنے ملک کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا تہیہ کر لیا۔

ابتداء میں راجہ رام موہن رائے ایک مذہبی مصلح اعظم تھے۔ وہ ایک مدت تک مشاہدہ کر چکے تھے کہ ہندو سوسائٹی میں ان کے نزدیک بہت سے عیوب ہیں۔ مذہب میں تنگنما کی حیثائیت اس کا معاشری رسوم پر مفسر اثر، علم و فضل کا زوال اور رعایا کا افلاس ان سب خرابیوں کی طرف انھوں نے توجہ کی۔ ان کا مقصد عظیم اپنے ہم وطنوں کے عقاید کو پاکیزہ بنا کر ہند کرنا تھا۔ وہ برہمنوں کے اصلی مذہب سے

زیادہ اس کی تحریفی صورت کے مخالف تھے جو ان تمام مقدس کتابوں کے اصول کی منافی تھی جن کی پیروی اور تعظیم کا سب ہندو دھرم بھرتے تھے۔ باباں جو انھوں نے ہندوؤں کو ترغیب دی کہ وہ اپنشدوں کے صاف و شفاف چشموں سے سیراب ہوں اور ویدوں کی تعلیم کا عقیدہ وحدانیت اختیار کریں، نیز اپنے زمانے کے نوجوانوں کو دھرمیت کی مضرتوں سے سچانے اور تمام اخلاقی اصول کے قطعی انکار سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ سین فورڈ ارنلڈ لکھتا ہے کہ انھوں نے ایک جماعت کے وجود پر جو کلکتہ میں قائم ہوئی تھی اظہارِ تاسف کیا۔ جماعت ناعاقبت اندیش نوجوان اشخاص پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض ہوشیار بھی تھے جنھوں نے اپنے نحد ہونے کا لفظ لحد کے وسیع ترین معنی میں اعلان کیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے کے بیان کے مطابق جماعت مذکور کچھ مشرقی ہند کے لوگوں اور کچھ ہندو نوجوانوں سے مرکب تھی جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ کسی قسم کی تلافی کے بغیر اپنے ذاتی عقاید کو رد کر دیں۔ ان کی اس حرکت کو انھوں نے متعصب سے متعصب ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ذلیل خیال کہا اور ان کے اصول کو اخلاق و آداب کے حق میں سم قاتل ٹھہرایا۔ راجہ رام موہن رائے نے اپنے مطلب کو زیادہ زور کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لیے بنگالی زبان میں ویدوں کے خاص خاص ابواب کے ترجمے کیے جن میں سے ایک کا دیباچہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو اس مصطلح اعظم کے خیالات کی توضیح و تشریح کا بہترین ذریعہ ہے۔

*ہندومت کی اصلاح

انسان کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اور جب انہیں جدا جدا دیکھا جاتا ہے تو غیر اہم محسوس ہوتی ہیں اور اسی تناسب سے اخلاقی قوتوں کی جانچ کی جائے تو ہم انہیں قابلِ فہم پاتے ہیں کیونکہ یہ ایک وسیع دائرہ عمل پر محیط ہیں اور ان میں تقریباً غیر محدود ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر انسانی حیات کے مختصر دور کا

*Source.—“Introduction to a Translation of the Ishopanishad.” Raja Ram Mohan Roy. (Panini Press.)

دنیا کے طویل زمانے سے اور جسمانی طاقت کی محدود وسعت کا اُن متعدد ادنیٰ سے جن کی جانب اسے مبذول کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مقابلہ کیا جائے تو خواہ مخواہ ہم اپنی اصل حقیقت کے بارے میں نہایت خفیہ راے قائم کرنے پر نایل ہوں گے اور ہمارے اطمینان خاطر کو برقرار رکھنے کے لیے شاید کوئی شخص اس قدر موزوں نہیں سمجھی جاتی ہے جیسا کہ ہماری مفروضہ اخلاقی قوتوں کا تصور ہے جس کے دوش بدوش وہ اعلیٰ اور نیک متعاصد بھی اس جو مذکورہ قوتوں کو مناسب طریقے پر کام میں لانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے برخلاف رنجشیں اور خجالتیں جلد یادیر میں اس شخص کی زندگی کا جزو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں جسے اپنے ہم جنسوں کو فائدہ پہنچانے کے موقعوں سے بے اعتنائی برتننے کا احساس ہو۔ اس طرح کے خیالات نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ میں اگرچہ ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا اور اسی خاص فرقے کے عقاید کی مجھے مالم شباب میں تعلیم دی گئی، اپنے ہم وطنوں کی قابل افسوس غلطیوں کا پورا پورا اعتراف کر کے اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ان کے دل و دماغ کی ترقی کے لیے ممکن حد تک ہر قسم کے ذرائع کام میں لاؤں اور ایک پاکیزہ تر آئین اخلاق کے علم کی جانب ان کی رہنمائی کروں مختلف فرقوں اور پیشوں کے ہندوؤں میں ہمیشہ رہنے سہنے سے میں اس تحقیر آمیز اوہام پرستی کا کثرت سے مشاہدہ کر چکا ہوں جس میں ان بجا روں کو ان کے خود عرض مشیروں نے مبتلا کر رکھا ہے جو قانون اور فہم عام کا مقابلہ کر کے انہیں محض بت پرستی کی طرف مایل کرنے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے ہیں اور جب ان لوگوں نے اخلاق کے اصلی جوہر کو ان کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی پرچھائیوں کی کمزور کشش ان کے سادہ تر قلوب میں ڈال دی ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ علی اور اصولی حیثیت سے ہندوت کا جزو اعظم یہ قرار دیا جاتا ہے کہ ایک خاص قسم کی غذا اختیار کر لی جائے جس سے غذا بھی انحراف و درال حالیکہ مخوف کاچلن دیگر اعتبارات سے عمدہ اور ناقابل گرفت ہو، نہ صرف سخت ترین معن طعن کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس کے رشتہ دار

اور احباب اُسے سوسائٹی سے خارج کر کے فی الواقع سزا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُسے وہ مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے جو عام طور پر مذہب سے علیحدگی کی مصیبت کہلاتی ہے۔

اس کے برعکس ہندومت کے مذکور بالا رفیع الشان اصول کی شدید پابندی اس درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے کہ اس سے ہر اخلاقی جرم کی تلافی متصور ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کی خلاف ورزی کے الزام منسوب کے مقابلے میں بدترین جرم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

فصل اسرقہ یا دروغ حلفی کا جرم باوجودیکہ عدالتی فیصلے کی بنا پر عاید کیا جاتا ہے اور جسے مذہب سے علیحدگی کی ترغیب کو بعد کا تعلق ہے ہندوؤں کے نزدیک تذلیل و توہین کی کوئی خاص علامت نہیں خیال کیا جاتا۔

کسی برہمن کو ایک ادنیٰ تحفہ جو عموماً برہمنیت کہلاتا ہے پیش کرنا اور اس کے ساتھ ہی چند فضول رسوم ادا کرنا مذکور بالا تمام جرائم کا کافی کفارہ تصور کیا جاتا ہے اور مجرم کو فوراً ساری موقتی آفت نیز آئندہ پاؤش کے ہر خوف و خطر سے نجات دے دی جاتی ہے۔

میں ان مذہبی حقائق پر بہت ہی درد بھرے دل سے سالہا سال تک غور و غوض کرتا رہا ہوں شدید ترین تاسفانہ جذبات کے ساتھ میں ہمیشہ اُس غیر منزائل دلچسپی کے متعلق سوچ بچار میں پڑا رہا ہوں جو مضرت رساں طوبقی اصرام پرستی نے میرے ہموطنوں میں پیدا کر دی ہے جن کا کام اپنے قرضی دیوتاؤں کو راضی رکھنے کی خاطر ہر انسانی و اجتماعی جذبہ منانے کے لیے لوگوں کو آگسانا ہے۔ ان کا یہ فعل مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر ان خوفناک امور میں جہاں مقدس مذہبی رسوم کی پیروی کے دھوکے میں خود کی تباہی ہوتی ہے اور قریب ترین رشتہ داروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے شدید ترین تاسفانہ جذبات کے ساتھ ان رواجوں پر غور کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا ہے اور ان میں ایک ایسی قوم

کے اخلاقی زوال کا مشاہدہ کیا ہے جو میری دانست میں یقیناً بہتر افعال کی استعداد رکھتی ہے اور اس کے ضبط و تحمل، صبر و شکیب اور نرم دلی کے اوصاف اُسے اعلیٰ تر مقصوم کا اہل بنا سکتے ہیں۔ عسرن اس قسم کے احساسات نے مجھے اس قوم کے افراد کے سامنے ان کی مقدس کتابوں (ویدوں) کے بعض حصوں کے صحیح ترجمے پیش کرنے پر آمادہ کیا جو نہ صرف واحد خدا کی بصیرت افزا عبادت کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ پاکیزہ اصول اخلاق کی نصیحت بھی کرتے ہیں۔ ان میں وہ شہادت بھی شامل ہیں جنہیں میں نے ان دلائل کے مقابلے میں ضروری سمجھا جو برہمنوں نے اپنے مقبول رواج کے تحفظ کے لیے پیش کی ہیں۔ نہایت صدق دل و منہ کے ساتھ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ سارے ترجمے عام ہندوؤں کے قلوب میں محض ذات برتر و بزرگ کی عبادت اور اس سے عقیدت کی متعلوکی کا تعلق پیدا کرنے میں یہ محبت یا بہ تاخیر کارگر ثابت ہوں، نیز انہیں اس شاندار و ہمہ گیر اخلاقی اصول کو کہ تمام دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم ان کا اپنے ساتھ چاہتے ہو، پوری طرح سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہو۔

یہ لازمی امر تھا کہ رام موہن رائے کے تھرو ایسے بلند خیال نوجوان لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو جائے جو وحشت و ظلمت کے اندر جس میں ان کی جا میں مبتلا ہو گئی تھیں روشنی کا راستہ ٹھول رہے تھے۔ ۲۸ اگست ۱۸۲۷ء کو وہ بڑبڑھا کا افتتاح کرنے کے قابل ہوئے جس کو جلد برہموسماج کی شکل دے دی گئی۔ اس کے دو سال بعد عام پوجا پاٹ کی رسموں کے لیے ایک عمارت مختص ہو گئی۔ مس کولٹ لکھتی ہے کہ ”یہ پیش خیمہ تھا اس مذہبی اصلاح کی تحریک کی کامیابی کا جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور جو اب تقریباً استحکام حاصل کر چکی ہے۔ ان کی قایم کردہ سوسائٹی حیرت انگیز کام کوئی غیر محسوس مجموعہ نہیں ظاہر کر رہی تھی بلکہ وہ ایک حقیقی پرستش گاہ بن گئی تھی۔ ابتدائی و آئندہ مستقبل تجربوں کے بعد خواب و خیال اور امید و بیم کی منزلوں سے نکل کر وہ ہمہ ادنیٰ میں آجی تھی۔“

دوار کا ناتھ ٹیکور نے سب سے پہلے اس نئے مندر کے کام میں اپنے

قدیم دوست و آقا کی اعانت کی۔ اس کے بانی کی وفات کے بعد ڈبندر ناتھ ملوک اور کیشب چندرین نے اسے جاری رکھا۔ برہم سماج جس کی بنیاد اس طرح پڑی تھی ہندوستان میں اصلاح تمدن اور زہمت عقاید کا ایک زبردست ترین وسیلہ بن گئی۔ اس سماج نے انتشار قومیت کے خطرے کو جو معتقدات غیر کی پابندی کے باعث ظاہر ہوا کرتا تھا دور کر دیا نیز اتحاد و کمزوری اخلاق سے نوجوانان وقت کو سچا لیا۔ اسی برہم سماج نے اہل علم ماہر ترقی صنایع اور ماہر سائنس پیدا کیے جنہوں نے ہندوستان کی مذہبی سرگرمیوں میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔

* پہلی برہم سماج کے

عبادت خانے کا وقف نامہ

ہتوی، مذکور بالا عمارت کے ساتھ ملوک و مقبوضہ زمینوں، احاطوں اور ان کے قریبی علاقوں کو بلا تفریق مذہب و ملت جمیع اوضاع و اطوار کے لوگوں کو جو باقاعدہ پرہیزگار اور عبادت گزار رہنے کا اقرار کریں استعمال کرنے، اُن پر تصرف ہونے، اُن سے استفادہ کرنے اور انہیں خاص انفرادی کے لیے مخصوص کرنے اور عام جلسوں کے کاموں میں لانے کی ہر وقت اجازت دینے غیر متغیر، ناقابل تلاش اور لاینزال ہستی کی جو خلاق و محافظ عالم ہے مقامات مذکور پرستش و عبادت ہو سکے گی۔ اس کے سوا کسی اور نام، لقب یا خطاب خاص دیوتا یا دیوتاؤں کے ساتھ کوئی شخص یا جماعت انہیں منسوب کرنے یا استعمال کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

اور یہ کہ عبادت خانے کے مکانات پائیں میں یا اس کی عمارت، ارضی ملکیت مقبوضہ، میراث اور حدود متعلقہ کے اندر بت، مورت، تصویر یا مجسمے کا قیام یا سنگ تراشی، چوب کاری، نقاشی اور اسی نوع کا فعل ممنوع ہے۔ اور یہ کہ وہاں قربانی کرنے، بھیٹ چڑھانے یا کسی قسم کی نذر و نیاز پیش کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی جاسکتی اور یہ کہ مکانات پائیں، عمارت

* Source.—“Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy.” S. D. Collet and Harold Collet. (Bucklersbury.)

اراضی، ملکیت، مغیرہ، اور حدود متعلقہ سے متصل یا ان کے اندر کسی جانور یا زندہ مخلوق کو مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے یا غذا کی خاطر ذبح یا قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ کسان مقامات کے اندر یا ان سے متصل اکل و شرب کی (بجز اس صورت کے جبکہ کسی واقعہ ناگہانی کے باعث جان کی حفاظت ضروری سمجھی جائے) ضیافت یا دھوم دھام کی اجازت نہیں ہے۔

اور یہ کہ مذکورہ عبادت یا پرستش کے دوران میں تلقین دین، حمد گوی، بھجن یا اور قسم کی پوجا پاٹ کے وقت جو محول بالا مکانات یا عمارات میں انجام پائے یا عمل میں آئے ایسی ذی روح یا غیر ذی روح شے کے متعلق جو کسی شخص یا جماعت کے نزدیک قابل عبادت رہ چکی ہے یا اب ہے یا آئندہ ہونے والی یا تسلی کی جائے والی ہو برابرا بھلا کہنا یا ذلت و حقارت کے ساتھ ذکر کرنا یا اشارہ و کنایہ سے کام لینا جائز نہیں ہے۔

اور یہ کہ اس قسم کی عبادت میں وعظ و نصیحت ہونے قبل و نقل مناجات یا بھجن کو عمل میں لایا جائے بجز اس کے جبکہ ان امور سے خلاق و محافظ عالم کے ارتقاء تصور کے ساتھ زکوٰۃ و خیرات، اخلاق و پارسائی، خیر سگالی و نیکی میں نیز مختلف المذاہب و مختلف العقاید لوگوں کے درمیان رشتہ اتحاد کی مضبوطی میں ترقی مقصود ہو۔

نیز یہ کہ کوئی شخص جو نیک نام اور اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اخلاق و عادات میں مشہور ہو تو لیان مذکور کی جانب سے یہ حیثیت ہتمتم منظم و منسرح سے مامور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ عبادت گزار کی اسی طریقہ پر ہو رہی ہے جس کی اوپر تصریح و توضیح کی گئی ہے اور اس قسم کی عبادت روزانہ یا کم از کم سات روز میں ایک مرتبہ انجام پا رہی ہے۔

مصلح مذہب کی حیثیت سے رام موہن رائے نے اپنے کام پر کتنا نہیں کیا۔ ملی آزادی کے لیے بھی ان کا جوش و محوش کچھ کم نہ تھا۔ ان کی ہمدردی بہت عام تھی اور وہ ٹیکیز و آئر لینڈ کے باشندوں کے معاملے کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مذہبی معاشرے اور ملی اصلاحات لازم و ملزوم تھے۔

برخلاف وہ اپنے ملک کے حکمرانوں پر جب کبھی موقع ملتا سختی سے مکتہ صنی کرتے۔ آزادی مطابعت کے حقوق پر انھوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ بحث کی اور ۱۸۵۲ء کے قانون جبری کی غیر مفید شرائط پر حرجت گیری کی۔ انھوں نے اس اصول کی بھی تائید کی کہ حکومت کو کوئی اہم دستور اصل نافذ کرنے کے قبل ہندوستانیوں سے مشورہ کرے۔

موہن رائے کی زندگی کے آخری تین سال انگلستان میں بسر ہوئے جہاں وہ منگل شہنشاہ اعظم کے مقبرہ نائندے کی حیثیت سے گئے تھے۔ منگل شہنشاہ میں وہیں وہ رحلت کر گئے اور برمنگھم کے قریب وادی آرتھوین دفن کیے گئے۔

ہمارا یہ فرض کرنا سجا ہے کہ موہن رائے کی عظیم شان خدمات ہند کے پورے حالات اس وقت مرتب ہوئے جب کہ وہ اس سرزمین سے رخصت ہوئے۔ ہندوؤں میں انھوں نے تحریک وحدانیت کا آغاز کیا تھا اور اسے مستقل علمی صورت دے دی تھی۔ انھوں نے مقدس کتابوں کا ایک ایسا نظم انتخاب کیا یا اس کا اظہار کیا تھا جو بیشتر اپنی جگہ پر مخصوص تھا اور اسے آخر کار استحکام و قبول عام حاصل ہونے کا وہ مشاہدہ کر چکے تھے۔ تعلیم انگریزی کی جو تحریک انھوں نے ولیری کے ساتھ پیش کی تھی وہ اس وقت سرکاری طور پر کامیاب ہونے کے قریب تھی اور رسمستی کا انداد تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔

تلخی میں موہن رائے کا درجہ

لیکن مغربی ممالک میں رام موہن کی سہ سالہ خدمات سے ان کا کام کا نامہ حیات، عزت و توقیر کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ وہ سب سے پہلے برہمن اور منناز ہندو تھے جنہوں نے سمندر عبور کر کے اس سحری طلسم کو توڑ دیا جس میں صدیوں سے ہندوستان محصور تھا۔ ان کے سفر انگلستان کی اہمیت سرکاری طور پر کچھ کم اثر انداز نہ تھی کیونکہ اس ملک میں رام موہن رائے کی موجودگی

*

Source.—"Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy." S. D. Collet

and Harold Collet. (Bucklersbury.)

نے انگریزوں کو اپنی مفتوحہ مشرقی قوم کی غفلت، تہذیب اور پاراسائی سے جس کا انہیں پہلے کبھی علم نہ ہوا تھا آگاہی بخشی۔ بادشاہ کے دربار میں جماعت متعینہ کے اجلاسوں میں، خاص خاص اشخاص کے حلقوں میں، فلسفیوں اور عالموں کے مجموعوں میں مقرر مذہب انگلستان کے مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جلسوں میں، متعدد مکانوں کی خلوت گاہوں میں اور لنکاسٹائر کے کاریگروں کے حیرت زدہ گردوں کے روبرو رام موہن رائے کی شخصیت نے ہماری مشرقی سلطنت کا ایک جاذب نظر مجسم نمونہ پیش کیا۔ وہ انگلستان کا حال ہندوستان پر ظاہر کر چکے تھے اس لیے اب انھوں نے ہندوستان کو انگلستان پر واضح کر دیا۔

رام موہن رائے کا ورود ایسے وقت ہوا جب کہ سلطنت متحدہ (برطانیہ) کی سیاسی تاریخ کے قطعی تغیر کا زمانہ تھا۔ وہ شوق دہردی کے ساتھ اس انقلاب عظیم کے تماشائی رہے جو مسودہ قانون اصلاح اول کے ذریعے وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہاں اپنے دوران قیام میں انھوں نے دیکھا کہ قانون کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی کاروبار سے الگ کر کے سیاسی ترکیب دی گئی تھی اور ان کے سامنے وہ قانون بھی منظور ہوا جس سے تمام برطانوی ملکیت میں رسم غلامی موقوف ہو گئی۔ ان کے اسی زمانہ قیام میں قانون کارخانہ کا نفاذ ہوا نیز مذہبی رسائل بازی کی ابتدا ہوئی۔ ہندوستان سے ان کی روانگی کے ایک یا دو مہینے قبل ہی میجسٹر اور یو رپول کی ریوے لائن جاری کی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ یہاں اس وقت موجود تھے جب کہ جدید انگلستان قدیم انگلستان ہی کے غالب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس جدید انگلستان میں جمہوری حکومت، صنعت و حرفت، تجارت و تمدن کی اصلاح، انجیلی کلیسا کی تجدید اور شاہی سیاسی مسلک کا جو منحرف کلیسا کے زیر اثر تھا دور دورہ تھا۔ اسی روشن زمانے میں رام موہن رائے کی شخصیت، جدید ہندوستان کا جو برطانوی حکومت کے تحت ترقی کر رہا تھا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی تھی جس کی بعض قومیں مقرر وقت سے پہلے ابھرائی تھیں۔

یہ رام موہن رائے ہی کی ذات تھی جس نے جدید انگلستان کو جدید ہندوستان سے روشناس کرایا۔ اس ملک (جدید ہندوستان) کے خیالات

کی ترجمانی اور پیام بری وہ عمر بھر کرتے رہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہٹلر مگر غیر ملکی انقلاب سے ملو روٹس زندگی کے باعث وہ اپنی جماعت کے سردار ہو گئے اور اپنے ہم وطنوں کے درمیان اسی طرح کے انقلاب کا ذریعہ بن گئے۔ رجحانات و مواقع کی گونا گونیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم و بیش سرعت کے ساتھ برادران وطن ان کے نقش قدم پر چلتے دکھائی دیے مگر ثابت قدم نہ رہ سکے کیونکہ جس منزل مقصود کی جانب وہ گامزنی کر رہے تھے بظاہر وہاں تک کبھی ان کی رسائی نہ ہوئی تاریخ میں رام موہن رائے کو یا ایک زندہ پیل کی مانند ہیں جس پر سب سے ہندوستان اپنی غمیں ماضی سے نکل کر زرین مستقبل کی طرف جارہا ہے۔ وہ مثل ایک محراب کے تھے جس نے قدیم فرقہ بندی اور جدید لوازم انسانیت، توہم اور حکمت، استبداد اور جمہوریت، غیر متغیبر روح اور سست رفتار ترقی، گمراہ کن شرک اور خالص عقیدہ و وحدانیت کی خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو درمیانی خلیج کو پاٹ دیا۔ وہ اپنی قوم کے پیچھے تھے اور اکثر بذات خود مصائب جھیلنے ہوئے اپنے اندر قدیم روایت اور ناگزیر روشن خیالی کی متغائر خصوصیات کو باہم بیوستہ رکھتے تھے۔

برٹل کے قریب وادی آرنو کے قبرستان میں رام موہن رائے کی قبر کا کتبہ:-

اس سنگ مزار کے نیچے راجہ راجہ موہن رائے بہادر مدفون ہیں جو خدا کی وحدانیت پر مضبوطی کے ساتھ دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی صرف ذات الہی کی پرستش کے لیے وقف کر دی بڑی خدا واد استعدا کے ساتھ بہت سی زبانوں کی کامل مہارت پیدا کر لی اور بہت جلد اپنے زمانے کے ایک خلیل القدر عالم ہونے کا امتیاز حاصل کیا۔ ان کے ہم وطنوں کو بہ امتنان یاد ہے کہ انھوں نے باشندگان ہند کی معاشری، اخلاقی اور جہانی حالت کو ترقی دینے میں ان تھک کوششیں کیں، رسم سنی اور بت پرستی کو روکنے میں خود کو

یہ دل و جان مصروف رکھنا اور پیہم سرگرمی کے ساتھ ہر اس تحریک کی تائید
 کی جو خدا کی عظمت اور انسان کی فلاح و بہبود کو وسعت دینے کی جانب
 مایل ہوتی۔
 یہ لوحِ قبر اس رنج اور فخر کا اظہار کرتی ہے جسے ان کے بعد کی نسلیں
 اپنے دل میں محفوظ رکھیں گی۔
 وہ سال ۱۸۵۷ء میں بنگال میں بمقام راجا انگریز پیدا ہوئے تھے اور
 ۲۷ ستمبر ۱۸۷۲ء کو برہمن میں فوت ہوئے۔

دوسرا باب

عالیٰ و مقنن حکام

قانونِ منشور بابت ۱۸۳۳ء

برطانوی حکومت ہند کی نوعیت اور مقاصد کے جدید اصول جو ایک طرف رعایا کی طبعی ترقی میں مداخلت کے انسداد اور دوسری طرف تمام مضمرات و نظام کے استیصال کی پرجوش خواہش پر مبنی تھے ہندوستان نیز ان اسی ممالک کی کارروائیوں کے متعلق جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے برطانوی پارلیمنٹ کے طرز عمل پر اثر انداز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگلستان میں لوگ انفرادی زندگی اور واحد نفس پر غور و غوض کر کے اس حقیقت کو معلوم کرنے لگے تھے کہ قوم کی ترقی کا دار و مدار بیشتر فرد کی تربیت پر ہے۔ اصلاحات کے جذبات ہر سکیل گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ انگلستان کے سیاسی رہنماؤں نے ہندوستان کے لاکھوں باشندوں کی جانب جو ان کی تحویل میں جا چکے

تھے اپنی ذمہ داریوں کی وسعت کا صحیح علم حاصل کرنا شروع کیا تھا۔ عہد کا امرانی اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ تنظیم جدید کے دور کا آغاز ہو گیا تھا اور اس تنظیم کے کام میں نہ صرف جواب دہی کا سخت احساس اور صریح نیک نیتی پائی جاتی تھی بلکہ اس میں از حد تفکر و نقوش کی خصوصیت بھی موجود تھی۔ مشورے کو عمل پر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں دارالعوام کی ایک مجلس منتخبہ اس لیے مقرر ہوئی کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار کی موجودہ حالت کی تحقیقات کرے اور آئندہ نظام عمل کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ اس مجلس کے روبرو جو شہادت پیش کی گئی اور جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں وہ انصرام کار کی خوبی کے علاوہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتی ہے کہ فرض شناسی اور ذمہ داری کی اہمیت عظیم کو نہ صرف معدودے چند بلند خیال لوگوں نے بلکہ کمپنی کے ملازموں کی تعداد کثیر نے بھی محسوس کیا۔ حکومت ہند کے مسائل کے متعلق مجلس کی رائے کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

* حکومت ہند کے
مقاصد

طریق وضع قوانین ہند اور اس کی امکانی اصلاح کے متعلق وسیع النظری سے کام لیا جائے تو بلا دلیل و حجت اس امر کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی رعایا کے مفاد یورپیوں کی اغراض سے زیادہ قابل لحاظ ہیں جب کہ ان دونوں میں مقابلے کی صورت پیش آئے اور اس سبب سے قوانین کا نفاذ یورپیوں کی بہ نسبت ہندوستانیوں کی عادات اور جذبات کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے بعض اشکال میں اگرچہ ہندوستانی اور برطانوی قانون کی یکساں فائیدے سے خالی نہیں ہوتی تاہم ضابطہ ہند کی بنیاد برطانوی قانون کے اصول پر نہیں رکھی جاسکتی۔ غرض یہ کہ ہندوستانیوں کے حقوق کی خاطر خواہ حفاظت بجز اس طریق انضمام کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی کہ ہر ضلع کی عدالت پر ایک یورپی جج کا تقرر کیا جائے اور اس کے مددگار جج نیز ایسے ہندوستانی ہوں

اور جماعت کی بجائے شخص واحد کی ماموری مل میں آئے۔

ہندوستان کے لیے عہدہ حکومت کی تنہا و نیز موجودہ نظام میں اصلاحی تغیرات کے نفاذ کا ہندوستانیوں کی عادات و خصال اور استعداد سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فی الحال مالِ عدالت اور فوج کے محکموں میں محض ادنیٰ خدمات دی گئی ہیں۔ عام خیال ہے کہ انہوں نے ہمارے طریق حکومت کے اصلی محاسن و معائب کا کافی مشاہدہ کیا ہے اور انہیں اس بات کا احساس و طال ہے کہ انہیں حکومتِ عالم میں زیادہ حصہ نہیں مل رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اُس بے اطمینانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں جو سابق حکومتوں کے تحت ہر قسم کے حقوق میں پائی جاتی تھی برطانوی پناہ میں امن و امان کی ترقی سے نہیں سمجھی جاتی ہے۔ شہادت سے اس امر کی بارگاہ تصدیق ہو چکی ہے کہ ہندوستانیوں کی محرومی کو اس لیے روا نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ معاملہ فہم یا عامل یا قابلِ اعتماد نہیں ہیں بلکہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یورپی حکام کی ماتحتی و نگرانی میں اعلیٰ عہدوں پر ان کی ماموری ان کے عام ملین کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کر کے مفید اثر مترتب کرے گی، برطانوی مملکت کے ساتھ ان کے خلوص کو پایدار بنائیگی، عدل گستری کے بہتر طریقے کی جانب مایل کرے گی اور حکومتِ ہند کے مصارف میں بڑی بچت کا باعث ہوگی۔

برطانوی پارلیمنٹ نے فکر و تامل کے بعد عمل کی طرف رخ کیا جو موثر ترین نوعیت کا عمل تھا۔ ۱۸۵۸ء کا قانونِ مشورہ ہند کے برطانوی نظم و نسق کی تاریخ میں بدرجہ غایت اہمیت رکھتا ہے۔ قانون کی عبارتِ بجاے خود اس قدر طویل ہے کہ اسے بکمال و تمام نقل کرنے کے عوض اس کی اہم تر دفعات کا خلاصہ جو سرکرٹیفِ البرٹ کا تیار کر دیا گیا ہے۔

قانون (مشور) نافذ ہونے کے بعد نظماً نے ہندوستان کو وہ مشہور مرسلہ روانہ کیا جس کی تحریر جیمس مل سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس میں نظماً نے خوب واضح طور پر ذرائع اور طریق کار کو بیان کیا ہے جس کی مدد سے دفعات مذکور

بروئے عمل آئی چاہئیں۔
قانون منشور بابت
 کی وفات کا خلاصہ

کھننی کے متعلق جب تجدید منشور کا وقت آیا تو ہندوستان میں لارڈ ولیم بنٹنک کے پرامن عہد حکومت کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں قانون اصلاح، انگلستان میں نافذ ہوا تھا اور وہاں فرقے کے اصول عروج پر تھے۔

ترتیب و وضع قوانین کے بارے میں منہجیم کے خیالات سے مصلحان قانون کے قلوب خوب متاثر ہو رہے تھے۔ میکالے پارلیمنٹ میں موجود تھا اور مجلس نگران کا معتد تھا، اور منہجیم کا شاگرد جمیس مل، دفتر ہند کی مراسلات کا نتیجہ ساز تھا۔ قانون منشور بابت مسئلہ کے نفاذ سے قبل جیسا کہ سال ۱۸۵۸ء میں تجدید منشور کے وقت عمل ہوا تھا ہندوستانی نظم و نسق کے متعلق احتیاط کے ساتھ تحقیقات کی گئی۔ اس قانون کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستور اور ہندوستان کے طرقی نظام میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔

کھننی کے ملکی مقبوضات کو آئندہ اور بیس سال کی مدت تک کھننی ہی کے زیر حکومت رہنے کی اجازت دی گئی مگر یہ مقبوضات ملک مظلم ان کے وارثوں اور جانشینوں کی امانت کے طور پر حکومت ہند کی خدمت کے لیے کھننی کے تفویض کیے گئے۔

کھننی کا اجارہ جو چاء اور چین کی تجارت سے متعلق تھا قطعی طور پر منسوخ ہو گیا۔

کھننی کو تجارتی کاروبار بند کرنے اور اپنے معاملات کا بعاملت مکمل تصفیہ کرنے کی ضرورت دہی ہوئی۔ اس کے تمام قرضے جو ملکی مقبوضات اور دیگروں سے متعلق تھے، بالیہ ہند پر عاید کیے گئے جس میں اس کا سالانہ نفع اصل سرمائے کی کل رقم (یعنی چھ لاکھ تیس ہزار پونڈ) پر فی صد دس پونڈ دس شلنگ کی شرح

* Source.—Historical Introduction, "Government of India." Sir Courtenay Ilbert. (Clarendon Press.)

سے مقرر ہوا مگر شرط یہ تھی کہ پارلیمنٹ ہر سو پونڈ کے حصے کے عوض دو سو پونڈ نقد دے کر اس حصے کو سوخت کر دے اور اس غرض کے لیے کھینی قومی قرضے کی مدد میں لاکھ پونڈ ادا کرے اور یہ سو دو سو کے حساب سے جمع ہوتے رہیں تا آنکہ یہ رقم ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ جائے۔

کھینی باوجود یکہ تجارتی کاروبار سے محروم کر دی گئی تھی تاہم سابق قوانین کے قایم کردہ آئین حکومت و عملی کے تحت اس کے انتظامی و ملکی اختیارات برقرار رہے اور وہ خاص کر تقررات ہند میں اپنے مربیہ حقوق کو کام میں لاتی رہی۔ مجلس نگران کے دستور میں ترمیم کی گئی مگر اس مجلس کے اختیارات کا بروئے عمل آنا اس کے صدر پر موقوف تھا اس لیے ترمیمات سے کوئی مفید اثر مرتب نہ ہوا۔ موجودہ قانون کی رو سے سابق قانون کی دفعات جن کا تعلق مجلس نظام کی مجلس از سے تھا دوبارہ نافذ ہو گئیں اور موخر الذکر مجلس کے توسط سے ترسیل مراسلات کا انتظام کیا گیا اور کھینی کے مروج خطاب کو مختصر کر کے اسے صرف ایٹ انڈیا کھینی کہلائے جانے کی اجازت دی گئی۔

ہند کی حکومت عالم کے نظام میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی گئی۔ تمام سول اور فوجی حکومت کی سربراہی رہنمائی اور نگرانی کے اختیارات صریح طور پر گورنر جنرل اور کونسل کے تفویض کیے گئے اور اسے گورنر جنرل ہند باجلاس کونسل کا خطاب دیا گیا۔ اس کونسل میں ایک چوتھے رکن معمولی کا اضافہ ہوا۔ یہ رکن لازماً ان کھینی میں سے تھا نہ بحیثیت رکن کونسل، اغراض قانونی کے سوا اور کوئی کام کرنے کا مجاز تھا۔ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ چوتھا رکن میکا کے تھا۔

بنگال کا وسیع احاطہ و عظمہ احاطوں میں جو احاطہ فورٹ ولیم اور احاطہ آگرہ سے موسوم ہوئے منقسم ہونے والا تھا مگر یہ انتظام کبھی عمل پذیر نہ ہوا۔ ۱۸۳۵ء کے قانونی حکم (۵۶ و ۶۷ ویں پارٹ باب ۵۲) کی بناء پر اسے ملتوی رکھا گیا اور التوا کا یہ عمل ۱۸۵۳ء کے قانون انشور (۱۶ و ۱۷ کوئین و کٹوریہ باب ۹۵، دفعہ ۱۵) کے باعث غیر محدود طور پر جاری رہا۔

نشانیہ تھا کہ فورٹ ولیم فورٹ سینٹ جارج، بمبئی اگرہ چاروں احاطوں میں سے ہر ایک میں انتظامی امور کے لیے ایک خاص گورنر اور کونسل رہے لیکن گورنر جنرل اور اس کی کونسل کوئی اجماع فورٹ ولیم کے گورنر اور کونسل کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اس لیے اسے اختیار دیا گیا کہ کونسل کے ارکان کی تعداد گھٹائے یا ان کو بالکل معطل کر کے انتظامی کام محض گورنر کے حوالے کر دے۔

مسئلہ کو حل کہتا ہے کہ ۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ کی توجہ حکومت ہند کی کارروائیوں کے تین بڑے نقائص کی طرف منعطف ہوئی۔ پہلا نقص قوانین و ضوابط کی نوعیت سے متعلق تھا، دوسرا ان غیر واضح اختیارات و اقتدارات سے جو ان مختلف قوانین و ضوابط کے وجود میں آنے کے باعث تھے اور تیسرا یہ کہ خلاف ضابطہ اور بعض اوقات متضاد عدالتی فیصلے ہوا کرتے تھے جن کے ذریعے قانونی احکام کی تعمیل کرائی جاتی تھی۔

۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) کی رو سے صرف گورنر جنرل باجلاس کونسل کو جس کی اعانت کے لیے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک چوتھے رکن قانونی کا اضافہ ہوا تھا حکومت ہند کے قوانین وضع کرنے کا اختیار دیا گیا۔ چاروں احاطوں کی حکومتوں کو محض یہ اجازت دی گئی کہ ایسے قوانین و ضوابط کے مسودات یا تجاویز جو ان کے خیال میں معقول ہوں گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کریں جس کا فرض تھا کہ ان پر غور و غوص کرے اور انہیں اپنی تشریحات کے ساتھ اس حکومت کے پاس بھیج دے جو ان کی محرک ہو۔

گورنر جنرل باجلاس کونسل کو قوانین و ضوابط بنانے کے اختیارات صریحاً حسب ذیل دیے گئے۔

۱۔ ان مختلف قوانین و ضوابط کی ترمیم یا ان میں ترمیم و تبدیلی کرنے کے لیے جو فی الوقت ہند کے علاقوں میں رائج ہیں، جب تمام اشخاص کے لیے خواہ وہ برطانوی ہوں یا ہندوستانی

اجنبی ہوں یا غیر ملکی نیز تمام عدالتی محکموں اور ان کی اختیاری مدعوں کے لیے خواہ وہ فرمان شاہی کے ذریعے یا اور کسی طرح قائم کی گئی ہوں،
ج۔ مذکور بالا جمیع علاقوں اور ان کے حصوں کے تمام مقامات اور اشیاء کے لیے خواہ وہ کسی نوع کے ہوں،

۵۔ بھینی کے اُن تمام ملازموں کے لیے جو اس کے حلیف حکمرانوں کے علاقوں اور ریاستوں میں مقیم ہوں پھر

۶۔ بھینی کی فوجی ملازمت کے ہندوستانی عہدہ داروں اور سپاہیوں کے انتظام کے متعلق جنگی قوانین بنانے کے لیے نیز اس قسم کے عہدہ داروں اور سپاہیوں کی داورسی کے لیے جو فوجی عدالت کے ذریعے عمل میں آئے۔
لیکن یہ اختیارات ایسے قوانین و ضوابط وضع کرنے کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے تھے جو

۱۔ مسلمانہ کے قانون (منشور) کی کسی دفعہ کو یا تاج برطانیہ اور بھینی کے

محکوم عہدہ داروں اور سپاہیوں کے فرار اور سرکشی سے متعلق قوانین کی دفعات میں سے کسی کو منسوخ کریں یا بدل دیں یا معرض التوا میں ڈال دیں یا

۲۔ تاج برطانیہ کے حقوق یا پارلیمنٹ کے اختیارات پر یا بھینی کے دستور و استحقاق یا حکومت متحدہ (برطانیہ) کے اصول قانون یا رسم و رواج کے کسی ایسے جزو پر اثر انداز ہوں جس پر تاج برطانیہ یا اقتدار اعلیٰ کے ساتھ یا ہند کے علاقوں میں مملکت تاج کے ساتھ کسی شخص کی و فاشکاری کا انحصار ہو یا جو

۳۔ مجلس نظام کی منظوری قبل از وقت حاصل کیے بغیر کسی غیر سند یافتہ عدالت کو اس امر کا مجاز کر دیں کہ وہ ملک معظم کی یورپ نثر اور جاہانے حقیقی یا اس کی اولاد کو منراے موت دے یا کسی سند یافتہ عدالت کو برخاست کر دے۔

نیز پارلیمنٹ کا یہ حق بالکل محفوظ تھا کہ وہ ہندوستان کے لیے قوانین وضع کرے اور انہیں منسوخ کرے اور مزید براں پارلیمنٹ کو یہ حکم صادر کرنے کی قوت حاصل تھی کہ تمام قوانین ہند اس کی پیش گاہ میں پیش ہونے چاہئیں۔
قانون (منشور) کے مطا کر وہ اختیارات کے تحت جو قوانین بنائے جائیں

ان کو مجلس نظام، جو مجلس نگراں کے تحت کار فرما تھی، نامنظور کر سکتی تھی لیکن جب وہ بن چکے تو ان کا نفاذ مثل قوانین پارلیمنٹ کے ہوتا تھا اور کسی عدالتی محکمے میں ان کے باضابطہ اندراج یا اشاعت کی ضرورت لاحق نہ ہوتی تھی۔
 ۱۸۳۳ء کے قانون (منشور) کے تحت جو قوانین بنائے گئے ان کو قوانین پارلیمنٹ کا رتبہ حاصل ہوا اور ان کا نفاذ ان ضوابط کی جگہ ہوا جو سابق قوانین پارلیمنٹ کے تحت وضع ہوئے تھے۔

اجمال بالا سے قانون (منشور) کی نوعیت و اہمیت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ جن قانونی دفعات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی حقوق سے سبکدوش کیا اور انگریزوں کو ہم عظیم کی راہ دکھائی ان پر دوسری جلد میں بحث ہوگی البتہ ان میں سے چند کا ذکر اس کتاب کے ابواب مابعد میں کیا جائیگا جن کا تعلق رائج الوقت قانون کی ترتیب، سرکاری خدمات پر ہندوستانیوں کی ماموری اور مجلس نظام کی سرپرستی سے ہے۔

قانون (منشور) کے اجرا سے قبل بوقت بحث و مباحثہ اکثر اشخاص نے قانون سازی کے معاملے میں یکسانی کی ضرورت کا اظہار کیا تھا۔ اب تک گورنر جنرل باجلاس کونسل ایسے ضوابط نافذ کر سکتا تھا جن کی تعمیل اہل بنگال پر لازم تھی شہرہ گیکہ ان ضوابط کا باقاعدہ اندراج صدر عدالت میں ہو گیا ہو۔ اسی طرح کے اعتبارات مدرس تعلیمی کی حکومتوں کو اپنے اپنے احاطوں میں حاصل تھے۔ لارڈ ولیم بینٹن نے سرکاری حیثیت سے اپنی یہ رائے دی کہ سارے ہندوستان کے لیے قوانین وضع کر لینے کا اختیار صرف ایک ہی جماعت کو ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں یورپیوں کا ملک میں آزادی کے ساتھ داخلہ اور خاص کر دارالامارات کی حدود سے باہر مفصلات میں) جس پر قانون (منشور) کے تحت غور کیا گیا متضاد ضوابط کے قدیم نظام کے خلاف تھا۔ لہذا یہ ضروری معلوم ہوا کہ قانون سازی کے تمام فرائض کو ایک مرکزی حکومت کے تحت کر دیا جائے چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل، ہندوستان کا واحد قانون ساز قرار پایا۔ نظام نے اپنے مراسلے میں جدید قانون کی دفعات کی توضیح کرتے ہوئے وزیر قانونی کی حیثیت اور فرائض، ماتحت حکومتوں سے

مشورے کی ضرورت اور اعلیٰ العموم رائے عامہ کے متعلق اُن خیالات کو تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا جن کے مطابق قانون سازی عمل میں آنی چاہیے۔

قانون سازی کے طریقے

۱۔ پارلیمنٹ کے آخری اجلاس کے نافذ کردہ قانون کی زد سے حکومت ہند کے دستور میں جو ترمیمیں کی گئیں ان پر غور کرنے سے ہمیں یہ بات اہم نظر آتی ہے کہ ہمارے ان

خیالات کے بارے میں جو جدید مسودات قانون کے عمل پذیر ہونے کے حامی ہیں نیز اس طریقے کے متعلق جس کے ذریعے ہم جماعت مقننہ کی سودمند اعتراض کی تکمیل کے لیے مفوض اختیارات کو بہترین طور پر کام میں لا سکتے ہیں آپ کی اور ہماری حکومت کے مابین نہایت جامع مراسلت ہوئی چکا ہے۔

۹۔ قانون (مشور) نے پہلے پہل یورپ نثر اور عایاے برطانیہ کے لیے برطانوی ہند کے دروازے کھول دیے۔ اس وقت تک انگریز ہندوستان میں اپنے قیام کی اجازت کے محتاج تھے۔ اب انہیں یہ حق خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو حاصل ہو گیا ہے کہ ملک میں بود و باش کریں اور ارضی پر قابض بھی ہو جائیں اور ان کی تعداد میں کثیر اضافے کی بھی ہر طرح توقع ہے۔ پس یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف برتنے میں مقامی حکومتیں نہ صرف انتہائی صورتوں میں بالاترین اختیار تمنہی سے کمال ذرائع کام میں لائیں بلکہ اپنے مروج و معمولی عمل درآمد کو پیش نظر رکھ کر ایسے قوانین کو بھی کاروبار کا وسیلہ قرار دیں جو احتیاط سے مرتب ہو کر مستعدی وغیرہ جانب داری کے ساتھ عمل پذیر ہوتے ہیں۔ اس صورت کے سوال پر ہموں کے بے روک ٹوک داخلے کا اور کسی طریقے پر نہ بھرہ کرنا خالی از خطر نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ اب جبکہ صدر حکومت کو قانون سازی کے جدید اختیارات عطا کیے جاتے ہیں

*

Source.—Despatch accompanying the Government of India Act, 1833.

(8 & 4 Will. IV, s.5) Dated 10 December, 1834. From the Board of

Directors, East India Company, to the Government of India.

(Parliamentary Papers.)

تو ذیلی حکومتوں کی قانون سازی کے اختیارات میں جو انہیں اب تک حاصل ہیں بند پٹی و تخفیف کی جانی چاہیے۔ اس موضوع پر ہمیں ان مباحثوں کا حوالہ دیتے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جو چند سال قبل دستور حکومت ہند کے ہتھکنڈے طریق کار کے متعلق ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے ہیں۔ جماعت متفہنہ کے ذہن میں غالباً مفصل کن خیال یہ تھا کہ اندرون ملک یورپیوں کے آزادانہ داخلے کے نظر کرتے صدر حکومت کو تقویت دینا ضروری ہے۔

۱۱۔ یورپی اشخاص خواہ وہ کسی طریقے سے ہند کے مختلف حصوں میں پھیل جائیں اپنے مستحکم رشتہ داری کی بدولت باہم ملے رہینگے اور یقیناً مسلسل آمد و رفت قائم رکھینگے۔ اس لیے قدرت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب ایک ہی قسم کے قوانین کے زیر اثر بود و باش اختیار کریں ورنہ ساری جماعت کو نظر انداز کر کے اس کے ایک حصے کے لیے قانون بنانا مشکل ہو گا۔ خاص کر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں ان یورپیوں کے واسطے قانون وضع کرنا جن کو قومی و ملکی حقوق عطا کیے گئے ہوں اور جو حکومت سے بے تعلق ہوں بالکل ایک نیا اور آزمائشی کام ہو گا۔ اس کام کی مشکلات کو مبالغے سے بیان کیا گیا ہو لیکن بے شبہ وہ معمولی ہیں نہ عارضی۔ ان مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائیگا اگر مختلف حکومتوں کو قانون سازی میں مساوی اختیارات عطا کر دیے جائیں اور وہ جدا جدا اپنی صوابدید پر یا بالکل مختلف خیالات اور متغایر اصول کے ساتھ ان اختیارات کو کام میں لانے لگیں۔ اگرچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اندرون ملک یورپیوں کے داخلے کے بارے میں ماتحت حکومتوں کے جو سلطنت کے مختلف علاقوں پر کار فرما ہیں اختیارات قانون سازی برقرار ہیں نیز یہ کہ شمالی ہند کی جانب ان کے علاقوں میں قانون سازی کی نگرانی و انتظام کے لیے ایک جدید مقام مقرر کیا جائے تاہم اس امر کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں کہ قوانین وضع کرنے کے اتمام فریضے بجا کر کے ایک مرکزی حکومت کے تفویض کر دیے جائیں۔

۱۲۔ پہلی بات جو پیش آتی ہے اس طریقے یا کارروائی سے متعلق ہے جس کے ذریعے آپ قوانین بنا کر ان کی اشاعت کریں گے۔ یہ اشاعت کئی طریقوں

سے ہو سکتی ہے اور اسے کارگر بنانے کے ذریعہ سہل الحصول ہیں لیکن وہ طرفی کار جس کی بنا پر قانون زرا شاعت کی ابتداء ترتیب دی جائے گی ایک نازک معاملہ ہے اور اس کی سنجوئی میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس عنوان پر آپ کی رہنمائی کے لیے خاص خاص اشکال یا تجاویز کا اظہار لازم ہے نہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جماعت مقننہ کے مشاکی بہترین شکل اس طرح ہو جائے گی کہ ہم وہ اصول بیان کر دیں جو زیر بحث اہم فرائض کی انجام دہی کے وقت آپ کے پیش نظر رہیں اور جنہیں ان قوانین میں جگہ ملے جو حالات و اغراض کے تحت آپ وضع کریں۔

۱۵۔ پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی قانون بجز اتفاقی صورت یا شدید ضرورت رونما ہونے کے اس وقت تک نافذ نہ کیا جانا چاہیے جب تک کہ اس پر کمال غور و خوض اور بحث و مباحثہ نہ ہوا ہو۔

۱۶۔ ممکن ہے کہ اصول مذکور آپ کو فرسودہ نظر آئے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اس پر نہایت احتیاط کے ساتھ آپ کو آئینی قواعد کی ترتیب کے وقت صریحاً عمل کرنا چاہیے۔ اس ملک میں مدت و شہرت کا ردوائی جس کے ذریعے کوئی قانون ایک تجویز کی شکل سے کل مسودہ قانون کی حیثیت اختیار کرنا ہے اور اختلاف آراء جس سے ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے ایسی چیزیں ہیں جو قانون ساز میں کمزوری و بے اعتنائی کو دور رکھنے کی ضامن ہیں۔ اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ بعض مستثنیٰ صورتیں بھی ہیں جہاں بلا تاخیر رائے عامہ کے دباؤ سے اجموراً قانون بنا دینا ہے۔ اس قسم کی کوئی وقت کم از کم کچھ مدت تک آپ کو اپنی قانونی کارروائیوں میں پیش آئیں گی لیکن بحث جب ایک مجلس ہی تک محدود رہے تو اس کے متعلق ارکان کی احتیاط اور دانشمندی ہی عجلت کے مضر خطرات کو دور کر سکتی ہے۔ پس ہم یہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ اسجانی قواعد کے ذریعے اس امر کا انتظام کریں کہ ہر قانونی تجویز قبل اس کے کہ وہ بالکل اختیار کی جائے کونسل کے مقررہ سلسلہ منازل سے ہو کر گزرے، بہر منزل پر اس کے متعلق کمال بحث کی جائے اور درمیانی وقفہ آتنا ہو کہ کونسل کے ہر رکن کو

غور و خوض اور تحقیقات کا مناسب موقع مل سکے..... اس غرض کی تکمیل کے لیے زیادہ تر دقیق، مفصل اور جامع قواعد کی ضرورت ہے۔

۱۸۔ اس قسم کے قواعد بنانے میں انتہائی صورتوں کو یقیناً ملحوظ رکھنا چاہیے اور شدید ترین ضرورت کے وقت آپ کو جدید قانون (مشور) کی دفعہ ۴۹ سے مدد ملیگی جس میں گورنر جنرل کو انتہائی ذمہ داری پر کام کر کے غیر سنجیدہ مشوروں اور کمزور تحریکوں کی ممکنہ خرابیوں سے بچنے کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے مواقع جہاں انتہائی علاج کی ضرورت لاحق ہو باضابطہ و شائستہ سطنتوں میں شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں اور علی العموم ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر آپ یا باندی ثابت قدمی نیز باریک بینی کے ساتھ حسب عمل درآمد اپنے معمولی قواعد سے وابستہ رہیں تو نہ صرف خوبی کار کے متعلق بلکہ قانونی کارروائیوں کے طے کرنے میں بھی آپ کو خاطر خواہ اطمینان حاصل رہیگا۔

۱۹۔ آپ کے فرائض کے غور طلب حصے پر یوں اظہار خیال کرتے ہوئے ہماری توجہ خواہ خواہ ایک اہم ترمیم کی جانب منحرف ہو جاتی ہے جو قانون (مشور) نے مجلس اعلیٰ کے دستور میں کی ہے۔ ہمارا اشارہ سبوالذکر دفعہ ۴۴ مجلس مذکور کے چوتھے رکن معمولی کے تقرر کی طرف ہے۔

۲۰۔ جب ہماری ابتدائی اور نہایت اجمالی نظر اس قابل یادگار انتظام پر پڑتی ہے تو چونکہ رکن کونسل کی اعانت و موجودگی کو بایں بدل معلوم ہوتی ہے عدالت عظمیٰ کی اس منظوری کا جو اجالوں کے باشندوں سے متعلق ضوابط کے اجاز کے لیے اب تک لازم رہی ہے مگر جس کی ضرورت آئندہ جدید نظام کے تحت نہ ہوگی۔ بہر صورت یہ ظاہر ہے کہ جماعت متفقہ کا منشا اس قسم کا محض بدل ہیا کرنے سے بالاتر ہے۔

۲۱۔ کسی قانون کے بارے میں کونسل کا چونکہ رکن متفق نہ ہو تو بھی قانون مکمل ہو سکتا ہے نیز بوقت نفاذ اس کی غیر موجودگی قانون کو باطل نہیں کریگی مگر پارلیمنٹ کی علانیہ غرض و غایت یہ ہے کہ رکن مذکور کا سارا وقت پوری توجہ اور علم و کمال کے وہ تمام قیمتی ذرائع جو اسے حاصل ہیں سب کے سب کونسل کے

فرایض قانون سازی کی ٹھیک ٹھیک انجام دہی میں سرگرمی کے ساتھ کام میں لائے جائیں۔ فی الحقیقت وہ اس محکمے کی کارروائیوں میں کوئی اعلیٰ اقتدار نہیں رکھتا ہے مگر خاص طور پر تمام فروعات میں اسے ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ اس کی رائے کو نہ صرف مختلف قوانین کی تدوین و تکمیل کے کام میں جیسے جیسے کہ وہ نافذ ہوتے جائینگے لازماً اثر داخل رہیگا بلکہ اس کا عظیم میں بھی جو ہر موقع کے لحاظ سے تمام مقامی معلومات فراہم کرنے اور جمیع خیالات عام کو پیش نظر رکھنے سے متعلق ہے یا کونسل کو اس قابل بنانے میں کہ وہ شاید حکومت کے عقلی و ضروری اصول کو ایسے ضوابط میں جگہ دے سکے جو کثیر و بے شمار مختلف وضع قطع کے محکوم لوگوں کے ادارات اور عجیب و غریب عادات و خصائل کے مناسب حال ہوں۔

۲۲۔ یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ جو تیسرے رکن کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ بھڑان اجلاسوں کے جن کا تعلق قوانین و ضوابط وضع کرنے سے ہے کونسل میں نشست پانے یا رائے زنی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

۲۳۔ ہمارا خیال ہے کہ کونسل کے ہر رکن کو یہ آزادی ملنی چاہیے کہ وہ کوئی قانون یا ضابطہ برائے منظور ہوئی پیش کر سکے اور اس کی تجویز پر بحث و مباحثہ ہو جاوے۔ ابتداء میں وہ اپنی رائے کا واحد مؤید ہو۔ غور و فکر کی مجلسوں میں جو مختلف الحیال و کثیر التعداد لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں ایسا کوئی موضوع زیر بحث نہیں لایا جاسکتا جس کی تحریک و تائید نہ ہوئی ہو۔ اس قاعدے کی معقولیت عیاں ہے لیکن ایک مختصر و منتخب جماعت کے کاروبار میں ہمارے نزدیک یہ شرط لازم نہیں ہونی چاہیے۔

۲۵۔ آپ اصحاب کی ناگزیر مشاورت کے بارے میں اب ہم کچھ زیادہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی قدر اہم و دوسری بات جس کے لیے آپ کو آمادہ کرنا ہے یہ ہے کہ قانون سازی کے کام میں عملی طور پر جہاں تک ممکن ہو آپ پیرونی امداد سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ ایسے استخاص جو آپ کی جماعت کے ارکان نہیں ہیں ضروری قوانین پیش کر کے یا زیر غور قوانین کی تجاویز یا مسودات میں قابل اعتراض یا مشکل امور کو ظاہر کر کے آپ کو پیش بہا امداد دے سکتے ہیں۔

۲۶۔ جدید قوانین کے پیش ہونے سے متعلق قانون (نشور) کا حجب دفعہ ۶۱
 علانیہ یہ مطالبہ ہے کہ آپ قوانین یا ضوابط کے ان مسودات یا تجاویز پر غور کریں جو
 کسی ماتحت حکومت کی جانب سے آپ کی خدمت میں پیش ہوں، لیکن اس
 بحث پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہم بعد کو کسی دوسرے موقع پر اظہار خیال کریں گے۔
 قانون (نشور) کا یہ نصاب بھی ہے کہ کثیر ان قانون سے پیہم مراسلت کی جائے جس کا
 مقصد قانون سازی کے لیے اسباب یا مواد فراہم کرنا ہو۔ مفید معلومات سرکاری
 محکموں اور صدر عدالتوں کے حجوں سے، ان تمام ہندوستانی یا یورپی اشخاص سے
 جن کے ذمے عدالتی کام ہے یا جو سرکاری اعلیٰ خدمات پر مامور ہیں، تمام کالجوں اور
 دیگر آئینی جماعتوں سے اور غالباً دیہات کے ہندوستانی چودھریوں سے یا ذی اثر
 با اثر خاندانی افراد سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۲۷۔ دوسری بات جس کی جانب ہم نے توجہ کی ہے کچھ کم اہم نہیں ہے
 یعنی زیر غور قانونی تجاویز پر عوام یا با اثر اشخاص کی رائے حاصل کی جائے۔ یہ ایک
 ایسی چیز ہے جو انگلستان میں پارلیمنٹ کے مباحثوں کی مشہرت اور اس مدت
 کے وسیلے سے جو ایک قانون کے منظور ہونے کے لیے درکار ہوتی ہے ہاتھ آجاتی ہے
 لیکن ہندوستان میں اس کے حاصل کرنے کے لیے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔

۳۰۔ قوانین کی اشاعت کے متعلق ہماری خاص ہدایت یہ ہے کہ فی الوقت
 آپ کا جو طریق عمل ہے اسی پر آپ قائم رہیں کیوں کہ وہ بحیثیت مجموعی موزوں اور
 کارگر ہے لیکن ہم آپ کی توجہ ایک ایسے امر کی جانب معطوف کرنا چاہتے ہیں جس
 کے لیے طریق مذکور کافی نہیں سمجھا جاتا۔ فی الحال قوانین انگریزی زبان میں عدالتوں
 کی زبان میں اور ملک کی مروج زبان میں خواہ وہ کوئی زبان ہو طبع کیے جاتے ہیں
 اور ان کی نقول متعدد کارپردازان حکومت کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہ امر زیادہ پسندیدہ
 ہو گا کہ قوانین سے رعایا کو عام طور پر زیادہ واقف کرایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل
 کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں یہ سوال آپ کی افہام کا طالب ہے بہر کیف
 ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ملک کی زبان میں طبع کی ہوئی نقول تو زمین ارزاں قیمت
 پر ہر جگہ ان تمام اشخاص کے لیے بغرض فروخت تیار رہنی چاہئیں جو انہیں

خریدنے کے خواہش مند ہوں۔

۲۳۔ اب تک محکوم احاطوں کی قانون سازی میں آپ کے وسیع اختیارات نگرانی کو دخل رہا ہے لیکن ان احاطوں کو بطور خود قوانین وضع کرنے کا حق حاصل ہے اس لیے خاص خاص غیر معمولی موقعوں ہی پر آپ کی نگرانی رہی ہے۔ اب قانون سازی کا تمام کام چند مستثنیٰ صورتوں کے سوا صدر حکومت کے تابع رہے گا۔ اس کی ساری ذمہ داری آپ ہی پر عاید ہوتی ہے اور ہر قانون پر جو ان احاطوں میں سے کسی احاطے کے مقامی مفاد سے متعلق ہو نیز ہر عام قانون پر جو اپنی نوعیت و عمل کے لحاظ سے اس قسم کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو آپ کو قبل از وقت عمیق و تیز و آئینہ توجہ کے ساتھ اس طرح غور کر لینا چاہیے گویا وہ محض اُس احاطے کی فلاح و بہبود پر اثر انداز ہو رہا ہے جس میں آپ مقیم ہیں۔ آپ بے شبہ اپنے محکوم احاطوں سے قوانین کے مسودات یا تحریکات حاصل کر سکتے ہیں اور اکثر ان کے مطالبے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کسی حالت میں بھی آپ اس فرض سے سبکدوش نہ ہو سکیں گے کہ صورت حال کی کافی واقفیت پیدا کر کے ہر قانونی تجویز پر اس طرح غور کیا جائے گویا وہ درحقیقت آپ ہی کی تجویز ہے اور آپ ہی کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ایک کام کو دوسرے کے حوالے کرنے کا اختیار بہت آسانی کے ساتھ اس سے تغافل برتنے کی عادت میں خیر ہو جاتا ہے اور ہمیں یہ خوف بھی ہے کہ مبادا کسی آئندہ زمانے میں محکوم احاطے قانونی مسودات پیش کرتے کرتے خود اپنے لیے قوانین بنانے میں آزاد نہ ہو جائیں اور انہیں صدر حکومت کی دانشمندی امداد بہت ہی کم لینے کی ضرورت ہو مثل اس زمانے کے جبکہ قانون سازی کا اختیار صریح طور پر ان کے ہاتھوں میں تھا۔

۲۴۔ جب ہم قانون سازی کے ان وسیع اختیارات پر غور کرتے ہیں جو اس طرح ہماری صدر حکومت کو اور بعد ازاں ہمیں عطا کیے گئے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے استعمال ہی پر بہترین اور بدترین چھوٹوں کا امتیاز قائم ہوتا ہے اور جب اس امر پر غور کرتے ہیں کہ لاکھوں انسان اس طریقے سے جس کے

ذریعے ان اختیارات کو بحالت موجودہ کام میں لایا جائیگا آسودہ یا تپاہ ہو سکتے ہیں نیز جب ہم بے شمار مختلف اغراض و مقاصد کا مطالعہ کرنے اور اس اہم فسرص کی انجام دہی میں مشکلات پر غلبہ پانے کی جانب توجہ کرتے ہیں تو ہمیں اعتراضات کرنا پڑتا ہے کہ ذمہ داری کے بارے جو بالاشتراك ہم پر اور آپ پر رکھا جاتا ہے ہم تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خواہ کوئی ذرا بیچ یا مسامحی بر موقع کام میں لائی جائیں خواہ کوئی نتائج حقیقی و سرگرم بحث و مباحث یا عمیق و صداقت آمیز غور و فوض کے بعد نکالے جائیں اور خواہ کسی ہی امداد بیرونی مشوروں یا اطلاعاتوں سے حاصل کی جائے ان سب امور یا دیگر ممکنہ اشکال کو اس دائرہ عمل کی وسعت سے جس کا احاطہ کرنا اور اس خدمت کی اہمیت سے جس کا انجام دینا ضروری ہے مشکل کوئی مناسبت ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ ان امور پر آپ منتقل مزاجی کے ساتھ فوراً اپنی توجہ مبذول کرینگے اور ان پر کمال غور کرینگے۔ ہم اس بارے میں آپ کے مستقل خیالات پورے طور پر بہ محبت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حد تک یہ ظاہر کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ آپ کے خیالات کو تقویت دینے اور آپ کی نتجائز کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ دیگر اشخاص جو مشوروں یا کوششوں سے اس کام میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہیں اپنی امکاناتی قوت کے ساتھ ہمارے شریک کار ہونگے اور ہم اعتماد رکھتے ہیں کہ ہماری متحدہ مسامحی کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی عنایت شامل رہنے کے اس ملک کے وہ جائز و مفید مقاصد خیر و خوبی کے ساتھ پورے ہونگے جن کی بنا پر اس کے سمندر پار قومی زمین اہم ترین اور مرغوب ترین مقبوضات کے قانونی و عدالتی نظم و نسق کو ہمارے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے عام نظم و نسق کے متعلق گورنر جنرل یا اجلاس کونسل کے اختیارات کی توضیح کی جائے۔ یہ سچ ہے کہ پارلیمنٹ کے سابق قوانین نے حکومت بنگال کو دیگر احاطوں پر ایسا کامل اقتدار عطا کیا تھا جیسا کہ حیطہ تحریر میں آسکتا تھا مگر یہ اقتدار از روئے عمل برائے نام ہی تھا اور اس کی زیادہ اصلیت نہ تھی۔ دوسرا تصفیہ طلب مسئلہ یہ تھا کہ آیا صدر حکومت کے فرائض

تمھیں عام نگرانی اور مطلق العنانی پر متسل رہیں گے" یا مزید براں اسے بنگال پر براہ راست نگرانی رکھنی چاہیے اور اگر یہ صورت پیش آئے تو کیا ایک علیحدہ احاطہ آگرہ کی تشکیل سے بنگال کے وسیع احاطے کو دو احاطوں میں تقسیم کیا جائے۔ ان مسئلوں پر مدبروں کی رائیں مختلف تھیں۔ لارڈ ولیم بینٹنک اور اس کے رفقاء کے کار نے اس اصول کو پسند کیا کہ ماتحت حکومتیں صدر حکومت کے زیر اقتدار رہیں لیکن گورنر جنرل اپنی سمیت میں اپنی کونسل کو اس امر پر متفق نہ کر سکا کہ بنگال پر صدر حکومت کی براہ راست نگرانی حسب حال جاری رہے اور بنگال کی تقسیم عمل میں نہ آئے۔

حکومت ہند کے فرایض

ارکان مجلس نیز میرے دو رفیق مسٹر بیلی اور سر چارلس ٹکاف اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ صدر حکومت کا وقت مقامی حکومت کے ذیلی امور میں ضائع ہونے کی وجہ سے وہ بالآخر اہم تر امور موقوف کی انجام دہی سے کلیتہً فاصلہ رہتی ہے۔ میں بھی اس رائے سے پورے طور پر متفق ہوں۔

یہی اتفاق آرا اس ضرورت کے متعلق بھی ہے کہ صدر حکومت کو ہر قسم کی مقامی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جائے، اور یہ کہ اس کے فرایض مکوم احاطوں کی عام نگرانی تک محدود کر دیے جائیں اور بالائی صوبوں کے لیے ایک علیحدہ چوتھی حکومت قائم کی جائے۔

مغربی صوبوں کے نظم و نسق کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے جو حکومت کلکتہ میں قائم ہوئی ہے اس کی کمال غیر موزونیت پر مجھے اکثر اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا ہے اور تحقیقات سے اس رائے کی قطعی طور پر توثیق بھی ہو چکی ہے۔

۱۔ "مجھے اس رائے کے ساتھ کمال اتفاق ہے کہ ہندوستان کی صدر حکومت پر مختلف احاطوں میں سے کسی احاطے کے مقامی نظم و نسق کا آئندہ کوئی بار نہ پڑنا چاہیے۔ ڈیلو۔ بی۔ سیلی۔

"یہ امر ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ صدر حکومت مقامی نظم و نسق کے بار سے آزاد رہے سر چارلس ٹکاف۔

* Source.—Minute of Lord William Bentinck.

Dated September 14, 1831. (Parliamentary Papers.)

اس امر کے بارے میں کہ صدر حکومت دیگر احاطوں پر اپنی نگرانی کو صرف اس حد تک کام میں لائے جو اس کے حق میں مفید ترین ثابت ہو کوئی بڑا اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ اب تک یہ نگرانی حقیقی ہونے کی بجائے برائے نام رہی ہے اور حکومت کے عام امور سیاسی گفت و شنید، عہد ناموں کی ترتیب، اعلان جنگ، اہم مالی انتظام اور بڑا نہ حال تمام ضوابط کی توثیق تک محدود رہی ہے۔

معلوم احاطوں کے نظم و نسق کے ذیلی امور میں صدر حکومت کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ اسے ان احاطوں کی کارروائیوں کا علم صرف ان کے مراسلوں کی نقلوں سے جو مجلسِ نظما کو روانہ کی جاتی ہیں نیز حکومت و سبہ سالار اعظم کے شایع کردہ احکام سے ہوتا ہے۔ اگر صدر حکومت کو ان مراسلوں میں کوئی ایسی بات نظر آئے جو سخت اعتراض کے قابل ہو تو یقیناً اسے احکام کے اجرا کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن یہ نہایت نامناسب ہو گا کہ انتہائی ضرورت کے بغیر اس اختیار کو کام میں لایا جائے کیوں کہ فعل سرزد ہونے کے بعد اس کی عام تردید سے ماتحت حکومت کسی قدر پریشانی و شیمانی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب تجویز فیصلہ مجلسِ نظما کے زیر غور ہو تو صدر حکومت بھی اپنے بالادستوں کے روبرو اسی قسم کی قابلِ اعتراض حیثیت میں پائی جاسکتی ہے اور متضاد احکام و آرا کے سرکاری اعلان سے لازماً زیادہ دقت پیدا ہوگی۔

ماتحت حکومتیں فطری طور پر اپنی کامل آزادی کے لیے خوب جھگڑتی ہیں۔ ان کے ضوابط کو صدر حکومت کی منظوری کا محتاج بنانے پر انھوں نے شدید و مد کے ساتھ اعتراضات کیے حالانکہ اس امر کا سمجھنا مشکل معلوم ہو گا کہ عام خوف و خطر یا کسی دوسری شدید نا اہمانی ضرورت کے موقع کے سوا قانون سازی میں مزید بحث و مباحثہ غور و خوض اور وسیع تجربے سے نیز ان تدابیر کی کامیابیوں کے باہم مقابلے سے جو ایک ہی قسم کی خرابیوں کے ازالے کے لیے استعمال کی گئی ہوں، فائدہ اٹھانے کی بجائے اور کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اسی نظریے کی بنیاد پر انہی فہم و فراست سے معزز مجلسِ نظما نے فیصلہ صادر کیا ہے۔ لیکن نظم و نسق سے متعلق دیگر تمام کارروائیوں میں کیا خرابی پیدا ہو سکتی ہے اگر قانون کی یکسانی سے

کنارہ کشی اور حکام انگلستان کے احکام سے ٹوگردانی کا (جن سے گریزا اختیار کرنے میں بڑی سہولت، اور غیب کا سامان اس قدر دور و دراز مقتدر حکومت سے متواتر استعزاز کرنے کے باعث غیر محدود تاخیر کی بنا پر مہیا ہوتا ہے) اور بایں ہمہ مصارف کی فراوانی کا استعداد کے ساتھ فوری امداد کیا جائے، ہر محکمہ فوج میں ایسی مثالیں روزانہ ملتی ہیں کہ ایک فوج کو مراعات خاص عطا کی گئی ہے جس کے لیے دوسری فوج کے عہدہ داروں سپاہی خواہ یورپی ہوں یا ہندوستانی یکساں حق جتا سکتے ہیں۔

مذکور بالا خیالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مجلس اور میرے رفیقوں کے تائیدی میان کے بموجب میں صدر حکومت کا حامی ہوں جس کے فرائض محض عام نگرانی و سربراہی تک محدود ہونے چاہئیں لیکن میری یہ حمایت دیگر احاطوں بر صدر حکومت کا اقتدار موثر تر ہونے کی ضرورت سے متعلق ہے اور میں اسے ممکن العمل خیال کرتا ہوں بشرطیکہ بنگال کو دو احاطوں میں تقسیم کرنے کی مجوزہ تبدیلی عظیم جس پر مقامی و عملی اہم اعتراضات وارد ہیں عمل میں نہ آئے اس لیے مصارف گراں ابرداشت نہ کیے جائیں جو اس تجویز عظیم کے باعث عاید ہونگے، اگرچہ میں اس بارے میں سلبی کا بالکل ہم خیال ہوں کہ ایسے اعلیٰ مقصد کے مقابلے میں جیسا کہ ایک وسیع سلطنت (بنگال) کی حکومت کا زیادہ ترقی یافتہ ہونا ہے بڑے سے بڑے پیمانے پر بھی مزید مصارف کا بار ایک لمحے کے لیے قابل غور نہیں ہے۔ میرا پہلا اعتراض احاطہ بنگال کو دو متحدہ حکومتوں میں منقسم کرنے پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بالائی اور نشیبی صوبوں کے درمیان تفریق کرنے والی ایک حد فاصل موجود ہے اور یہ صوبے آب و ہوا، خصوصیات اور سیاسی حالات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں صوبوں کی حدودیں مال اور عدالت کے حکام کا ہونا ضروری ہے جن پر دراصل ان کے حقوق و اعتراض کا انحصار ہے۔ لیکن دیگر اعتبارات سے ان صوبوں کے عام مفاد میں بڑا باہمی تعلق ہے چنانچہ ایک ہی دریا مغرب سے مشرق تک تمام مملکت پر محیط ہے، ایک ہی بندرگاہ میں اس کی تمام پیداوار وصول ہوتی ہے، کلکتہ مبارکے کا بڑا مقام ہے جہاں سارا بیوپار اور روپیے کا لین دین ہوتا ہے۔

ان اسباب نیز دیگر متعدد وجوہ کی بنا پر حکومت کی تقسیم نہایت نامناسب ہوگی۔
 پس اجاطہ بنگال کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ تمام علاقے جن پر
 اس وقت وہ مشتمل ہے حسب حال گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تحت رہیں
 لیکن دارالحکومت بالائی صوبوں میں قائم کیا جائے جہاں تمام اہم ترین مالی، فوجی
 اور سیاسی معاملات کامرکز ہو کیونکہ براہ راست نگرانی کے علاوہ بلید ترین صوبوں
 سے فوری مداخلت اور جملہ کاروبار کی انجام دہی کے لیے جتنی زیادہ آسانیوں
 الہ آباد میں موجود ہیں وہ اور کسی جگہ نہیں ہیں اس یادداشت کے ساتھ ایک
 نقشہ منسلک کرتا ہوں جس سے ہمارے اہم ترین کاروبار کے ساتھ اس شہر کا
 تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اودھ، ساگر اور بھدرا کے علاقوں سے نیز بنارس
 سے بالکل متصل ہے اور اس کے زیر نگرانی بالائی صوبوں کا بندوبست مالگاری
 ہے جس کی حکومت اور پایا کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور جو آئندہ اپنی
 مذموم حالت پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ گوالیار، مالوہ اور راجپوتانہ کے علاقوں پر
 براہ راست نگرانی کے آسان ذرائع پوری طرح ہیا ہو سکتے ہیں اور بشرط
 ضرورت وہاں ذاتی طور پر آمد و رفت بھی ہو سکتی ہے۔ الہ آباد سے ایک دفاعی
 دریائے جمنہ کے کنارے آگرہ یا دہلی اور اسی قدر فاصلے کے کسی مقام پر جو دریائے
 گنگا سے متصل ہو چار یا پانچ روز میں پہنچ جاتی ہے۔ نیز الہ آباد میں حکومت کو جیسا کہ
 جماعت متفہنہ کا نشانہ ہے کونسل میں سید سالار اعظم سے شورہ کرنے کا موقع مل سکتا ہے
 جس کا صدر متقرر آئندہ ہمیشہ بالائی صوبوں میں ہونا چاہیے اور میں اس میں کوئی
 کی جرات کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ وہیں رہیگا۔

لیکن صدر حکومت کو جزوی امور کے بارے جس کے باعث اب تک
 اس کا قیمتی وقت نامناسب طریقے پر صرف ہوتا رہا ہے سبکدوش کرنے کے لیے
 یہ ضروری ہے کہ ایک ماتحت حکومت ان اختیارات کے ساتھ جو کونسل کے
 نائب صدر کو حاصل ہیں اجاطہ بنگال میں قائم ہو اور گورنر جنرل باجلاس کونسل
 کے احکام کی تابع ہو اور وہ پیشی صوبوں اور ہمارے تمام مشرقی علاقوں میں مال
 عدالت کے نظم و نسق کی نگرانی کرے اور کلکتہ میں ہر کام انجام دے۔ اب چونکہ

اکتوبر سے کلکتہ میں میری غیر حاضری رہی ہے اور میں نے احاطہ بنگال کی تمام کارروائیوں کی سماعت، بنگالی کا کامل اعتبار اپنے لیے بعینہ اس طریق عمل کے محفوظ کر لیا تھا جو گورنر جنرل باجلاس کونسل کا تصور تھیام الہ آباد ہونا چاہیے اس لیے میں اس حقیقی تجربے کی بنا پر اس خیال کی جانب مائل ہوں کہ صدر حکومت، احاطہ بنگال کے براہ راست انتظام سے دست بردار ہوئے بغیر سلطنت کے عام معاملات پر کافی توجہ مبذول کر سکتی ہے۔

یہ امر بھی پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا کہ ماتحت حکومتوں کے نظم و نسق میں گہری مداخلت واقع ہو، مداخلت میں تیزی اور خنہ اندازی کی بجائے نتیجہ کو تکمیل اور انسداد کا پہلو ہونا چاہیے۔ صدر حکومت کو اپنے وطن کے احکام کی تاسید کرنی چاہیے نہ کہ ان کی پیروی۔ وطن کی ہدایات میں جو نقائص اور کمزوریاں، بعد مسافت، اجرائے احکام میں تاخیر اور بے شمار سببیل کے عام حالات و اصلی واقعات کی پوری پوری واقفیت نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوں ان کی وہ تلافی کرے۔ اس کا فرض ہو گا کہ جدید دستور کی حالیہ منظوری کے مطابق قانون کی پابندی کرے، تمام نئے مصادر کو روکے، فوجی عملے سے متعلق مختلف امور میں ان تمام تفرقات کا سد باب کرے جو مجلس نظام کے احکام کے باوجود و انا واقع ہو رہے ہیں اور ضابطہ تمام احاطوں کی فوجوں کی ماتم تنظیم کا اس طرح بندوبست کرے کہ یہ ساری تنظیم متحدہ طور پر عام مداخلت کے کام آئے۔ لیکن صدر حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ان فرائض کا قلیل ترین حصہ بھی دوسری حکومتوں کے متبادل وقت معلوم کیے بغیر ادا کر سکے اور اس کی انجام دہی کے واسطے یہ ضرورت داعی ہوگی کہ ان کی کارروائیوں کی تمام رودادیں جیسا کہ کل ماتحت حکومتوں کا معمول ہے اول راست صدر حکومت کو بھیجی جائیں اور بعد ازاں ان کی نقلیں مغزو مجلس نظام کی آگاہی کے لیے روانہ کی جائیں۔

صدر حکومت کے دستور کے متعلق یہ طے ہو سکتا ہے کہ اسے حسب حال برقرار رکھا جائے یا اس لحاظ سے کہ اب جوں کہ سارا ہندوستان، برطانوی حکومت کے زیر نگین ہے اس لیے اس کے طرز حکومت میں یکسانی پیدا کرنے کی ضرورت ہے

فوجی حکومت کی سربراہی برہنائی اور نگرانی کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تفویض کیے جائیں گے۔“

۷۸۔ جو اختیارات یہاں بیان کیے گئے ہیں ان کے الفاظ کی تصریح جب پوری وسعت کے ساتھ کی جاتی ہے تو وہ حکومت کے سارے اختیارات پر حاوی ہو جاتے ہیں اور یہ امر مدجہ غایت ضروری ہے کہ آپ اس وسیع ذمہ داری کو جو اس طرح آپ پر عاید کی جاتی ہے بخوبی سمجھیں اور ذہن نشین کریں۔ ہندوستان کی تمام سول اور فوجی حکومت آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس کے نظم و نسق کی خوبی یا خرابی کے متعلق مدح یا مذمت آپ پر اثر انداز ہوگی۔

۷۹۔ مختلف احاطوں میں آپ کے اختیارات قانون سازی سے متعلق موضوع پر ہم نے عام نظائر کے جو حوالے دیے ہیں وہ فی الحال کافی ہوں گے۔

۸۰۔ دیگر اختیارات کے بارے میں جن کے استعمال کی جانب آپ کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے آپ پر لازم ہوگا کہ جو امور مقامی اور ماتحت حکومت سے واقعی تعلق رکھتے ہیں اور جو صدر حکومت سے متعلق ہیں جس کی عمرانی یا نگرانی تمام ماتحت حکومتوں پر ہے ان کے درمیان زیادہ جانچ اور غور و فکر کے ساتھ ایک صحیح حد تفریق قائم کریں۔

۸۱۔ یہ حد تفریق جب نامناسب طور پر قائم کی جاتی ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر حکومت مقامی حکومت کے صوبے میں مداخلت کر کے تفصیلات میں پڑ جاتی ہے جن پر وہ قابو نہیں پاسکتی اور جو اسے اپنے اہم ترین فرائض پر غور کرنے سے باز رکھتی ہیں یا یہ کہ وہ اپنی توجہ کو متعدد مشاہدات طلب واقعات سے پھیر لیتی ہے جو مقامی حکومت کے عام طریقہ کی بنا پر صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں اور اس طرح سلطنت صدر حکومت کی سربراہی و نگرانی کے فوائد سے جزوی طور پر محروم ہو جاتی ہے۔

۸۲۔ سچ ہے کہ پارلیمنٹ کے سابق قوانین نے جن کی رو سے ہنگال کی مقامی حکومت کو صدر حکومت کی حیثیت حاصل ہوئی گورنر جنرل باجلاس کونسل کو دیگر احاطوں کی سربراہی و نگرانی کا ایسا عظیم و کامل اختیار عطا کیا تھا جیسا کہ حیطہ تحریر میں آسکتا تھا اور ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ امر جماعت متغذہ کے فشا کے مطابق تھا۔

لیکن عملاً صدر حکومت نے اپنے اس اختیار سے بہت کم کام لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا تھوڑا سا استعمال بھی علی العموم ایسے مواقع پر کیا گیا جب کہ اس سے مفید اثرات مترتب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مثلاً ایسے موقع پر جب کہ ماتحت حکومت آزادی سے اپنا کام کر سکتی تھی اس طرح صدر حکومت نگرانی و ذمہ داری کی خصوصیت سے دست کش ہو کر مقضیٰ مغل مابعد سے مداخلت قائم رکھتی۔ اس قسم کی مداخلت ہمیشہ فریب دہ ہوتی اور اکثر صورتوں میں تو اس سے فریب ہی فریب ظاہر ہوتا کیونکہ جو فعل پہلے سرزد ہو چکا ہو اس پر خواہ مخواہ ہی ملامت کیوں نہ کی جائے اس کا پلٹ کر اصلاح پذیر ہونا امکان سے باہر ہے۔

۸۳۔ حال کے قانون کا صریحاً یہ منشا ہے کہ جماعت متقنہ کے اس مقصد کو عمل میں لائے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے۔ چونکہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں حکومت کے جملہ اختیارات آپ ہی کو دیے گئے ہیں اور آپ ان تمام علاقوں میں عمدہ حکومت کے ذمہ دار ہیں اس لیے آپ کو غور کرنا چاہیے کہ ان اختیارات کا استعمال مقامی حکام سے یا اس وقت جبکہ انہیں آپ کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے کس حد تک اور کن شعبوں میں بہترین طور پر ہو سکتا ہے۔ حکومت کے فروعی امور کے بارے میں جنہیں آپ بالکل یہ مقامی حکام پر چھوڑتے ہیں اور جن میں آپ کی گہری مداخلت بے سود ہے آپ کا یہ فرض ہو گا کہ ہمیشہ اپنے سامنے کافی ثبوت ہمارے گھس جو اس امر کی تیغ میں مدد دے سکے کہ آیا عام کاروبار کی رفتار ٹھیک ہے یا نہیں اور اس ثبوت کی جانب ایسی مبالغہ نہ توجہ مبذول کریں جس سے آپ کو ضرورت کے وقت فوری مداخلت کا موقع یقینی طور پر مل سکے۔

۸۴۔ علی العموم یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تمام صورتوں میں جہاں حکومت کے مختلف مداخلتوں میں صحیح طریق کار کا انحصار بیشتر صدر حکومت زیر ماتحت حکومتوں کی دانشمندی و اعتدال پسندی پر ہوتا ہے۔ یہ اصول خاص طور پر ایک ایسے عجیب و غریب طریق حکومت پر صادق آتا ہے جیسا کہ ہماری سلطنت ہند کا ہے۔ جماعت متقنہ کی طرح ہمارے لیے بھی یہ ناممکن تھا کہ جائز نگرانی اور غیر اہم پریشان کن مداخلت کے درمیان ٹھیک ٹھیک حد و کو بیان کیا جائے۔ ہم اپنے گورنر جنرل

باغلاس کونسل اور دیگر گورنروں کی معاہدہ فیہی پر بھروسہ کرتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کا جو طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ اس کے اصلی منشا کے مطابق ہوگا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اعلیٰ ترین حکومت کو نقصان پہنچائے یا اس کی طرف داری سے باز رہے بغیر ہر ماتحت حکومت کی واجبی عظمت و قوت کے تحفظ کے امکان پر شک و شبہہ کریں۔

۸۷۔ اماطہ بنگال کو دو احاطوں میں تقسیم کرنے کے لیے خاص نوعیت کی کارروائیاں عارضی طور پر درکار ہوں گی۔ حکومت اگر جب ایک مرتبہ قایم ہو جائے اور اس کا نظم و نسق چلانے کے انتظامات مکمل ہو جائیں تو یہ حکومت وہی راستہ اختیار کرے گی جس پر وہ دوسری حکومتیں گام زن ہیں مگر اس دوران میں ان انتظامات پر آپ کی زیادہ توجہ کی ضرورت ہوگی۔

۹۳۔ نیز ہم نے آپ کو مطلع کر دیا ہے کہ اماطہ فورٹ ولیم کے مقامی نظم و نسق میں گورنر جنرل کی اعانتہ کے لیے ایک علیحدہ کونسل کا قیام ہمارے پسند خاطر ہے نہ وہ ہمارے خیال میں لازم ہے۔ اس اعتبار سے گورنر جنرل کو بنگال کے بارے میں دو قسم کے فرائض انجام دینے ہیں: اول حکومت بنگال پر نگرانی رکھنے میں اپنی کونسل کے ساتھ اشتراک عمل کرے اور دوم کونسل کے بغیر یا اگر کوئی کونسل ہو تو اس کے صدر کی حیثیت سے صرف اسی حکومت کا کام جاری رکھے۔

۹۴۔ بالکل بدیہی بات ہے کہ ایک نہایت اہم فرض ایسی تجویز کے مستحکم کرنے میں آپ کو انجام دینا ہوگا جس کے ذریعے گورنر جنرل کے مختلف فرائض باہم ایک دوسرے پر ذرا سا بھی مضر اثر ڈالے بغیر ادا ہو سکیں۔ وہ ایک طرح کے فرائض پر جو وقت صرف کرتا ہے اسے یقیناً دوسری نوع کے فرائض پر نہیں لگایا جاسکتا ہے اور آپ پر لازم ہوگا کہ بدرجہ غایت محنت و مستعدی کے ساتھ غور کریں کہ گورنر جنرل کے وقت اور توجہ کی تقسیم اور ان دونوں چیزوں کے اس محدود حصے کے باعث جسے وہ اپنے ہر دو قسم کے فرائض کے لیے وقف کر سکتا ہے قبیح نتائج کے برآمد ہونے کا انداز کس طور پر ہو سکتا ہے۔

۹۵۔ حکومت بنگال برٹگرانی اور اس کی دیکھ بھال کے بارے میں آپ کی جو حیثیت قرار پائیگی اس میں سبھی ایک انوکھی چیز موجود ہے۔ یہ صورت حال آپ ہی کے صدر سے متعلق ہے جس پر آپ کو قابو پانا ہو گا اور شاید معاملات کا رُخ اس طرح پلٹے کہ بعض حالات میں سرمایگی واقع ہو جائے۔ جس خرابی کا امکان ہو اسے دفع کرنے کے لیے مناسب ہو گا کہ آپ نازک وقت پیش آنے سے قبل ہی اس کے مقابلے کا بندوبست کر لیں۔ ایسی صورت میں بہت کچھ مشکلات دور ہو جائیں گی کیونکہ سابق قواعد نافذہ کی پابندی سے ہر قسم کے فریب کا ازالہ ہو جائیگا۔

۹۷۔ جماعت مقننہ نے صدر حکومت کے منتقل و عارضی مرکز کا مقام اسی کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن گورنر جنرل کو بنگال کا مقامی گورنر بھی بنانے کی ناگزیر صورت کے باعث یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا معمولی مستقر ایسی جگہ رہے جہاں وہ اپنے دونوں قسم کے فرائض با حسن وجہ انجام دے سکے یعنی یہ مستقر بنگال میں ہو۔ پس ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ صدر حکومت کا مرکز کلکتہ میں ہونا چاہیے جہاں اب آپ کی رودادیں جمع کی جاتی ہیں اور جہاں سرکاری دفاتر بھی ضروری عمارتیں بھی پہلے سے موجود ہیں۔

۱۰۱۔ پس ہم نے آپ کی قانون سازی اور نگرانی کے وسیع تر فرائض پر اظہار خیال کر دیا ہے اور آپ کی توجہ آن امور پر منعطف کرائی ہے جن کے لیے ہمارے خیال میں غور و خوض اور انتظام کی فوری ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ ہم نے اس امید پر کیا ہے کہ ہماری تجاویز سریع النہم ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ اس طرح کن کن امور پر ہم آپ کے انکار سے مستغید ہونا چاہتے ہیں۔

تیسرا باب

انتظام معدلت

ہند کے سیاسی مسلک کے | ہند کے زیر غور ہند کے سیاسی مسلک کے سیم میدا
نشوونما میں قانون کی اہمیت | میں قانون ہی کا ایک ایسا دایرہ ہے جس میں
انگریزوں نے باریک بینی و انانی اور ثابت قدمی
کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے اور جہاں قانون
کو جو عملی تعلیم کے خواہاں ہیں بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل معلوم ہو چکی۔ اس سے
یہ مقصود نہیں ہے کہ کام نہایت اطمینان بخش رہا ہے یا بڑی بڑی غلطیاں سرزد
نہیں ہوئی تھیں بلکہ یہ کہ انگریز کسی کام کو اوجھڑا نہیں چھوڑتے ہیں۔ لیکن ان سے
جو غلطیاں واقع ہوئیں اور جو متواتر خیالات انہیں متاثر کرتے رہے وہ بجائے
خود سبق آموز ہیں اور میں اس بلے میں اتنا اضافہ کرونگا کہ انگلستان سے

*Source.—"Administrative Problems of British India."

قوانین ہند پر جو تنقید ہوتی رہی ہے اس کی جانچ اگر غیر جانب داری سے کجائے تو ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ آیا کوئی دوسری قوم بہتر تنظیم کر سکتی یا انگریزوں نے جو غلطیاں کیں ان سے بچنے کی کوئی صورت بھی وہ نکال سکتی تھی۔ کام سچیدہ تھا۔ اس میں یہ تردد متضرر تھا کہ جو ہو چکا ہے اس کا ایک جزو قائم رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ فیضانہ خواہش شامل رہے کہ جہاں چاہیے اس کا ایک جزو بھی رائج کروا جائے۔ اس قسم کی مرکب آرزو کی تکمیل میں اکثر معاری غلطیاں وقوع میں آسکتی ہیں لیکن اس کے باوجود وسیع قابل احترام ہے۔ جو کچھ لوگوں کے امکان میں تھا وہ انہوں نے کیا ہے اور باقی نقصانے پر چھوڑ دیا۔ گاہ نگاہ یہ ہو سکتا ہے کہ قانون لوگوں سے آگے نکل گیا ہو لیکن اگر ایسی صورت پیش آئے تو لوگ تیز رفتاری سے قانون تک پہنچ جاتے ہیں۔

کلائو جو ہند کی برطانوی مملکت کا حقیقی بانی ہے تجارتی نوآبادیوں کو مملکتی ملاقوں میں تبدیل کر چکا تھا اور اس وقت سے ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی افراس کی بہ نسبت حکومتی کلد و بار کی جانب زیادہ متوجہ تھی۔ اسے ایک وفادار قوم کی بنیاد کی حفاظت اور نگہبانی کرنی پڑی چند ہی سال میں ان جدید فرائض نے قدیم خیالات میں تغیر پیدا کر دیا۔ برطانوی کارپردازوں کی نظر میں انگلستان کے قوانین کی ہمہ گیر خاصیت باقی نہ رہی۔ لہذا مقامی قوانین و رسوم پر نہ صرف ان کی اصلی خوبیوں کے لحاظ سے وہ غور و غوض کرنے لگے بلکہ ان کی وقعت کے سبب سے بھی جو ہندوستانیوں کے نزدیک قائم تھی۔ فی الحقیقت اہل برطانیہ مقامی سیاسی مسلک کی خاصیت و ضرورت کو خاطر خواہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ اپنے یورپی رقیبوں یعنی فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کو شکست دے چکے تھے لیکن اس وقت انہیں اس بات کا علم نہ ہوا کہ جو فتح انہیں حاصل ہوئی ہے وہ کس حد تک مکمل ہے۔ آئندہ پچاس سال تک انہیں فرانسیسی مداخلت کے خطرے سے پریشانی لاحق ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہند کی وسعت عظیم کا صحیح علم حاصل کرنا شروع کیا۔ ان کے لیے کلائو نے جو علاقے فتح کیے تھے وہ باقی ماندہ دور دراز علاقوں کے مقابلے میں ادنیٰ تھے۔ مغل شہنشاہ کے اہم گرامی سے اس وقت

سبھی اخراج اور رعب و داب ہو دیا تھا۔ اہل برطانیہ اپنی مفتوحہ اقوام سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر ان کی قوت و بزرگی کو تسلیم کرتے تھے۔ انگلستان فاصلہ دراز پر ہونے کے باعث نیز اپنی پوری (اور ساتھ ہی امریکی) حکمت عملی کی بنا پر ہندوستان کے کاروبار سے بے خبر تھا اور اسی اثنا میں کمپنی نے پوری رقبوں کے خلاف اس کے رشک و حسد اور حقارت میں اضافہ کر دیا۔ اس پر یہ اغواء نہ ہو سکتا تھا کہ ایشیا میں اس سے کوئی بڑی مدد ملے گی۔ اس طرح بنگال اور برہمن کے عہدہ داران کمپنی نے اپنے کو یکساں طور پر غیر مستقل حیثیت میں پایا۔ ناقابلِ اندیش طرزِ عمل اور مفتوحہ اقوام کو برا بھلا سمجھنے کرنے والی تدابیر سے اس بات کا امکان تھا کہ یہ امن پسند لوگ محض اپنی کثیر تعداد کے ذریعے اس حکومت کا خاتمہ کروں جو اپنے علاقہ ضعف کی نسبت فی الواقع بہت زیادہ کمزور ہے اور اس طرح ایک سوہنجاس برس کی محنت ایک گھنٹے میں رائیگاں جائے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور اسی سوال سے حقیقی معنی میں ایک مقامی سیاسی مسلک کی بنا پڑی اور اس کی بدولت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ امر ضروری تھا کہ ہندوستانیوں میں کسی قسم کی بے اطمینانی پیدا نہ ہونے پائے لیکن اہل کے ساتھ ہی پورپیوں کے وقار میں کمی واقع ہونے وغیرہ اخلاق کا جن کے وہ نمایندے ہیں ایشار کیا جائے۔ ”اس طرح ہمارے نزدیک مقامی سیاسی مسلک کے معنی یہ ہیں کہ ایک طرف عملی طور پر دوسروں کے عقاید کا ایسا احترام کیا جائے کہ اس سے اپنی کمزوری کا اظہار نہ ہو اور دوسری طرف اپنے خیالات کی یوں حفاظت کی جائے کہ خلاف انسانیت فعل سرزد نہ ہو۔“

پس ہند کے سیاسی مسلک کے یہ مقاصد خود اس قانون کے متعلق تھے جو برطانوی حکمرانوں نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ ایم۔ جیلی نے بجا طور پر ان اہم خطیبوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو منزل مقصود کی راہ معلوم کرنے میں تہی گئی ہیں۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ہم ان بے شمار مشکلات کی طرف اپنا ذہن منتقل کریں جن کا سامنا کمپنی کو اپنے ابتدائی زمانے میں کرنا پڑا تھا جبکہ چند تاجروں نے نہایت کوتاہ اندیشی کے ساتھ ”اور خالی الذہن“ ہو کر لاکھوں انسانوں کی سیاسی ذمہ داریاں

اپنے سرے لیں جن کو انھوں نے نہیں سمجھا اور انتظامی کل جو بہت ضروری تھی چلانے کے کوئی شمار بھی ان میں نہیں تھے۔ لہذا غلطیوں کا موجود ہونا تعجب حیرت نہیں ہو سکتا۔

ان میں سب سے زیادہ منحوس کوشش وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے قانون تنظیم کے مطابق انگریزی قانون کو ایک ایسی قوم میں رائج کرنے کے لیے کی گئی جسے اس کی خوبیوں کی قدر کرنے کی عقل توقع ہو سکتی تھی۔ کتنا کیٹی لکھتا ہے کہ ”نئے انگریز جج“ انگریزی قانون کی خوبیوں اور نرمیوں کے متعلق نہایت تکبر آمیز خیالات اپنے ساتھ ہندوستان لے گئے۔ وہ دست گیری کی عرض سے باہر نکلے تھے مگر نباہی کا باعث ہو گئے۔ انتظام و امن کو قائم و برقرار رکھنے کی بجائے انہوں نے نظم و نسق میں انتشار پیدا کر دیا اور نہایت ناشائستہ فساد برپا کیا۔ ان کی طرف سے رعایا پر برکت کی بجائے لعنت نازل ہوئی اور اس کی حفاظت کے عوض ہشت طارتی ہوئی۔ اس صورت حال کا خاکہ میکالے نے اپنے مضمون متعلقہ وارانہ میں پیش کیا ہے۔

اس تجربے کے نتائج اس قدر نباہ کن ثابت ہوئے کہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ انگریزی قانون کا نقلی آئینہ ملک کے مقامی باشندوں سے نہ رہے۔ نظام نے لارڈ کلدن اس کے نام اپنی ہدایات میں یہ خواہش ظاہر کی کہ ”حکومت کے خیالات و مفاد کو رعایا کے موجودہ اطوار و رسوم کے موافق ڈھالا جائے اور انہیں ان دقیق نظروں کے ساتھ نہ ملایا جائے جو دیگر ملک سے اخذ کیے گئے ہوں یا مختلف حالات برحیماں ہوتے ہوں“ ہندوستانیوں کے آپس کے معاملات میں بھی جو صدر عدالت کی اختیاری حدود میں ہوں ہندو یا مسلمان فریق کی ذات سے متعلق قانون کی جانچ ضروری تھی جیسا سچہ یہ اہم اصول طے پایا کہ رعایا کے عقاید و رسوم کا احترام کیا جائے لیکن وقتاً فوقتاً ترمیمات اور تغیرات ناگزیر تھے اور انہیں ضوابط کی شکل میں مدون کیا گیا۔ ان ضوابط کو گورنر جنرل باغلاس کونسل نے تسلط ۱۸۵۷ء کے قانون تنظیم کی رو سے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے شکل میں اور مدراس و ممبئی کی حکومتوں نے جنہیں علی الترتیب سنہ ۱۸۵۸ء و ۱۸۶۰ء میں اسی قسم کے اختیارات دیے گئے تھے اپنے

اپنے علاقوں میں بذریعہ اعلان شائع کر دیا۔

بہر کیف یہ تجربہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ جو چیز نظریے کی حیثیت سے عمدہ معلوم ہوتی تھی وہ عمل کی صورت میں ناکارہ ہو گئی۔ اس امر کے متعلق کہ قانون کیا ہے اور کیا نہیں ہے غیر متوقع پریشانی اور قابل انوس پیمیدگی موجود تھی۔ سر کریم لینے البرٹ نے اس پریشانی کو جو اس وقت پھیلی ہوئی تھی حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :-

اس زمانے میں قوانین موضوعہ کے پانچ مختلف مجموعے سلطنت ہند میں نافذ تھے۔ پہلا مجموعہ قوانین موضوعہ کے اس تمام موجودہ حصے پر مشتمل تھا جو اپنی ممکنہ حد تک جاری تھا۔ اس کا نفاذ جارج اول کے دستور کے ذریعے عمل میں آیا تھا اور یہ کم از کم دارالامارات میں رائج تھا۔ دوسرے مجموعے میں زمانہ مابعد کے وہ تمام انگریزی قوانین تھے جو صریح طور پر ہند کے مختلف علاقوں میں رائج کیے گئے تھے۔ تیسرا گورنر جنرل کی کونسل کے ضوابط کا مجموعہ تھا جس کا نفاذ ۱۷۹۳ء کے مرقمہ مجموعہ قوانین کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ مجموعہ جس میں گزشتہ بارہ سال کی قانون سازی کے نتائج شامل تھے، انڈیا ایسٹ ضوابط پر مشتمل تھا جو سب کے سب ایک ہی روز مرتب ہوئے تھے اور جن پر ۱۸۳۱ء تک برابر عمل ہوتا رہا۔ ان ضوابط کے زیر اثر صرف بنگال کے علاقے تھے۔ چوتھے مجموعے میں مدراس کی کونسل کے ضوابط مدون تھے جن کی اشاعت بتیس سال یعنی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۳۱ء تک رہی۔ یہ ضوابط اعلاطہ فوٹ سینٹ جارج میں نافذ ہوئے اور وہاں اب بھی جاری ہیں۔ پانچواں مجموعہ ممبئی کے ضوابط کا تھا جن کی ابتدا ۱۸۱۸ء میں مسٹر ماؤنٹ اسٹوارٹ الفکسٹن کے ترمیم شدہ مجموعہ قوانین کے ساتھ ہوئی۔ ان ضوابط میں سابق اٹھائیس سال کی قانون سازی کے نتائج شامل تھے اور یہ ضوابط موثر و معقول طور پر اعلاطہ ممبئی میں ۱۸۳۱ء تک جاری رہے۔

پس ۱۸۳۱ء کے قانون کے ذریعے رمایا کے حقوق و جذبات اور اس کی عجیب و غریب رسوم کا وادی لیا جی لفظ کرتے ہوئے قوانین ہند کی کامل جہوین و ترتیب کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلے میں قانون کی دو ذیلی مجلسوں نے جو کام انجام دیا اس کا

مال ذیل میں درج ہے :-

* برطانوی ہند میں
قوانین کی تدوین

برطانوی ہند کو مکمل و معین نظام قوانین عطا کرنے کی تجویز غالباً اس مراسلت سے وجود میں آئی جو سرچارلس ٹکٹف اور بنگال کے دو ججوں کے مابین تقریباً ۱۸۳۱ء میں واقع ہوئی۔ ۱۸۳۳ء میں اس تجویز کو ہند کے قانون نشور کی تجدید کے وقت پارلیمنٹ نے قبول کر لیا۔ قانون نشور بابت ۱۸۳۳ء کی رو سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے ذریعے ایک قانونی مجلس کے تقرر کا انتظام ہوا تاکہ عدالت اور کوتوالی کے موجودہ محکموں کے قواعد و اختیارات اور ان کی حدود کی تحقیقات کی جائے، قوانین کی نوعیت و دائرہ عمل کی دریافت خواہ وہ برطانوی ہند کے کسی حصے میں رائج ہوں عمل میں آئے اور اقوام کے اختلاف مذاہب کی تفریق اور ان رسوم و خیالات کو جو برطانوی ہند کے مختلف علاقوں اور گونا گوں فرقوں میں پھیلے ہوئے ہیں بخوبی ملحوظ رکھتے ہوئے تحقیقات مذکور کے متعلق رُودادیں اور ان کی بنا پر ترمیمیں پیش ہوں۔

اس طرح ان اختیارات کے بموجب ہندوستان میں پہلی قانونی مجلس ۱۸۳۳ء میں مقرر ہوئی۔ یہ ابتدا میں میکالے اور کھننی کے ان تین سینئر ملازموں پر مشتمل تھی جن میں ہر احاطے سے ایک ایک تھا تقریباً دو سال کے بعد اس مجلس نے میکالے کے مجموعہ تقریرات ہند کا مسودہ شائع کیا۔ بعد ازاں مسٹر ڈرنک وائٹ پیچیون سر بارنس میکال اور دیگر شخصائے اس مسودے کی نظر ثانی کی اور اسے ۱۸۳۵ء تک قانونی حیثیت حاصل نہ ہوئی حالانکہ مجلس مذکور کو برخواست ہو کر ایک مدت گزر چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے میکالے کی روانگی کے بعد مجلس کا بہت کچھ اثر جا ہار ہا۔ یہ مجلس اپنی خستہ حالت میں بھی کئی سال تک قائم رہی اور اس نے اپنے میقاتوں میں رُودادوں کی ضخیم جلدیں شائع کیں مگر تدوین قوانین کے متعلق کسی تجویز کے عمل میں لانے کے لیے حکومت کو متاثر یا مل کرنے میں اسے

*Source.—“Legislative Methods and Forms,” by Sir-Courtenay Ilbert.

کامیابی نہ ہوئی اور انجام کار مجلس برخواست کر دی گئی۔ ہند کے آخری قانون منشور بابت ۱۸۵۲ء میں مامورین کی محنت و مشقت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ انہوں نے مسلسل طور پر رُودادوں میں عدالتی عملے، عدالتی طریق کار اور نفاذ یافتہ درائج شدہ قوانین ہند کے متعلق وسیع تغیرات کی سفارش کی ہے اور ان انتظامات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جن کا اجرا ان کے نزدیک قانون کے ذریعہ ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی بعض تجاویز عملی جامہ پہن سکیں اور اس قسم کی رُودادوں وقتاً فوقتاً مجلسِ نظا کو ارسال کی گئی ہیں مگر ان رُودادوں اور سفارشوں کے اہم تر جزو کا کوئی قطعی تصنیف نہیں ہو سکی۔

بائیں وجہ ۱۸۵۱ء کے قانون سے ایک جدید مجلس کے تقرر کا بندوبست ہوا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ سابق مامورین کی تجاویز اور عدالتی عملے، عدالتی طریق کار اور قوانین ہند کی اصلاح سے متعلق ان کے تجویز آئینی احکام نیز مذکورہ عملے طریق کار اور قوانین کی اصلاح کے بارے میں دیگر ایسے امور کی جو مامورین برائے معاملات ہند کی منظوری سے بغرض مشاورت ان کے حوالے کیے گئے ہوں کامل تحقیقات، محنت و متعدی سے حل میں لائے اور غور و فکر کے ساتھ تمام امور کی جانچ کرے۔

اس طرح دوسری مجلس ۹ نومبر ۱۸۵۳ء کو مقرر ہوئی۔ اس میں آٹھ افراد کا تھے جن میں سر جان روتیلی (جو بعد کو لارڈ ہوا)، سر جان جبروس، سر ڈورڈریان اور مسٹر رابرٹ لوٹشل تھے۔ ان کے تقرر کے وقت ہند کے دارالامارات میں ملکہ انگلستان کی اور گھنٹی کی عدالتوں کے (جو عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کے نام سے مشہور تھیں) انضمام کے منصوبے کی اطلاع پہلے ہی پارلیمنٹ کو دے دی گئی تھی لہذا مامورین کو حکم دیا گیا کہ وہ سب سے اول ان ابتدائی امور کی طرف متوجہ ہوں جو اس غرض کی تکمیل کے لیے اور خصوصاً ایک سادہ و یکساں ضابطہ طریق کار کی تیاری کے لیے ضروری ہوں۔

۱۸۵۶ء کے وسط تک لندن میں مامورین کے اجلاس ہوتے رہے۔ انھوں نے چار روادیں پیش کیں جن میں عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کے انضمام اور دیوانی فوجداری کے یکساں ضابطہ طریق کار کے متعلق ایسی تجاویز درج کی تھیں جو اس انضمام کی بدولت وجود میں آنے والی برطانوی ہند کی عدالتہائے عالیہ اور عدالتہائے ادنیٰ دونوں کے مناسب حال تھیں۔ نیز انھوں نے ایک باضابطہ قانون دیوانی سے متعلق ہند کی ضرورتوں پر توجہ کی اور ان کی تکمیل کے بہترین طریقے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ان مامورین کی سفارشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ اور مجلس وضع قوانین ہند دونوں نے اہم قوانین بنائے۔ میکالے کے مجموعہ تعزیرات پر غور و خوض کیا گیا اور بعد ترمیم سلسلہ میں اسے قانون کی شکل میں نافذ کر دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں ضابطہ دیوانی کا اور ۱۸۶۱ء میں ضابطہ فوجداری کا نفاذ عمل میں آیا۔ پارلیمنٹ کے قانون بابت ۱۸۵۹ء (دفعہ ۴۴ و ۲۵ ملکہ و کٹوریہ باب ۱۰۴) کی بنا پر ہندوستان میں عدالتہائے عالیہ کے قیام کی غرض سے کلکتہ کی قدیم عدالت عظمیٰ اور صدر عدالت کو حالیہ سند یافتہ عدالت ہائے عالیہ میں ضم کر دیا گیا اور شمال مغربی صوبوں میں دوسری عدالت عالیہ قائم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح سلسلہ میں ہندوستان کو قانون تعزیرات اور ضابطہ دیوانی و فوجداری حاصل ہو گئے۔ یہ ضابطے بے مشبہ غیر سلبی تھے اور ان میں اصلاح کی زیادہ گنجائش تھی لیکن ان سے بڑی حد تک مافیل کے غیر مربوط و غیر مکمل ضابطوں کی دستیابی ہو گئی۔

دارن ہسٹنگز کے عہد حکومت میں عدالتی طریق کار کی دوسری متبع صورت صدر عدالت اور کمپنی کی عدالتوں کے مابین رقابت کی تھی۔ صدر عدالت کی عدالت سے کمپنی کی عدالتوں کا اقتدار زایل ہو گیا اور تحصیل مالکزاری تقریباً ناممکن ہو گئی۔ صدر عدالت نے نواب کے اختیارات کو جس کے سپرد فوجداری کا انتظام تھا تسلیم کرنے سے انکار کر کے اور ججوں کے خلاف ناواب دست اندازی یا قید بلا اختیار قانونی کے مقدموں کی سہولت کر کے فوجداری کے عدل و انصاف کو معطل کر دیا۔ لیکن سلسلہ کا قانون نافذ ہونے سے اس قسم کی مداخلت جہالت عالم

کے سرکاری فرائض میں نہ ہو سکی۔ اس قانون کی رو سے کمپنی کی عدالتوں کو تسلیم کیا گیا اور یہ اساسی اصول قائم ہو گیا کہ ہندوستانی باشندے اس امر کے مستحق ہیں کہ جو قانون ان کی ذات سے متعلق ہو اسی کا استعمال ان کے ساتھ کیا جائے۔ تاہم صورت حال نہایت غیر مطمئن بخش رہی۔ مقدمات فوجداری میں صدر عدالت نے دارالامارت کے تمام مقیم باشندوں پر نیز تمام یورپیوں پر خواہ وہ کہیں سکونت پذیر ہوں اپنے اختیارات سے کام لیا۔ پس ضلع کا ایک یورپی اگر کسی ہندوستانی کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کرنا چاہتا تو وہ کلکتہ کی صدر عدالت میں رجوع ہوتا اور اگر ضلع کا کوئی ہندوستانی باشندہ کسی یورپی کے مقابلے میں کوئی دعویٰ کرتا تو موخر الذکر اپنا یہ حق جتا سکتا تھا کہ مقدمے کا فیصلہ صدر عدالت میں ہو۔ اس طریق کار کی بے ضابطگی ۱۸۳۳ء میں ملک کے اندر یورپیوں کے آزادانہ داخلے سے متعلق عائد کردہ قیود اٹھ جانے کے بعد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس صورت حال کے تضادات کو جس مجلس نے مجلس منتخبہ کے روبرو اپنی شہادت میں بیان کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

ہند کی موجودہ صورت تضاد کے ذمہ دار ملک کے لوگوں کی ایک جماعت کے غیر معمولی حالات ہیں۔ یہ جماعت متضاد کرشمے

نہیں ہے مگر بعض حالات میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے اور ان حالات کے باعث اسے جو قوت حاصل ہے اس کی بنا پر اس حکومت کے نافذ کردہ قوانین کی تابع نہیں ہے جس کے زیر سایہ وہ مقیم ہے۔ یہ جماعت اس حکومت کے قوانین سے آزاد رہنے کا حق جتاتی ہے اور حکومت کو اس کے لیے قوانین بنانے کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ اس جماعت سے میرا اشارہ ان انگریزوں کی طرف ہے جو ہندوستان میں مقیم ہیں۔ جو امور ملت ایک ہی رنگ میں

*Source.—Evidence of James Mill before the Select Committee of

پائے گئے ہیں ان کو نظر تساہل سے دیکھتے رہنے کی عادت نے ہیں مذکور بالا صورت حال کی انوکھی نوعیت کے مشاہدے سے باز رکھا ہے۔ اس طرح کی ایک مثال مختصر پیش کرنے سے زیر بحث موضوع زیادہ آسانی کے ساتھ دہشتان ہو سکتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس ملک میں یعنی انگلستان میں غیر ملکیوں کی ایک جماعت ہے جسے قانون کا پابند بنانے میں بادشاہ یا پارلیمنٹ عاجز ہے اور یہ غیر ملکی رعایائے ملک کے درمیان ہر طرف پھیل گئے ہیں مگر ہماری عدالتوں کی اختیاری حدود سے باہر ہیں اور اپنے بادشاہ کی صرف ایک ہی عدالت کی متابعت کے سوا جس کو وہ ہماری عدالتوں کے مقابلے میں بالاتر سمجھتے اور ظاہر کرتے ہیں کسی اور کی ماتحتی قبول نہیں کرتے ہیں۔ مزید براں اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ ان کی یہ واحد عدالت دارالسلطنت میں قائم ہے تاکہ انگریز اس مضرت رسائی کے خلاف جہاں اجنبیوں کے ہاتھوں عمل میں آئے کوئی جارہمازی نہ کر سکیں سچ اس کے کہ دارالسلطنت پہنچ کر انھیں کی عدالت میں ناش کریں علاوہ بریں یہ کہ یہ غیر ملکی لوگ اپنے عجیب و غریب حالات کے باعث اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ شاہ انگلستان کی رعایا کو ان سے دوا می خطرہ لگا ہوا ہے اور وہ ان کے افعال کے خلاف داورسی کی درخواست کرنے سے ہراساں ہے اور اگر ہم مذکور بالا مفروضے میں اتنا اور اضافہ کریں کہ ان کے بادشاہ کی اسی عدالت کو جو ہماری نہیں بلکہ ہمارے دارالسلطنت میں واقع ہے ہمارے تمام باشندگان دارالسلطنت کے متعلق عدل گستری کا کامل اختیار حاصل ہے اور اس واحد عدالت کے سوا ہمارے دارالسلطنت کی رعایا کو دوا خواہی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اور خود ہماری حکومت بادشاہ اور پارلیمنٹ کو ان غیر ملکی ججوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ایسے قوانین بنانے کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے جن کی پابندی دارالسلطنت کے باشندوں پر عاید کی جاسکے تو یہ صورت حال اس حالت کی متوازی ہوگی جو آج کل ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور میرے خیال میں شالستہ حکومت کے ساتھ اس کی غیر موذویت ثابت کرنے کے لیے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں ہے۔ صدر حکومت اور صدر عدالت کے

ججوں کی اس رائے سے مجھے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں عمدہ حکومت اس وقت تک نہیں قائم ہو سکتی جب تک کہ اس حکومت کی تمام رعایا کے ساتھ جس میں انگریز اور دیگر اقوام بھی شامل ہیں قانون کا یکساں طریق عمل نہ رکھا جائے۔

اس ناقابل اطمینان صورت معاملات میں قانون مشورہ بابت ۱۸۳۳ء کے نفاذ سے تغیر پیدا ہو گیا۔ ہندوستان میں یورپوں کو جو غیر معمولی حقوق نہ صرف معاشی امور میں بلکہ قانون کے معاملے میں بھی حاصل تھے ان کی اطلاع انگلستان پہنچ چکی تھی۔ معاملات ہند کے بارے میں جہاں تک عدل گسٹری کا تعلق تھا ذیلی مجلس منعقدہ ۱۸۳۳ء کی روداد میں جو مذکور بالا شہادت پر مبنی تھی ضروری اصلاحات کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ رفتار و اتعانت کی مسامتہ تھی کہ انگلستان جو ابھی پُر امن تبدیلی سے گزر کر مختلف جماعتوں کے مابین عدل گسٹری کو وسیع پیمانے پر لانے اور تمام مخصوص حقوق کو موقوف کرنے کی ذمہ داری کا اظہار کر چکا تھا ایک ایسی صورت حال کو برداشت نہ کرے جو انگلستان کی بدنامی اور ہندوستان کی بد اسلوبی کی باعث ہو۔ اصلاحی پارلیمنٹ نے جس نے انگلستان میں عوام کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہوئے معاشرتی اصلاح کی متعدد دشجائز نافذ کیں اور قانون مشورہ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اجارے کا مجموعی خاتمہ کر دیا، ملک معظم کی برطانوی اور ہندوستانی رعایا کے درمیان عدل گسٹری کا بہترین انتظام کیا اور ان میں از روئے قانون مساوات بھی قائم کی۔ لیکن جیسا کہ اکثر برطانوی ہند کی تاریخ میں پیش آیا ہے پارلیمنٹ کے قوانین کی توضیحی و فعات اس وقت تک بے اثر رہیں جب تک کہ مجلس نظام کی طرف سے ان کی منظوری اور اشاعت نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے ہند کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے نام مجلس نظام کی مراسلت کے حسب ذیل اقتباسات کو جو قانون مشورہ بابت ۱۸۳۳ء کے ساتھ منسلک تھے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ ہندوستانیوں کے لیے اس قسم کی حفاظت
غذائوں میں یورپوں اور
ہندوستانیوں کے باہمی روابط
کا انتظام کرنے کی جو اہمیت اور واقعی شدید ضرورت

تھی وہ ہمارے بیان کی محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ انگریز سرمایہ دار جو ملک میں مقیم ہیں مصالحتانہ و منصفانہ طرز عمل کے ذریعے اپنے ہندوستانی ہم سایوں کا اعتماد حاصل کرنے کی اہمیت معلوم کر لینگے بشرطیکہ وہ اپنی ذاتی اغراض میں روشن خیالی سے کام لیں تاہم اس بات کا امکان ہے کہ اس طبقے کے بعض لوگ فاسد خیالات سے مغلوب ہو جائیں۔ چند عارضی فوائد کی ہوس قوت کا احساس، نسل کی فرضی برتری کا غرور، رائے عامہ کی کافی مزاحمت کا فقدان، نیز کئی صورتوں میں اس معمولی مزاحمت سے کنارہ کشی جو مذہبی رسوم کے مقرر اور عام مظاہروں سے رونا ہوتی ہے یہ سب امور اور دیگر اسباب ایک مستقل باشندہ ملک کو کبھی کبھی اس بات پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ وہ صورت حال کو معمولی طور پر پیش نظر رکھ کر لوگوں کے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے کی بجائے بے احتیاطی و بے پروائی کا اظہار کرے۔ لیکن جبر و زیادتی کے انحال صادر ہونے کا اندیشہ اس قسم کے لوگوں سے زیادہ ہو سکتا ہے جن کا تعلق یورپ سے ہے سابق بادشاہی کے تبلیغ کی بنیاد پر منقطع ہو گیا ہے اور جو وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہتے ہیں چونکہ یہ لوگ برصورت میں اُن قبو و سے آزاد ہو جاتے ہیں جو اس ملک میں سو سائے کے رعب آفریں اثر سے اُن تمام لوگوں پر عاید ہوتی ہیں جن کا تعلق یورپ سے کمال طور پر منقطع نہیں ہوتا اس لیے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے اشخاص کو دیگر قبو و کے تحت رکھا جائے۔

۴۴۔ اگر مفصلات کا عدالتی انتظام مظلوم ہندوستانیوں کی واجبی و فوری دادرسی کے لیے کافی طور پر ذرا راجع جمیا کر دے تو آپ کی حکومت کو بہت کم وقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس غرض کے لیے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ برطانوی رعایا کو پورے طور پر ہندوستانی عدالتوں کے تابع کر دیا جائے اور اس کے بعد تمام حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن اس طرح آپ کے عدالتی انتظام کو اندرون ملک موثر ہونے کے لیے کچھ مدت درکار ہوگی اور اس اثناء میں ایک طرف آپ کے لیے یہ ضروری ہے

باقی مانشہ مندرجہ

Dated 10 November, 1884. From the Board of Directors
East India Company to the Government of India. (Parliamentary
Papers.)

کہ تمام ممکن ذرائع کی مدد سے انتظام مذکور کی خاطر خواہ ترقی میں مہلت سے کام لیں اور دوسری طرف آپ پر یہ امر لازم ہو گا کہ آپ اس کے اندرونی نقائص کی اصلاح کے لیے ایسے قوانین وضع کریں جو اس خاص مقصد کے لیے موزوں ہوں جو آپ کے پیش نظر ہے نیز حکومت کی چشم بیدار ان قبیح صورتوں کی جانب متوجہ کرائیں جن کا تذکرہ معمولی انتظام عدالت سے نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں ہماری ہدایات ضروریہ عام ہوئی، ہم قواعد مقرر کرنے کی بجائے اصول پیش کر چکے اور انہیں پورے طور پر عملی صورت میں لانے کا کام آپ ہی کی قوت تمیز پر چھوڑ دیا جائے گا۔

۴۳۔ اتفاقی خرابیوں کے متعلق خواہ کیسا ہی انتظام کیا جائے پارلیمنٹ کی تجاویز جو اہل یورپ کے لیے ہند کا دروازہ کھولنے کے بارے میں کی گئی ہیں اعتبار کے ساتھ ذہن نشین رکھی جائیں۔ جن دفعات سے ہمارے ہند کے سیاسی مسلک میں اس قدر اہم تبدیلی ہوتی ہے ان کا مشایقہ و عاید کرنا نہیں ہے بلکہ قوانین کے نفاذ میں مدد دینا ہے۔

جماعت متقنہ علانیہ اس اصول پر گامزن ہے کہ اہل یورپ کثرت سے ہندوستان میں داخل ہوں، اپنی ترقی پذیر اعراض میں ملک کے مفاد صمم کر لیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ آزادانہ میل جول پیدا کرنے کے زیادہ مواقع بہم پہنچائیں تو عمومی و مجموعی حیثیت سے یہ صورت حال ہندوستانی رعایا کے لیے مفید اور اس کی ترقی و خوشحالی میں معاون ثابت ہوگی۔ پس جماعت متقنہ کا جو مشاہدہ وہی آپ کا اور ہمارا ہونا چاہیے۔ لہذا آپ کے قوانین و ضوابط نیز ہندوستان میں یورپیوں کے داخلے اور بود و باتش سے متعلق آپ کی تمام انتظامی کارروائیاں شاہی جماعت متقنہ کے اس قانون کی مناسبت سے ہونی چاہئیں جو ان سب کا منبع ہے اور وہ عام طور پر مجموعی حیثیت سے ایسے اصول پر مبنی ہوں جن کا مقصد ان پر قیود عاید کرنا نہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہو۔

آپ جو قواعد و ضوابط ہندوستانیوں کو بدسلوکی سے محفوظ رکھنے کے لیے منصفانہ و ہمدردانہ نیت سے بنائیں وہ ایسے نہ ہوں کہ ان سے کسی یورپی پر غیر ضروری قیود عاید ہونے کا خوف طاری ہو جائے یا اسے نامناسب بنے اعتمادی

اور بدگمانی کے اظہار کے باعث بے اطمینانی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی نیت سے جو قوانین بنائے جاتے ہیں انھیں سے اکثر وہ فساد برپا ہو جاتا ہے جسے روکنا ان کا خاص منشا ہوتا ہے۔ ان سے بد نیت لوگ بُرے نتیجے اخذ کرتے ہیں، غیر مطمئن لوگوں کو ان سے شور و غوغا مچانے کا بہانہ یا مبادلہ جاتا ہے اور امن پسند ان سے برا فروختہ ہو کر مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

۵۹۔ مذکور بالا امور سے بعض عملی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں جن کی جانب آپ کی توجہ منحطف کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اولاً ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے سارے ملک کی جگہ برطانیہ نثر اور عایا آئندہ انھیں عدالتوں کے تحت رکھی جائے جو ہندوستانیوں کے لیے قایم کی گئی ہیں۔ اس زیر بحث موضوع میں بے شبہ یہ امر مضمر ہے کہ اندرون ملک رعایا کے مذکور مفصلات کی عدالتوں کے تحت رہیگی۔ جب تک اہل یورپ اندرون ملک داخل ہو کر محض منظور شدہ حق ملکیت کی بنا پر اپنے اپنے علاقوں میں مقیم رہے اور ان کی حیثیت کسی مغے میں بھی حکومت خارجہ کے وکالتی رہی انہیں ان مقامی عدالتوں کی ماتحتی سے جن کے تحت باشندگان ملک کی بڑی جماعت رکھی گئی ہے مستثنیٰ کرنے کی کچھ وجہ ہو سکتی تھی لیکن اسی صورت میں جبکہ ان کا شمار باشندگان ہند میں ہونے لگا ہے انہیں اپنی اس حیثیت کے مطابق عدالتی ذمہ داریوں اور ملکی حقوق میں یکساں شریک رہنا چاہیے۔ لہذا ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں ان کی متحدہ شرکت کا آغاز ہونا چاہیے۔

۶۰۔ ہم اس نتیجے پر محض اصولی بنا پر نہیں پہنچے ہیں۔ قانون کی دفعہ ۵ سے جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے یہ بات واضح ہے کہ یورپیوں کو اہل ملک کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو رفع کرنے کے ساتھ ہی یہ امر ضروری ہو جائیگا کہ انہیں ان فسادات یا خطرات سے جو میل جول کے باعث رونما ہو سکتے ہیں بچانے کی تدابیر بھی سوچ لی جائیں۔ اس دفعہ میں یہ ہدایت بھی موجود ہے کہ ہندوستانیوں کو توہین اور حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ توہین وضع کریں اور یہ ایک ایسا فرض ہے جسے آپ اس وقت تک

پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ ہندوستانیوں اور یورپیوں دونوں کو ایک ہی عدالتی نظام کے زیر نگرانی نہ کر دیں۔ البتہ جہاں ایک ہی قسم کی شرائط پر مساویانہ حیثیت سے سب لوگوں کی دادرسی نہ ہوتی ہو وہاں ان کی حفاظت میں بھی یکساں عمل ممکن نہیں ہے۔

۶۱۔۔۔ لیکن اس طرح کے اختلافات کا اثر خاص اصول پر نہیں پڑتا۔ اصل اصول یہی رہتا ہے کہ ہر نسل، ہر ملت اور ہر رنگ والے لوگوں کے ساتھ مساوی طور پر انصاف کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس میں اختلاف حالات کا لحاظ کم ہو۔

دفعتاً قانونِ منشور کے منشا کی تفصیل میں جسے نہایت قابلیت و صراحت کے ساتھ محمول بالا مراسلے میں بیان کیا گیا ہے یورپی برطانوی رعایا کی مراعات خصوصی سے متعلق بحث سلسلہ میں ختم کر دی گئی۔ قانون یا ذہم بابت سلسلہ کی رو سے رعایائے مذکور کو صدر عدالت میں مرافعہ پیش کرنے کے خاص حق سے محروم کر دیا گیا اور یہ قانون نافذ کیا گیا کہ کوئی شخص خواہ وہ کسی حسب و نسب یا نسل کا ہو کسی دیوانی کارروائی میں صدر دیوانی عدالت، عدالتہائے منصفین بلکہ دو ضلع، عدالت صدر امین اور احاطہ فورٹ ولیم بنگال کے محکوم علاقوں کے صدر امینوں کی اختیاری حدود سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

اس قانون کی جسے تمام صوبوں کی حکومتوں اور کمپنی کے ملازموں کی تعداد کثیر بنے منظور کر لیا تھا کلکتہ کے یورپی باشندوں کی جانب سے شدید ترین مخالفت ہوئی۔ ہندوستان کی انگریزی آبادی کے ایک خاص حصے کی متعصبانہ تنگ خیالی اور خود غرضانہ روش کو میکلائے اپنی مخصوص سلاست و مہارت کے ساتھ منہج ذیل یادداشت میں اس طرح بیان کرتا ہے:

*کلکتہ کی شورش | پس میں خیال کرتا ہوں کہ قانونِ ہفسمہ اچھا ہے اور اس کے

*Source.—Minute written by T. B. (afterwards Lord) Macaulay.

Reproduced in "The Public Life of Lord Macaulay," the Rev

Frederick Arnold. (Tinsley Brothers.)

نفاذ کے لیے وقت کا انتخاب بھی خوب ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کے نافذ کرنے کی زبردست ترین وجہ وہ نئے مخالفت جمعی جس کا مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ اس قانون کی تائید حکومت ہائے مدراس، بمبئی و آگرہ نے کی ہے اور سیول سروس کی جماعت نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے البتہ انگریزوں کے اس تنہا گروہ نے جس سے اس کی وفعات کا خاص تعلق تھا مخالفت کی اور کلکتہ کے انگریز باشندوں کے ایک حصے نے تو اس قانون پر شدت کے ساتھ ملکہ جینی کی۔ اس درخواست میں تو انھوں نے ایسا قابل گرفت لہجہ اختیار نہیں کیا ہے جیسا کہ ان یادداشتوں میں ہے جو حکومت ہند کے نام بھی گئی ہیں لیکن ان دونوں تحریروں کے طرز بیان میں قومی حمیت کی وہی قوت اور عید کی تسلط کا وہی جذبہ پوشیدہ طور پر اس زبان میں دیکھا جاسکتا ہے جو ہم انگلستان میں نہایت سرگرم حامیان حقوق جمہور سے سننے کے عادی ہیں جب یہ جوش و خروش جواب بالکل دب گیا ہے اپنی پوری قوت پر تھا ارکان مقابلہ نے ہر روز پتھر بلند کیا کہ انگریز فاتح ہیں، انگریز ملک کے مالک ہیں، انگریزوں کی قوم زبردست ہے اور انگریز اس دارالعوام کے منتخب کرنے والے ہیں جو قانونی حیثیت سے انگلستان کی چھینی اور یہاں آکے گورنر جنرل باجلاس کو قتل دونوں پر حاوی ہے۔ انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ برطانوی جماعت مقننہ کے انتخاب کنندوں کو ان قوانین کا پابند نہیں کیا جاسکتا جنہیں کسی ادنیٰ قوت نے بنایا ہو۔ حکومت نے ان دو سو بائیس سواستھان کی مہودہ چیچ پکار کا جو ایک ایسے معاملے سے متعلق تھی جس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا مگر اسے رائے عامہ کی بجا مخالفت سے تعبیر کیا گیا۔ انہوں نے ہم پر یہ الزام لگایا کہ ہم آزادی کے دشمن ہیں کیونکہ ہم قلیل التعداد انگریز امر کی جماعت کو ہمارے گرد و ہا نفوس پر جبری حکومت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

درخواست گزار کہتے ہیں کہ آئیٹ انڈیا کمپنی نے آزادانہ تجارت اور ہندوستان میں انگریزوں کی بود و باش کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور اسی وجہ سے ان کا یہ خیال ہے کہ انہیں کمپنی کی عدالتوں کے تحت رکھنا ان پر ایک بہت

بڑی سختی ہے۔

لیکن کھایا امر درست یا مقبول ہو سکتا ہے کہ حکومت ہند کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے اُن حالات کو پھر تازہ کیا جائے جو بالکل مٹ چکے ہیں؟ کچھنی تاجروں کے خاکی کاروبار میں آئندہ فریق متقابل کی حیثیت نہیں رکھتی ہے، وہ اب ایک تجارتی جماعت نہیں ہے بلکہ محض ایک حکمران جماعت ہے اور اس حیثیت سے اُسے کسی طبقے کے لوگوں کو بھی جو اُس کی مملکت کو یورپ کی صنعت و حرفت اور علم و ہنر کے ذریعے زیادہ خوش حال بنا سکیں اپنے علاقے سے خارج کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس اندیشے کے متعلق جو درخواست گزار ظاہر کرتے ہیں کہ اس قانون کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ اہل یورپ کا ہندوستان میں آباد ہونا بند ہو جائے میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ کچھنی کے ایک نہایت قابل قدر لازم یعنی مسٹر مل نے تجارتی کے الفاظ نقل کر دیے مسٹر موصوف سے دارالعوام کی ذیلی مجلس نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا اس کا یہ خیال نہیں ہے کہ شاہی عدالتوں کی کامل موقوفی سے اہل یورپ کا اندرون ملک (ہند) آباد ہونا سدا ہو جائیگا؟ اس نے جواب دیا کہ ”یہ بات ہرگز ممکن نہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب وہ جن اغراض کے تحت اندرون ملک داخل ہو رہے ہیں انھیں کی بنیادوں پر آئندہ بھی ان کا داخلہ اُس وقت تک ہوتا رہیگا جب تک کہ وہ اپنے مقاصد میں نیک نیت اور حق بجانب رہیں۔ اگر وہ وہاں ظلم و تعدی کے ساتھ ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے جا رہے ہوں تو یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں مطلق نہ جائیں۔“

یہ ناممکن ہے کہ کوئی مقبول شخص، کچھنی اور اس کے لازموں سے ایسا تعصب رکھ سکے کہ اسے فی الواقع اس بات کا یقین ہو جائے کہ کچھنی اور اس کے لازم تجارت سے کامل طور پر دست بردار ہونے کے باوجود دوسرے تمام تاجروں کے ساتھ اب بھی حسد رکھتے ہیں۔

لیکن پُرانی تجارتی رقابت سے بالکل جدا ایک اور رقابت بھی ہے جس کا الزام درخواست گزار کسی بنیاد کے بغیر محض بغض و عناد کی وجہ سے کچھنی

پر عاید کرتے ہیں۔ یہ رقابت ایسی ہے جو کمپنی کے نیز ان تمام اشخاص کے فرائض میں داخل ہے جنہیں کمپنی کی نامتبی میں کوئی عہدہ حاصل ہو۔ یہ رقابت محسوس نااجز کی رقابت نہیں ہے جسے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے مال کی قدر و قیمت گھٹ جائیگی بلکہ یہ اس حکمران کی رقابت ہے جسے یہ خوف ہے کہ رعایا جس کی فلاح و بہبود کا وہ ذمہ دار ہے کہیں ظلم و غارتگری کا شکار نہ ہو جائے۔ ہندوستان نے انگریزوں کے ہتیاروں کے آگے سر جھکا دیا ہے اور انگریز عہدہ دار اس پر حکومت کرتے ہیں۔ پس انگریز نژاد ہونا ہندوستان میں ایک طرہ امتیاز ہے۔ یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ ان صفات کی بدولت جن سے یہیں فتح نصیب ہوئی اور جن کے ذریعے اب ہم ملک پر حکومت کر رہے ہیں یعنی جرأت، استقلال، ذکاوت، خلوص اتحاد اور دماغی و جسمانی دونوں قوتوں کی نمایاں برتری جس نے ہماری سلطنت کو فروغ دیا اور اسے اب تک برقرار رکھا ہے ہر انگریز ہندوستانی آبادی کی نظر میں ایک زبردست ہستی ہے۔ ان حالات کے تحت یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے صوبوں میں اہل برطانیہ کے آزادانہ داخلے سے ایک نسل دوسری نسل پر مسلط ہو جائے اور یہ ایک بدترین قسم کا تسلط ہے۔ یہ اندیشہ علانیہ برطانوی پارلیمنٹ کے پیش نظر تھا جب اس نے قانون منشور نافذ کیا تھا اور اگر کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ ہندیشہ مذکور کے بنیاد تھا تو میں اسے ان تقریروں اور تحریروں کی طرف رجوع کروں گا جو اسی قانون منشور کے وضع ہونے کے وقت معرض بحث میں آئی تھیں۔ ان تحریروں اور تقریروں میں یہ امر شخص مذکور کے لیے دشوار نہ ہو گا کہ وہ ایسے الفاظ کے پردے میں جو انگلستان میں عام طور پر مہر گرہ عوام استعمال کرتے ہیں عدیدیت کی اس قوت کو بھانپ لے جس سے ویٹس کی طرح ایک امتیازی و خصوصی شان ظاہر ہوتی ہے۔

ہر ملک اور ہر زمانے میں کسی بڑے شہر سے جو دار الحکومت ہو امور عام پر ایسا اثر پڑ سکتا ہے جو اس کی حقیقی اہمیت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خرابی اس وقت رونما ہوتی ہے جب کہ ایسے شہر کی آبادی کے معاذار اور جذبات، سلطنت کی آبادی کے مفاد وغیرہ کے ہم نپ ہو جائیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اگرچہ دار الحکومت کی سوسائٹی کا اثر حکومت پر کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے تاہم ایسی سوسائٹی اور ہر آبادی

کے مفاد اور جذبات میں باہم اکثر اختلاف کلی ہوتا ہے۔ کلکتہ، مشرقی آبادی کے درمیان ایک انگریزی نوآبادی ہے۔ یہاں ہمارے اطراف ہمارے ہی نسل اور رنگ کے لوگ ہوتے ہیں جو ہماری ہی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور جو مستقلاً اس ملک سے مرسلت کرتے ہیں جہاں ہم سب کو واپس جانے کی امید ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی موافقی یا مخالفت رائیں کثیر التعداد غیر ملکیتوں کی ریلوں کی بہ نسبت میں زیادہ متاثر کر سکیں گی، مفصلات کے تمام علاقوں کے زہرا گلنے کے مقابلے میں کلکتہ کے کسی اخبار میں ہمارے خلاف کوئی آزار دہ مضمون شایع ہونے سے ہمارے جذبات زیادہ مجروح ہونگے اور تمام صوبوں کی دعا گوئی کے بالمقابل اپنے سچاس یا ساٹھ ہم وطنوں کے پیاس نامے سے ہم زیادہ خوش ہو گئے۔ یہ صورت حال مجھے اندیشہ ہے۔ بقا مضائقہ فطرت پیدا ہوگی۔ لیکن اس قسم کے جذبات پر قابو پانا یعنی ان چند لوگوں کے مقابلے میں جن سے ہمارے بہت قریبی روابط ہیں ان متعدد لوگوں کے معاملات میں بحسی لینا جن سے ہم ہر طرح مختلف ہیں نیز ان لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے جن کی تعریفیں ہم کبھی نہ سیکھیں گے اپنے ہم نشینوں کی ملامت کی پروا نہ کرنا ہمارا فرض اولین ہے اور یہ ایک ایسا فرض ہے جس کی انجام دہی میں میرا خیال ہے ہم اپنے وطن کے حکام سے تائید اور ہمت افزائی کی امید خاص طور پر رکھ سکتے ہیں۔ اب ہم نے غلط بیاننا دشنام آمیز کلمات اور غیر صحیح انتہا کی پروا نہ کر کے ایک قانون نافذ کیا ہے جسے ہم سابق گورنر جنرل مدراس کے گورنر باجلاس کونسل ممبری کے گورنر باجلاس کونسل اور کمپنی کے تقریباً جملہ سیول ملازمین عوام کی جماعت عظیم کے لیے منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ مفصلات میں رہنے والے انگریز اور مدراس و مہنی کے شہروں کے انگریز اس قانون سے ہر طرح مطمئن ہیں۔ صرف کلکتہ کی انگریزی آبادی نے جس کی رہنمائی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہے جو دنیا کی بدترین عدالت کی بدترین کمزوریوں کو برداشت کرتی ہے ہمارے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اگر یہ احتجاج کامیاب ہو جائے تو اس ملک کا مستقبل بہت تاریک ہو جائیگا، لیکن مجھے معزز مجلس اور برطانوی جماعت مقننہ سے جو اطمینان حاصل ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جماعت مذکور بالا نا کام رہیگی اور مجھے یقین واثق ہے کہ ہمیں اس موقع پر ایسی تائید حاصل ہوگی جس سے

ہماری تین تین لوگوں کی جو ہمارے بعد آئینگے بہت افزائی ہوگی اور جب وہ ہندوستان کی بہتری کے لیے قانون وضع کریں گے تو اس قسم کے شور و غل کو نظر انداز کر سکیں گے۔ ۱۸۳۱ء میں لارڈ کارنوالس نے جو عدالتی نظام قائم کیا تھا اس کا ایک اہم جزو دیوانی مقدمات کی تحقیقات کے لیے ہندوستانی کسٹمرز کا تقرر تھا۔ یہ واقعہ مورخین کے اس عام عقیدے کے خلاف ایک ثبوت ہے کہ لارڈ کارنوالس نے سرکاری ملازمت کے دوران ہندوستانیوں پر بند کر دیے تھے۔ بایں ہمہ یہ صحیح ہے کہ ان کی خدمات خاص طور پر مثالوں اور پتھروں کی حیثیت سے کام میں لائی جاتی تھیں اور لارڈ موصوف کا یہ عمل محض اس خاص رواج کا اتباع تھا جو قانون تنظیم کے نفاذ کے وقت رائج تھا۔ ۱۸ اگست ۱۸۳۱ء کے قانون تنظیم کی دفعہ ۱۱ کی رو سے "ان تمام تنازعات ملکیت کا فیصلہ جو دس روپیوں سے زیادہ کے نہ ہوں" فریقین کے پرگنے کے چودھری کے اختیار میں تھا اور اس کا حکم قطعی ہوتا تھا۔ بعد ازاں ۱۸۳۱ء کے قانون تنظیم کے بموجب فی کس پچاس روپیہ ماہوار پر چھ منصف یا سرکاری ثالث ہر ضلع کی دیوانی عدالت پر تین برس کے عرصہ کے قانون نشان سے ان کی تعداد اور ان کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔

ہند کی عدالتی خدمات کی تاریخ مابعد بہت دلچسپ اور اہم ہے جو ذیل کے اقتباس میں واضح طور پر درج ہے:

۱۸۳۱ء میں عدالتی نظام کے دیگر اجزائے قانون کے ساتھ ساتھ عدالت کے ہندوستانی مہدواروں سے متعلق قانون میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اراضی معافی کے علاوہ ملکیت یا قبضہ زمین یادگیر جا یا دیگر منقولہ کے مقدمات بھی اب منہ نفوں کے اختیار سماعت میں دیے گئے اور انہیں تین سو روپیوں تک کے مقدمات سماعت کرنے کا اختیار

عطا کیا گیا۔ چنگانگ کے منصفوں سے متعلق خاص قواعد نسخ کر دیے گئے اور ان کی بجائے علی الاہم جملہ منصفوں کی ہدایت کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ جائداد غیر منقولہ کی وراثت و جانشینی کے مقدمات کا فیصلہ مسلمانوں کے لیے شرع اسلام اور ہندوؤں کے لیے دسرم شاستر کے مطابق کیا جائے۔ اگر فریقین مختلف مذہب کے ہوں تو فیصلہ مدعا علیہ سے متعلق قانون کے بموجب کیا جائے لیکن صرف ان صورتوں میں جبکہ مدعا علیہ ہندو یا مسلمان ہو۔ یہ قاعدہ جن صورتوں پر عائد نہ ہو وہاں منصف کو عدل، حق رسی اور نیک نتیجہ پر عمل کرنا چاہیے۔ جو مقدمات منصفوں کے اختیار سماعت میں ہوتے تھے وہ معمولاً انھیں کی عدالتوں میں دایر کیے جاتے تھے لیکن جج بھی ایسے مقدمات کی سماعت و دریافت کر سکتے تھے۔ منصفوں کو اب اس امر کی اجازت تھی کہ وہ اپنی جاری کردہ ڈگریوں کی تعمیل سے متعلق درخواستیں وصول کریں لیکن انہیں ان درخواستوں کو ججوں کے پاس بھیجنا پڑتا تھا جو منصفوں کو ان کی تعمیل کی ہدایت کرتے یا اپنے ہی ماتحتوں سے ان کی تعمیل کراتے تھے۔ منصفوں کو اب محتانہ ادا نہیں ہوتا تھا بلکہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی مقرر کردہ تنخواہ انہیں ملنے لگی۔

۲۲۳۔ صوبوں کی ان عدالتوں کی موقوفی سے جن کے ججوں نے ضلع اور بلدے کے ججوں کی سفارش پر صدر امینوں اور منصفوں کا تقرر کیا تھا یہ لازم آیا کہ اس قسم کے اختیارات کے استعمال کے لیے دیگر انتظامات کیے جائیں چنانچہ یہ طے پایا کہ ان کا استعمال آئندہ ایسے طریقے پر کیا جائے جسے گورنر جنرل باجلاس کونسل پسند کرے۔ عدالت ہائے بلدہ و ضلع کے قانونی عہدہ دار اب باقتبا عہدہ صدر امین نہ ہو سکتے تھے بلکہ ان کا دیگر ارکان کی مانند تقرر طلب عہدے کے لیے منتخب ہونا ضروری تھا۔ ججوں کے لیے یہ جائز نہ رہا کہ وہ منصفوں کی عدالتوں سے متعلق مرافعوں کو صدر امینوں کے پاس سماعت کے واسطے بھیجیں۔ اس طرح صدر امین کے عہدے کی اہمیت کسی قدر گھٹ گئی، لیکن اس کی تلافی یوں کی گئی کہ ایک نیا عہدہ بنام صدر امین اعلیٰ قائم کیا گیا اور یہ عہدہ بشمول عہدہ ہائے منصف و صدر امین ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے باشندوں کے لیے

عام کر دیا گیا۔ ان عہدوں پر تقرر گورنر جنرل کی طرف سے ہوتا تھا اور وہی مامور شدہ افراد کا مشاہرہ بھی مقرر کرتا تھا۔

صدر امین اعلیٰ کو ابتدائی اختیارات ایسے مقدمات میں دیے گئے جو زر نقد یا ذاتی جائیداد یا ملکیت یا قبضہ زمین یا دیگر جائیداد غیر منقولہ سے جس کی مالیت یا قیمت پانچ ہزار روپیوں سے زائد نہ ہو متعلق تھے۔ چونکہ اس قسم کے مقدمات اپنی فہرست میں رکھ چھوڑتے انہیں اپنے اس فعل کی وجہ درج کرنی پڑتیں۔ صدر امین اعلیٰ اپنی جاری کردہ ڈگریوں کی تعمیل کرانے کا مجاز تھا البتہ تعمیلی کارروائیوں کے متعلق اس کے نافذ کردہ احکام کا مرافعہ جج کے یہاں ہو سکتا تھا۔ اگر جج کے اجلاس پر مقدمات کی اس قدر کثرت ہوتی کہ اس کے لیے تمام زیر تجویز مرافعوں کا فیصلہ معقول مدت میں کرنا غیر ممکن ہوتا تو اسے صدر عدالت دیوانی میں کیفیت پیش کرنی پڑتی تھی جہاں سے اسے یہ اجازت مل سکتی تھی کہ وہ مرافعوں کی ایک خاص تعداد اپنے صدر امین اعلیٰ کے پاس بھیج دے۔

سلطنت کے ضابطہ سوم کی دفعہ ۳ کی رو سے صدر امین کو جو معمولی فوجداری اختیارات حاصل تھے وہ صدر امین اعلیٰ کو بھی عطا کیے گئے اور مجسٹریٹوں کو اس امر کا مجاز کیا گیا کہ جو فوجداری مقدمات ان کے اختیار سماعت سے باہر ہوں انہیں وہ مذکور بالا دو عہدہ داروں میں سے جس کے پاس چاہیں بھیج دیں۔ لیکن یہ عہدہ دار مقدمات کو عدالت سیشن کے سپرد کرنے کا اختیار نہ رکھتے تھے۔ جج کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ بہ ضرورت شدید کسی صدر امین اعلیٰ، صدر امین یا منصف کو معطل کر دے۔ جب ان میں سے کسی کو برطرف کرنے یا نہ کرنے پر کشش نہ اونچ میں اختلاف ہوتا تو ان دونوں کو اپنی رائیں صدر دیوانی عدالت پر بھیجی پڑتیں یا یہی صورت میں جب کہ جج اپنی طرف سے کوئی تجویز نہ کرے کمشنر برطرفی کی تحریر ایک کر سکتا تھا۔ گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر صدر امین اعلیٰ اور صدر امین اپنی اپنی خدمتوں سے برطرف نہیں کیے جاسکتے تھے۔ منصفوں کو صدر دیوانی عدالت برطرف کر سکتی تھی۔

۱۸۳۷ء کے قانون نشان کی رو سے ججوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ

ابتدائی مقدمات خواہ وہ کسی مالیت یا قیمت کے ہوں صدر امین اعلیٰ کے پاس بھیج دیں اور صدر دیوانی عدالت کی منظوری سے وہ اس کے بھی مجاز تھے کہ دیوانی مقدمات کی تفریق و سرسری کارروائیاں بھی بھیج دیں۔ اس قسم کی کارروائیتوں میں صوبوں کے صدر امین اعلیٰ جو احکام نافذ کرتے تھے ان کا مرافعہ پہلے جج کے پاس اور پھر بطور خاص صدر دیوانی عدالت میں ہوتا تھا۔ ابتدائی مقدمات میں پانچ ہزار روپیوں تک کی ڈگریوں کا مرافعہ پہلے جج کے یہاں ہوتا تھا اور پھر بطور خاص صدر دیوانی عدالت میں۔ اس سے زیادہ کی مالیت کے مقدمات کی ڈگریوں کا مرافعہ صدر دیوانی عدالت میں ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں منصفوں کو نظارت کے فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش کر دیا گیا اور انہیں اپنے عملے میں ناظروں کے تقرر کا اختیار دیا گیا۔

۱۸۵۷ء میں وہ قاعدہ جس کی بنیاد پر جج، منصفوں اور صدر امینوں پر جرمانہ کر سکتے تھے منسوخ کر دیا گیا کیونکہ قاعدہ مذکور اب ان عہدہ داروں کی اس اعلیٰ تر عدالتی حیثیت کے منافی تھا جو انہیں حاصل تھی۔ ججوں اور اعلیٰ صدر امینوں کی عدالتوں میں ابتدائی دیوانی مقدمات کے فیصلوں کی بابت جو قواعد نافذ تھے وہ ۱۸۵۷ء میں صدر امینوں اور منصفوں کی عدالتوں میں بھی نافذ کر دیے گئے اور صدر امینوں اور منصفوں کو پہلی مرتبہ ایسے مقدمات کی سماعت کرنے کا اختیار دیا گیا جن میں فریقین انھیں کی عدالتوں کے عہدہ دار یا وکیل ہوں۔ ۱۸۵۷ء میں جنوبی اور شمال مغربی صوبوں کے ہندوستانی ججوں سے متعلق قانون میں دوبارہ ترمیم کی گئی اور اسی سال کے قانون نشان کے ذریعے اس کی توسیع کی گئی۔ اس قانون کی رو سے جو خاص تبدیلیاں عمل میں آئیں وہ یہ تھیں کہ صدر امین کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا، صدر امین اعلیٰ کی بجائے ناٹھت جج تمام تجویز کیا گیا اور منصف کی حد اختیار میں وہ تمام ابتدائی مقدمات دے دیے گئے جو دیوانی عدالتوں کے اختیار سماعت میں تھے اور جن کی مالیت یا قیمت ایک ہزار روپیوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قانون نشان کی ترمیم ۱۸۵۷ء کے قانون کی رو سے عمل میں آئی اور یہ دونوں قانون ۱۸۵۷ء کے قانون شکسم متعلق بہ عدالتوں

دیوانی بنگال سے منسوخ ہو گئے اور اس قانون ششم کے ذریعے آخر اس قانون کی ترمیم و توثیق ہو گئی جو احاطہ فورٹ ولیم واقع بنگال کے جنوبی و شمال مغربی صوبوں کے لغٹنٹ گورنروں کی حکومتوں کے زیر اثر علاقوں میں ضلع کی عدالتوں اور ماتحت دیوانی عدالتوں سے متعلق ہے۔

عدالت کی ڈپٹی خدمات میں ہندوستانیوں کے اختیارات و فرائض کی توسیع خاص طور پر لارڈ ولیم بنٹنک کی عدالتی اصلاحات کی مرہون منت ہے۔ جس فیاضانہ جذبے پر اس سیاسی مسلک کی بنیاد رکھی گئی اس کا اندازہ اس کے مضابطہ پنجم، مضابطہ آٹھ، مضابطہ نہم اور مضابطہ دہم کے ضابطہ ہشتم سے کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ عام طور پر ہندوستانیوں کے لیے قائم کیا گیا۔
 ۲۔ صدر امین کا عہدہ قائم کیا گیا۔

چوتھا باب

سرکاری خدمات

ہند کے سیاسی مسلک کو جیسا کہ اس زمانے کے بڑے حکمرانوں نے تجویز کیا تھا موثر طور پر نافذ کرنے کے لیے ایک ایسی ملازمت دیوانی کا اجرا ضروری تھا جس میں ایک طرف قابلیت و دیانت اور دوسری طرف رعایائے ملک کے ساتھ خوب میل جول ظاہر ہو۔ اٹھارویں صدی کے اُن ایام میں جبکہ کمپنی نے سیاسی ذمہ داریاں یعنی شروع کیں کمپنی کا ایک محرر اپنے قلیل جمعیت میں اضافہ کرنے کے لیے ناجائز افعال بددیانتی پر اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ اگرچہ چند اپنے کو حرص و طمع سے دُور رکھنے میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے ایسی جرأت اخلاقی اور قابلیت حکمرانی کا جسے کوئی سنجیدہ نظام تربیت بھی پیدا نہ کر سکتا تھا اظہار کیا تاہم اکثر لالچ میں آ گئے۔ بہر حال لارڈ کارنوالس کی اصلاحات کے نواید ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے زمانے سے کمپنی کے ملازموں کے مشاہرے معقول ہو گئے تھے اس لیے ان کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا تھا۔ علاوہ بریں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قانون بابت ۱۷۹۳ء کی شرائط کے مطابق سرکاری ملازمت

میں وہ اہم عہدے جو کونسل کی رکنیت سے کم درجے کے تھے لازماً مستبعد
کے عہدہ داروں کے لیے محفوظ کر دیے گئے تھے اور اس طرح
حسن کارگزاری کا انعام عہدے کی ترقی سے دیا جاتا تھا۔ اور وہ زمانہ تو
دفتری نہیں بلکہ شخصی حکمرانی کا تھا جبکہ عہدہ دار ضلع بہت معتد رہتا تھا
اور مشاؤ و نادری ہی اس کے اختیارات میں صدر مستقر سے مداخلت ہوتی تھی۔
لازم دیوانی کی ذمہ داریاں بہت اہم تھیں لیکن وہ محنت اور فرائض کی
سخت پابندی کی طرف اسے راغب کرتی تھیں۔ ایک لازم دیوانی
کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کے حلقہ اثر کی رعایا خوش حال رہے کیلنگ
کے علاوہ متعدد اشخاص نے اس زمانے کے لازمان کیننی کی دیانت اور
حسن کارگزاری کی داد دی ہے لیکن خود ان کی اعلیٰ شہرت کسی خارجی اظہار
رائے کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی تائید نہ صرف باشندگان ملک کی
نوشس حالی سے ہوتی ہے بلکہ ان خیالات سے بھی جو انہوں نے سرکاری
یادداشتوں میں ظاہر کیے ہیں۔ ان اسنادیں سے صرف چند کا اعادہ اس
کتاب میں ممکن ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہیں بڑی وقت آن متعہد سرکاری
تحریروں میں سے انتخاب کے وقت پیش آئی جو مواد اور طرز عبارت کے
کے لحاظ سے قابل تعریف اور بلند پایہ ہیں۔

پس جو مسائل اس وقت حکام کے سامنے تھے وہ زمانہ سابق کے
مسائل سے مختلف تھے۔ یہ مسائل ذیلی امور کے تھے دگوبہ امور بے مشبہ
اہم تھے اور ان کا تعلق خاص طور پر تین امور سے تھا یعنی لازمان کیننی
کی تربیت، ملازمت کی تنظیم اور ملازمت میں داخلے کے طریقے۔
طریقہ تربیت کی تشریح منظر اور ڈن نے اپنی شہادت میں جو ۱۸۳۲ء
کی مجلس نقضہ کے روبرو دی تھی یہ کی ہے کہ اس شخص کو جو ہندوستان کی
ملازمت دیوانی میں داخل کیا جاتا تھا عموماً قدیم کم بہترین تعلیم جو انگلستان میں

اس وقت دی جاتی تھی حاصل کرنے کے بعد ہیلی بری کالج میں چار مہینات پورے کرنے پڑتے تھے۔ یہ کالج سولہ سالہ میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ ملازمان دیوانی کو ان امور کی تعلیم دی جائے جو ان کے لیے ہندوستان کی ملازمت سرکاری کے دوران میں بہت مفید ثابت ہو سکیں۔ شخص مذکور کو مجلس نظام کے سامنے ہیلی بری کالج کے صدر کا ایک صداقت نامہ اس مضمون کا پیش کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ مقررہ مہینہ تک کالج میں شریک رہا اور اس نے وہاں کے قواعد و ضوابط کی پوری طرح پابندی کی۔ اس کی عمر پندرہ سال سے کم اور بائیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ نوجوان ملازم دیوانی کو ہندوستان پہنچتے ہی پہلے ہندوستانی زبانوں میں امتحان دینے کی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ اس غرض کے لیے کلکتہ اور مدراس کے کسی کالج میں اور کمپنی میں ہندوستانی استادوں سے وہ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ انگلستان اور ہندوستان میں ملازمان کمپنی کی ترتیب کے اس طریقے پر مختلف وجوہ کی بنا پر سخت اعتراضات ہوئے۔ کمپنی کے ہیلی بری کالج کی مخصوص نوعیت اور اس کی محدود تربیت پر مدراس کی ملازمت دیوانی کے کے مسٹر سیلیوان نے پُر زور بحث کی ہے۔

ترتیب ملازمان دیوانی
پہلا مقام ہیلی بری

ایک ہی عمر کے ایسے نوجوانوں کی ایک تعداد کا جمع کرنا جو ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی کالج میں رکھے جائیں میرے نزدیک موجودہ

نظام تعلیم کا ہمیشہ ایک بڑا بھاری نقص ثابت ہوا ہے۔ وہ نوجوانوں کو ایسے افراد سے کام و افضیت حاصل کرنے کے مواقع سے محروم کر دیتا ہے جو آئندہ اس ملک کے منظر عام پر نمایاں ہونے والے ہوتے ہیں۔ جو اشخاص اوایل عمر

*Source.—Evidence of Mr. John Sullivan, of the Madras Civil Service, before the Select Committee. Dated February 21, 1882.

ہیں ہندوستان چلے جاتے ہیں ان کی محبت کو انگلستان کے انشخاص و
 ایشیا کی طرف متوجہ رکھنا میرے خیال میں ہمیشہ ان کی تعلیم کا اہم مقصد
 ہونا چاہیے۔ کسی قومی جامعہ سے تعلق رکھنا بجائے خود ایک اعزاز سمجھا جاتا
 ہے اور ان اعزازات و انعامات میں جو ایسے ادارات سے حاصل ہوتے
 ہیں حصہ لینا بھی ایک ایسا امتیاز ہے جس کی ہمیشہ بڑی وقعت کی جاتی ہے۔
 ہتلی بری کے علمی اعزازات میری دانشت میں سمجھ زیادہ با وقعت نہیں
 سمجھے جاتے ہیں۔ جو نوجوان افراد اسکول سے اس کالج میں جاتے ہیں وہ
 وہاں کے قواعد کی بنا پر اس سوسائٹی کے سوا جو انہیں کالج کی چار دیواری
 میں میسر آتی ہے دوسری ساری سوسائٹی سے محروم کر دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ
 ہندوستان کو ان کی روانگی کا وقت آجاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ
 ہندوستان میں تقریباً اجنبی ہوتے ہیں اور ہندوستان پہنچ کر بھی وہ صرف
 انہیں انشخاص سے میل جول رکھتے ہیں جو ہتلی بری میں ان کے ہم درجہ
 مختلف قومی جامعات کے تعلیم یافتہ نوجوان اب مفید تر حالات
 کے تحت پہلی مرتبہ ہندوستان میں جمع ہوں گے۔ ان میں خیال است
 کا زیادہ تنوع ہوگا، مسابقت کا زیادہ شوق ہوگا اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ
 اسراف اور بد اطوار ہی پر زیادہ موثر قیود عاید ہوں گی کیونکہ باقاعدہ جامعات
 کی حیثیت کے لحاظ سے ان کی تادیب ہتلی بری کی بہ نسبت زیادہ مکمل ہوتی
 ہے اور ہمیشہ اسی طرح ہونی بھی چاہیے۔ آگسٹورڈ اور کیمبرج کے نوجوان
 انڈرگریجویٹوں کا اپنے اعلیٰ تر درجے کے افراد سے نیز ان مختلف جامعوں
 سے میل جول جن سے ان کی انجمنیں تشکیل پاتی ہیں کم تر درجے والوں کے
 دماغوں پر لازماً مفید اثر پیدا کرتا ہے۔ ہتلی بری میں سب نوعمر ہوتے ہیں
 اور ان میں سے اکثر تو جدید انڈرگریجویٹوں سے بھی کم عمر ہیں۔ نوعمروں کے اس
 اجتماع کا نتیجہ شرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ امرام طود پر تقریباً
 مسلم معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی کسی سرکاری تعلیم گاہ کی تادیب میں ایسا
 تساہل جیسا ایسٹ انڈیا کالج میں موجود ہے نہیں برتنا جاتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ذہن میں ہندوستان اور دولت کے مابین ایک فطری تعلق کا تصور ہے۔ یہ خیال فطرت ہی میں نشوونما پاتا ہے۔ نتیجتاً وہاں امرات کی عادتیں پیدا کر لی جاتی ہیں جن میں نوجوان اشخاص اپنی ساری ملازمت ہند میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح خود ان کا نیز حکومت کا جس کے وہ ملازم ہوتے ہیں نقصان ہوتا ہے۔

لیکن مجلس منتخبہ نے اس امر پر زور دیا کہ کالج کے قیام کے وقت سے ساتھی کی بہ نسبت دیوانی ملازموں کی تعلیم بہتر ہوتی رہی ہے اور اس حقیقت سے کہ ہندوستان کے اہم تر عہدوں پر وہ افراد فائز ہوتے رہے جو سیلی بری میں بہت ممتاز تھے اس استدلال کی اہمیت بڑھ گئی کہ کالج کی تربیت کا زمانہ ایک نمایاں قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے نافذ شدہ قانون کی دفعات کے مطابق کالج اجزوری ۱۸۵۷ء تک برخاست نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں ملازمان کمپنی کی تربیت کا جو طریقہ تھا اسے بہت سخت الفاظ میں ناقص گردانا گیا۔ مجلس منتخبہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ فورٹ ولیم کالج دیوانی ملازمت کی واقفیت کو بڑھانے کی بہ نسبت قرض کو زیادہ بڑھاتا رہا ہے، اور وہ کسی طرح اس کے جاری رکھنے کی روادار نہ تھی۔ یہ امر کہ کالج مشرف نیز غیر موثر تھا ذیل کی رایوں سے واضح ہوتا ہے جو لارڈ ولیم بنتینک اور سر چارلس میکاف نے ظاہر کی ہیں۔

*ہندوستان میں ملازمان
دیوانی کی تربیت

میں اب کونسل سے اس کاغذ کی طرف متوجہ ہونے کی استدعا کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ تین سال کے دوران

میں ہر محترم کی تعلیم کا اوسط خرچ ۶۶۲۱ روپیے یا ۶۶۰ پونڈ سالانہ رہا ہے اور اس میں چار ہزار روپیوں یا چار سو پونڈوں کے اس مزید خرچ کو بھی شامل کرنا چاہیے (جیسے اب نہایت بجا طور پر موقوف کر دیا گیا ہے) جو ہر محترم کو ضروریات

سفر وغیرہ کے لیے ملتا تھا اور جو ماہانہ پانچ سو روپیوں سے اوپر کی افروں پر قلم
مجتہ کی تنہائی کے ذریعے واجب الادا تھا۔ یہ قرض بلا سود تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا
چاہیے کہ ہندوستانی تعلیم سے متعلق چھ سو ساٹھ پونڈ کا یہ بار اسی عنوان کے
تحت انگلستان میں بھی کچھ کم مصارف کا باعث نہیں ہوتا جو رقم اوپر ظاہر کی گئی
ہے وہ ایک سال کے لیے ابھی کچھ معمولی نہیں ہے اگر اس کا مقابلہ دیگر مضافات
کی تعلیم کے مصارف سے کیا جائے، لیکن جب محض کالی کی وجہ سے سرکاری
مالیہ پر اس کا بار ایک غیر معین مدت کے لیے ہو حالانکہ کالج کے قواعد کی رو سے
دو زبانوں کے سیکھنے کی کافی مدت آٹھ ماہ مقرر ہے تو اس بد عنوانی کو عام طور
پر ناقابل برداشت قرار دینا چاہیے۔ یہ بہ مشکل یقین کیا جا سکا کہ جن نوجوانوں کو
خرج دیا جاتا تھا اور جو بہت کابل تھے انہیں سابق میں یہ اجازت ملتی رہی کہ
وہ کالج میں چار، پانچ، چھ اور سات سال تک ملک پر بھاری بوجھ عاید کرنے
کے باوجود لمبا وقت اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے مقیم رہیں۔ یہ مدت بعد کو
کم کر دی گئی لیکن اب بھی ایسے بہت سے افراد ہیں جو کالج میں ایک ایک
دو دو سال رہے اور کسی زبان میں کامیاب نہ ہوئے۔

* کالج (واقع کلکتہ) کو برخاست کرنے کی رائے کا اظہار اس بنا پر کرتے
ہوئے کہ وہ اسراف کے لحاظ سے جس کی وہ ترغیب دیتا ہے نیز قرض و

۱۔ پہلی بری کالج کے خرچ کا حال مسٹر میٹر آرچر کی شہادت میں جولائی ۱۸۷۳ء میں مجلس فقہیہ کے روبرو
پیش ہوئی تھی حسب ذیل مندرج ہے۔

پہلی بری کے ادارے کے قیام سے متعلق جملہ مصارف بشمول حسابات تعمیر و ترمیم ۱۸۷۳ء سے
۱۸۷۳ء تک یعنی پچیس سال میں ۳۶۳۴ پونڈ ۷ شلنگ ۴ پیس ہوئے۔ حسابات تعمیر و ترمیم کیلئے
نومصروف مذکور ۲۶۰۱ پونڈ ۴ شلنگ ۱۰ پیس ہوئے ہیں۔ جو شخص خاص محدود مقرر ہوئے ان کی تعداد ۴۴۴ ہے
اور ہر ماہر شخص پر بشمول حسابات تعمیر ۳۶۹ پونڈ ۱۲ شلنگ صرف ہوئے۔ حسابات تعمیر کو خارج کرنے پر
ہر مہر کی تعلیم کا خرچ ۲۸۴ پونڈ ۲ شلنگ ۲ پیس ہوتا ہے۔

پریشانی کے انجام کے نظر کرتے جو اس کے باعث ساری ملازمت دیوانی میں ظاہر ہوتا ہے، ہزار رساں اور غیر ضروری ہے اور اس لیے وہ اس تعلیمی غرض کے لیے بے سود ہے جس کی تکمیل کے اوجہ کے ساتھ وہ قائم کیا گیا مگر نتیجتاً اس سے سرکاری مصارف پر بجا بار عاید ہو گیا مجھے یہ بیان کرنا لازم ہے کہ بطور مثالی نوجوان ملازمت دیوانی کے ہندوستان پہنچنے پر ان کے استقبال و انتظام کے متعلق مفید طور پر میں کس قسم کا بندوبست تجویز کرنا چاہتا ہوں۔

ان نوجوانوں کے ہندوستان پہنچتے ہی ان کا ایک امتحان لیا جانا چاہیے اور جو یورپ میں یا اثنائے سفر ہندوستان میں اپنے حاصل کردہ علم کی بدولت سرکاری ملازمت میں داخل کیے جانے کے قابل قرار پائیں انہیں فوراً کسی خدمت پر اس کے پورے بھرتے کے ساتھ مامور کر دیا جائے اور بقایا وقت ڈاک گاڑی یا اور کسی سواری کے ذریعے ان کے متعلق مستقر پر روانہ کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے سرکاری فرائض کا دور شروع کر دیں۔ جو نوجوان ناقابل قرار پائیں ان کو بھی کلکتہ سے باہر اندرون ملک کسی چر امن مقام پر بھیج دیا جائے تاکہ وہ ایسے پسندیدہ کردار والے سرکاری عہدہ داروں کے احکام کے تحت پابند رہیں جو اپنے ماتحت نوجوانوں کو تعلیم اور مشورہ دینے میں مسرت حاصل کر سکیں اور ان کے تفویض ایسا کام کر سکیں جو انہیں بہت جلد سرکاری خدمت کے قابل بنا دے اور اس اثنا میں انہیں بالکل ناکارہ ثابت نہ ہولتے وے۔ اس مدت نگہبانی کے دوران میں انہیں صرف اس قدر بھرتہ دیا جائے جو ان کے گزارے کے لیے کافی اور سرکاری عہدہ داروں کے بھرتے سے کم ہو اور جب قابل منتخوب کی یہ رائے ظاہر ہو کہ وہ سرکاری ملازمت کے اہل ہو گئے ہیں تو انہیں پورے بھرتے کے ساتھ جو مامور ملازمین کو دیا جاتا ہے خدمتوں پر مامور کر دیا جائے اور مدت ملازمت جو ان کے درجے مقام یا آمدنی کی تدبیر کی ترقی کا اشتقاق پیدا کرتی ہو ہمیشہ ان کے زمانہ اہلیت کی تاریخ کے شمار کی جائے۔

اس سے زیادہ عام تنقید مذکور بالا انتظام پر لارڈ ولیم بنٹنک نے کی تھی جس نے ملازمان چینی کی مخصوص صورت کا نیز موجودہ انتظام معاملات کو بہ اطمینان

نتہا مملو نظر رکھنے کے میلان کا ذکر کیا تھا۔

ملازمت دیوانی | **دسیول سروس کی خوبی**

جہاں میری رائے ہے کہ ملازمت دیوانی سے بہتر اور کوئی نظام ملازمت قائم کرنا مشکل ہے اور جہاں میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ جمہوریت جماعت اس کی قوت اور اس کے اعزاز و انعام کی یقینی توقع کو مستحکم رکھا جانا چاہیے وہاں میں چند نقائص کا حوالہ دیتے بغیر نہیں رہ سکتا جو تمام مصلوحتوں انتظامات کی طرح اس میں بھی ہیں۔ ہر انتظام میں موجودہ صورت معاملات کو بر نظر اطمینان دیکھنے کا نیز ایک ہی طبقے کے ارکان کی غلطیوں کی جانب متوجہ رہنے کا عام رجحان پایا جائیگا اور اس محنت کا فقدان بھی پایا جائیگا جو صرف مقابلے اور مسابقت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ علاوہ بریں ملازمت دیوانی کے لیے بہت کم عمر اشخاص کے طریق انتخاب میں ایک ایسا سبب موجود ہے جو ایک یورپی انتظام کے ان فوائد کو کم کر دیتا ہے جو بصورت دیگر بہتر طور پر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ نوجوان اشخاص اس قدر کم عمری میں باہر جاتے ہیں کہ وہ کاروبار حکومت یا علم کے کسی شعبے میں کوئی عملی تجربہ حاصل کرنے ہی نہیں پاتے اور اسی لیے نوواردوں کی حیثیت سے یورپ کی ہندو دنیا کی تازہ ترین ترقیاں اپنے ساتھ لاکر موجودہ خرابیوں میں اضافہ کرنے کی بجائے وہ خود قدامت پسند بن جاتے ہیں اور گزشتہ دور کے احساسات و آراء کے شکار ہو جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ طویل ریخت کو ایک لازمی شے قرار دینا عمدہ طریق عمل ہو گا لیکن صرف یہ طریق صورت مذکور کی اصلاح کے لیے کافی نہ ہو گا۔ ایک ایسے احساس اور شعور کے کو داخل کرنے کے لیے جو ملازمت دیوانی سے بالکل غیر متعلق ہو نیز اس میں ایسے یورپی تجربے کے فائدے کو نشاں کرنے کے لیے جو سچے فہم اور سلمہ قابلیت و طبعیت پر مشتمل ہو میری رائے میں یہ بہت مفید ہو گا کہ انتظام عدالت و کو توالی کی ترقی اور بہتر نگرانی کی غرض سے صدر عدالتوں کے ججوں کے ساتھ ملک مشرق کے مقرر کردہ ایک یا زیادہ جج شریک کر دیے جائیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان مختلف ججوں کا عمل اس حد تک نہ ہوئے پائے کہ ملازمت مذکور کے انتظام

*Source.—Minute of Lord William Bentinck. Dated November 10,

اور اس کی جایز و مناسب توقعات میں خلل پڑ جائے۔

* * * * *
 ہمارے طریق نظم و نسق کے متعلق میری ساری تحقیقات سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا اصل نقص ہر قسم کی سرکاری اطاعت کے فقدان، تمام مدارج سے درمیان موجود مساوات اور ہر سرکاری عہدہ دار کی شخصیت میں (اگر میں ایسا کہہ سکوں) پایا جاتا ہے۔ جس تجویز میں معزز مجلس سے نہایت زور کے ساتھ اصرار کر دینا وہ یہ ہے کہ وہ اس نظام کو مستقل طور پر جاری رکھیں جس کی سفارش مدت گزری حکومت مدراس نے سرگھاس مزو کی سند پر اس سے کی تھی یعنی یہ کہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدوں کو ضم کر دیا جائے، ایک ہی ضلع کے مامور عہدہ داروں کے مابین جو آزادی ایک کو دوسرے کے مقابلے میں حاصل ہے وہ اٹھا دی جائے اور کلکٹر کے دفتر کو ایک بڑا دفتر بنا دیا جائے جو ایسے ڈپٹی کلکٹروں، جوائنٹ مجسٹریٹوں اور مدگاروں پر مشتمل ہو جو ایک ہی اعلیٰ عہدہ دار کے تحت ہوں اور ایک ہی نظام پر عمل کریں۔ تب عوام، اُن قبائح سے جو نظم و نسق میں مسلسل خلل واقع ہونے کے باعث پیدا ہوتی ہیں محفوظ رہیں گے اور کامل اجنبیوں کے اُن متواتر تقررات سے جو ضلع کی تمام خدمات پر عمل میں آتے ہیں متاثر نہ ہوں گے نیز وہ اُن ناجایز فوائد سے جو واقعی تطل حکومت کے زمانے میں بددیانت عملے کے لیے ہمسایہ ہو جاتے ہیں احتراز کریں گے۔ اس انتظام سے حکومت کو یہ موقع بھی ہاتھ آتا ہے کہ کسی اعلیٰ عہدہ دار کی نااہلی کے باعث جو بے قاعدگی پیدا ہوتی ہے اسے رفع کرنے کی غرض سے اس کی امداد کے لیے بہتر قابلیت کے مددگاروں کو مقرر کرے اور ایک بڑے قابل عہدہ دار کے زیر تربیت کابل اور کمزور اشخاص کو مامور کرے۔ اسی قسم کی درس گاہ میں نوجوانوں کی بہتر تربیت ہو سکتی ہے۔ اصول قانون کی کامل ہمارکت یا ایسی اعلیٰ درجے کی قابلیت جو انگلستان کے وکیلوں اور ججوں کو ممتاز بناتی ہے یہاں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے اور خواہ وہ کتنی ہی پسندیدہ ہو یہاں اس کے بغیر کام چل سکتا ہے، لیکن ضروری چیز یہ ہے کہ نوجوان یا بوڑھے جن کے ذمے تصفیہ مقدمات کا کام ہے خواہ وہ وکٹس یا ایک ہزار روپیوں

کی مالیت کے ہوں اور جنہیں جرمانہ، قید اور جسمانی سزا کا حکم دینے کے اختیارات حاصل ہیں سب پر لازم ہے کہ اپنی مدت کارگزاری کی تکمیل کریں، ملک کی رسوم اور کاروبار سے واقف ہوں اور اپنے قدیم الخدمت عہدہ داروں کے عمل اور وسیع تر تجربے کی بنا پر اپنی رائیں قائم کریں۔

کئی سال سے نظام کے طریق نامزدگی کو بڑا سمجھا جا رہا ہے۔ ۱۸۳۲ء کی مجلس منتخب نے یہ رائے ظاہر کی کہ ”مخصوص نظام کی جانب سے نامزدگی کا عمل میں آنا لازماً دیوانی کی قابلیت و اہلیت کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کا بہترین طریقہ نہیں ہے“ اور یہ کہ طریق مقابلہ ”ہم توجہ کا مستحق ہے“ میکالے نے ۱۸۳۳ء کے قانون میں ایسے ”فقیرے“ شامل کر دیے تھے جن سے ملازمان دیوانی کا طریق تقرر مبنی بر مقابلہ ہو گیا، لیکن میکالے، نظام کے اثر پر جنہوں نے رشک و احتیاط کے ساتھ اپنی سرپرستی کو محفوظ رکھا غالب نہ آ سکا۔ بہر حال ۱۸۳۵ء میں سرچارلس ووڈ نے ایسا طریق مقابلہ نافذ کرنے کا تصفیہ کیا جس کی تائید میکالے نے فصاحت و بلاغت کے ساتھ کی میکالے کی نظر میں دو مقصد تھے۔ اول یہ کہ ملازمت دیوانی کو رشتہ داروں کی سبب خاطر داری اور بد عنوانی سے سبایا جائے اور اس کا اطمینان ملازمت کو محدود کرنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ دوم یہ کہ ملازمت میں بہترین اشخاص جو دستیاب ہو سکیں داخل کیے جائیں اور یہ مقصد امتحان مقابلہ کے ذریعے بہترین طور پر حاصل ہو سکتا تھا۔

*ہند کی ملازمت دیوانی رسیول کے لیے طریق مقابلہ

یہ تجویز چرب زبانی پر مبنی ہے کہ آپ گورنر جنرل کو اس امر کی اجازت دیں کہ وہ لائق اشخاص کو جہاں کہیں بھی وہ مل سکیں

*Source.—(i) Speech and Memorandum, Lord Macaulay. Reproduced in "Life and Letters of Lord Macaulay." Sir G. O. Trevelyan. (Longmans Green and Co.)

۱۔ سرچارلس ووڈ کے پیش کردہ مسودہ قانون ہند کی خواہش دوم سے متعلق لارڈ میکالے کی تقریر۔

حاصل کرے۔ مہر می مستحکم رائے یہ ہے کہ اُس روز سے جب کہ ہند کی لازمیت دیوانی ایک احمق و ملازمت نہ رہیگی دلالی کے دور کا آغاز ہوگا جو نہایت ہیبت ناک اور وسیع الاثر ہوگا اور اس دور میں سرپرستی کی بدعنوانیاں ایسے خطرناک طریقے پر پھیل جائیں گی جو کبھی ہم نے نہ دیکھا ہو۔ ہر گورنر جنرل اپنے ہمراہ جھجھجوں، بھانجوں، عم زاد بھائیوں، دوستوں، دوستوں کے بیٹوں اور سیاسی لوگوں کو لے کر روانہ ہوا کریگا یا ان سب کی روانگی متناقب جلد عمل میں آئیگی اور ہر اُس جہاز میں جو بحیرہ احمر سے ہندوستان پہنچے گی کوئی ایسا متیلا ضرور ہوگا جس کے ساتھ انگلستان کے ذمی اثر اشخاص کی سفارشیوں ہوگی۔ یہ گورنر جنرل کے اختیار میں ہوگا کہ وہ رزڈنٹ کے عہدے کو نسل بورڈ کی رکنیت، مجلس مالگزار کی نشستیں جن کی تنخواہ چار ہزار پونڈ سے چھ ہزار پونڈ سالانہ تک ہوگی ایسے اشخاص میں تقسیم کر دے جو ہندوستانیوں کی خصوصیات و عادات سے سطلق واقف نہ ہوں اور ان کی زبان صرف اس قدر جانتے ہوں جس سے وہ زرد و شراب کی ایک مزید لوٹل منگاسکیں یا اپنے ملازم سے نکھار زیادہ تیزی کے ساتھ جھمکنے کی خواہش کر سکیں۔ آپ مذکور بالا طریق عمل پر کس طرح قیود ماید کر سکیں گے؟ کیا آپ ارکان دارالعوام ان پر قابو پاسکتے؟ کیا آپ خود اپنے گھر میں رشتہ داروں کی بیجا خاطر داریوں کو مٹانے اور دہانت ہال اور سومر سٹاپاؤس کی بدعنوانیوں کو دفع کرنے میں اس قدر کامیاب ہو سکتے ہیں کہ آپ یہ خیال کریں کہ آپ ایسے ممالک میں خوش اسلوبی قائم کر سکتے جن کا صحیح محل وقوع آپ نہیں جانتے اور جن کے نام کا صحیح تلفظ بھی آپ ادا نہیں کر سکتے؟ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے متعلق مذکور بالا انتظام سے خوش اسلوبی پیدا ہونے کی بجائے خود ہندوستان پر بدنامی کا دھبہ لگے گا اور پھر کچھ مدت تک بعد ہی جب دارالعوام کے کسی مستعد رکن کا کوئی بیٹا یا جانی اپنے ساتھ وزیر اعظم کا ایک سفارشی رقعہ گورنر جنرل کے نام لے کر کلکتہ کی راہ لے گا تو اس رقعے کی حقیقت درحقیقت ایک ہنڈی کی سی ہوگی جو محاصل ہند کے متعلق

اس رقم کے لیے جاری کی گئی ہو جسے دارالعوام کی پارلیمنٹ ہائید سے حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں ہم نا سنجیدہ کار نہیں ہیں۔ ہمیں صرف اس شرمناک اور افسوس ناک زمانے پر نظر ڈالنی ہوگی جو بنگال میں پہلی مرتبہ ہماری قوت قایم ہونے کے بعد پیش آیا۔ اگر آپ اس زمانے کے کسی شاعر مذمت گو یا مضمون نگار کی تحریروں کو مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ مذکور بالا طریق تفرقہ کا اثر کس طرح مرتب ہوا تھا۔ کلکتہ میں یہ روایت مشہور تھی کہ لارڈ کلائیو کی حکومت کے دوسرے دور میں ایک شخص کسی وزیر کا پُر زور سفارشی رقعہ لے کر پہنچا۔ لارڈ کلائیو نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا ”کہو مجھے تم کتنی رقم چاہتے ہو؟“ اس شخص نے جسے ایسے سادہ انداز میں مخاطب کیے جانے کا اتفاق پیش نہ آیا تھا جواب دیا کہ وہ کسی ایسے عہدے کا امیدوار ہے جس میں اس کی خدمات بکار آد ہو سکیں۔ لارڈ کلائیو نے کہا ”مجھے ایسے یہ تو کوئی جواب نہیں۔ تم کتنی رقم چاہتے ہو؟“ کہا ایک لاکھ نوٹ کا کافی ہوئے؟“ شخص مذکور نے جواب دیا کہ وہ بہت خوش ہو گا اگر وہ محنت طلب خدمت کے ذریعے اس قدر رقم حاصل کر سکے۔ لارڈ کلائیو نے فوراً مذکورہ رقم کے لیے ایک حکم تحریر کیا اور درخواست گزار کو اسی جہاز سے جس میں وہ آیا تھا ہندوستان چھوڑنے کی تاکید کی اور یہ بھی کہا کہ جب واپس پہنچ جائے تو ہمیشہ انگلستان میں رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ بہت قریں قیاس ہے نیز میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کو لارڈ کلائیو کے اس طریق عمل کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اس نے اگرچہ بنگال کی رعایا کو اس خوش قسمت منجیلے کو مال دار بنانے کے لیے لوٹا لیکن اس شخص کو اگر کوئی خدمت دے دی جاتی تو رعایا نہ صرف لوٹی جاتی بلکہ اسے بد انتظامی بھی برداشت کرنی پڑتی۔ اس قسم کی خرابیوں کا ایک علاج اور مجھے یقین دہانی ہے صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ملازمت دیوانی کو مختص و محدود کر دیا جائے۔

*

*

*

*

*

اگر میں ان آرا کو سمجھ سکاموں جو معزز لارڈ (لارڈ ایلن برو) سے منسوب کی جاتی ہیں تو لارڈ موصوف کا یہ خیال ہے کہ کسی نوجوان کا ایسے امور میں قابل ہونا جو دوسری و اخلاقی تعلیم میں شامل ہیں نہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں نامور و نڈ حاصل کر سکیگا بلکہ اس سے لازماً یہ قیاس پیدا ہوتا ہے کہ اس پر وہ اشخاص غالب آجائینگے جنہیں ابتدائی مراحل میں اس نے ایجاد کھایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ معزز لارڈ کی یہ رائے ہے کہ جو نوجوان امور مذکور میں امتیاز حاصل کرتے ہیں وہ ممکن ہے آگے چل کر ایسے سست اور کامل ثابت ہوں کہ کسی جدوجہد کی زندگی کے قطعاً ناقابل ہو جائیں۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ معزز لارڈ نے یہ نہیں کہا کہ دوسری و اخلاقی تعلیم کی بجائے مسکام کی اور کرکٹ کو معیار قابلیت قرار دینا بہتر ہوگا۔ میرے خیال میں کسی واقعے کا ثبوت اس قدر کثیر شہادت یا مستقل تجربے سے نہ مل سکیگا جس قدر اس واقعے کا کہ جو اشخاص اپنی نوعمری میں اپنے ہم عصروں کے درمیان ممتاز ثابت ہوتے ہیں وہ تقریباً ہمیشہ آخر و نم تک اس امتیاز کو قائم رکھتے ہیں جو انھوں نے حاصل کیا۔ ہے۔ کسی کتاب خانے سے کیمبرج کا سال نامہ اٹھائیے۔ اس میں آپ کو اعزاز کے میاں کا میابی حاصل کرنے والوں کی صد سالہ فہرست مل جائیگی۔ رینگلروں اور جوئیر آئیمیوں کی فہرست پر نظر ڈالیے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرونگا کہ جوئیر آئیمیوں میں سے ہر اس شخص کے مقابلے میں جس نے آئندہ زندگی میں امتیاز حاصل کیا ہو آپ میں ممتاز رینگلر پائینگے۔ کیا ہماری تاریخ ایسی مثالوں سے بھرئی ہوئی نہیں ہے جو اس واقعے کو ثابت کرتی ہیں؟ مذہبی خدمت یا قانونی پیشے کو بھیجئے۔ پارلیمنٹ کو اس وقت سے دیکھیے جب سے اس ملک میں پارلیمنٹی حکومت کی ابتدا ہوئی یعنی مائیکلو آڈریٹ کا

۱۔ میکالے یہاں سرچارلس ووڈ کی اس تجویز پر بحث کر رہا ہے کہ ہند کی ملازمت دیوانی کا دوسرا امتحان مقابلے کے ذریعے منضبط کیا جانا چاہیے۔

۲۔ رینگلروہ شخص ہے جس نے کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان ریاضی میں اعزاز کے ساتھ چہرہ اول کامیابی حاصل کی ہو۔

۳۔ آئیمی وہ شخص ہے جس نے کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان ریاضی میں بدرجہ دوم یا سوم کامیابی حاصل کی۔

کے زمانے سے کیننگ اور پیل کے زمانے تک۔ ہندوستان میں ملاحظہ فرمائیے۔ ایک قابل ترین شخص جس نے کسی زمانے میں ہندوستان پر حکومت کی دارن میں سینئر تھا اور کیا وہ ویسٹ منسٹر کے اعلیٰ افراد سے نہ تھا؟ ایک قابل ترین لازم دیوانی جسے میں نے ہندوستان میں دیکھا سر چارلس مٹکاف تھا اور کیا وہ این کی درسگاہ میں ممتاز درجہ نہ رکھتا تھا؟ اشرافیہ کا سب سے زیادہ مشہور رکن جس نے ہندوستان پر حکومت کی لارڈ ویلزلی تھا، این میں اس کی شہرت کا کیا پایہ تھا؟ آگسٹورڈ میں اسے کیسی شہرت حاصل تھی؟ مجھے ایک اور معزز و ممتاز گورنر جنرل کا نام بھی لینا چاہیے جس کا ذکر کیسے بغیر میں نہیں رہ سکتا چند روز قبل جب کہ وہ تقریر جس کا میں نے حوالہ دیا ہے میرے ذہن میں تازہ تھی میں نے میوزے کیمبرجینرے میں سترہ سال کے ایک نوجوان شاعر کی ایک نہایت فصیح و اظہر نظم جس کی بنا پر کیمبرج یونیورسٹی نے اسے طلائی منجھ عطا کیا تھا پڑھی تھی اور میں نے دردامیر مسرت کے ساتھ اس نظم کے اختتام پر سینٹ جان کالج کے آئریبل ایڈورڈ لاکنام بھی پڑھا تھا۔ اسی وقت مجھے یہ خوشگوار خیال آیا تھا کہ لارڈ این بروک کا نام بھی ان اشخاص کی طویل فہرست میں داخل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی نوعمری میں علی کامیابیوں کے ذریعے ان اہم فرائض کے متعلق نیک شگون پیش کیا تھا جو انہیں آئندہ سرکاری زندگی میں انجام دینے تھے۔ یہ کہنا کوئی جواب نہ ہوگا کہ آپ دو تین ایسے مقتدر اشخاص بتا سکتے ہیں (جب کہ یہ بات پسندیدہ ہو کہ آپ انہیں بتا سکیں) جنہوں نے اپنی نوعمری کا بی کے باعث ناسف اور انتہائی مذمت کی حالت میں بسر کی، لیکن بعد کو اپنی محنت و مشقت سے تلافی یافتہ کر دی۔ اس قسم کی منتشی صورتیں ضرور قابل توجہ ہیں کیونکہ ان کا نشانہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشخاص کی بہت افزائی ہو جو اپنی نوعمری کو عیاشی یا بدعنوانی میں برباد کرنے کے بعد مایوس ہو کر اپنی آئندہ عمر بھی اسی طرح گزارنے پر مایل ہوتے ہیں۔ لیکن بے شبہ عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی درس گاہوں کے مقابلوں میں اول رہے تھے دنیا کے مقابلوں میں بھی اول رہے ہیں۔

(میکاتے نے اس کے بعد یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کے مخالفین کو خود اپنے استدلال پر اطمینان نہ تھا۔)

معرز لارڈ کی رائے یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم و فنون کی تحصیل کی ترغیب دینا گویا ہندوستان میں ہماری حکومت کی بربادی کی تیاری کرنا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ جس تعلیم کی وہ مذمت کرتا ہے جب وہ یورپ کو دی جاتی ہے اسی تعلیم سے جب وہ ہندوستانیوں کو دی جائے وہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم ایک یورپی کو کرم کتاب، بیہودہ گو اور ایک ایسا شخص بنا دیتی ہے جو زندگی کے اہم فرائض کی انجام دہی کے ناقابل ہو جاتا ہے، لیکن یہی تعلیم اگر ایک ہندو کو دی جائے تو وہ اسے ایک ایسی ذہنی قوت سے مسلح کر دیتی ہے کہ ایک مستحکم حکومت اپنی دو لاکھ سپاہیوں ہزار نفوس کی فوج کے ساتھ اور انگلستان کی تمام بری و بحری قوت کی اعانت کے باوجود اس ذہنی قوت کا قطعاً مقابلہ نہیں کر سکتی۔

زقانون کے منظور ہونے کے بعد میکالے ایک مجلس کا صدر بنایا گیا جو برقی مقابلہ کے نفاذ سے متعلق ضروری انتظامات کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی)۔
 * ہماری خواہش کے خلاف اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ وسیع مگر سطحی علم کے لیے انعامات مقرر کیے جائیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ کسی امیدوار کی حوصلہ افزائی ایک ایسا مضمون لینے کے متعلق قطعاً نہ ہونی چاہیے جس میں وہ سرسری معلومات رکھتا ہو کسی ایک زبان کی عمیق و صحیح واقفیت، چھ زبانوں کے بُرے تراجم یا مضامین کی بہ نسبت زیادہ قابل قدر ہونی چاہیے۔ صرف ایک پرچہ جواب جس سے معلوم ہو کہ لکھنے والا تفرقی احصاء کے اصول سے کماحقہ واقف ہے ان

۱۔ اس مجلس کے دیگر ارکان لارڈ ایشبرٹن، مسٹر ہنری ہول، صدر کلید، ہیلی بری، مسٹر جو میٹلس اور سر جان شالیفیور تھے۔

*Source.—(ii) Report of the Civil Service Committee. Reproduced in "Life and Letters of Lord Macaulay." Sir G. O. Trevelyan.
 (Longmans, Green & Co.)

بیش سلی و غیر صحیح جوابات کے بالمقابل زیادہ قابل قدر ہونا چاہیے جو کہ کیا، نباشناست، معدنیات، ابعاد طبیعیات، منطق اور تاریخ انگلستان کے سوالات سے متعلق ہوں۔

* * * * *
ہمارے خیال میں مضامین امتحان پر نشانات کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ مملکت کا کوئی حصہ یا درس گاہ ہوں کا کوئی خاص گروہ بلا شرکت غیرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ملازمین ہیما نہ کرے۔ مثلاً انگلستان کے بڑے علمی اداروں کے حق میں سخت نا انصافی ہوگی اگر نتیجہ متقابل کے تعصبات میں یونانی یا لاطینی میں نظم لکھنے کی مہارت کا کافی لحاظ نہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی اور لاطینی میں نظم لکھنے کی مہارت کسی شخص کو حاکم عدالت، حاکم مالہ یا ماہر سیاست بنانے میں بلا واسطہ کوئی دخل نہیں رکھتی، لیکن جو نوجوان ایک کام کو جسے اس کے ساتھ ہی نہایت قابل اور بندہ بہت نوجوان بخوبی انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں بہترین طور پر انجام دیتا ہے وہ عموماً ایک اعلیٰ درجے کا آدمی ثابت ہوگا اور نہ ہمیں اس بارے میں شبہ ہو سکتا ہے کہ حصول کمال جس سے ابتداء فاکس، کیننگ، گرینول، وائٹلی، ہینسفیلڈ اور ٹرنٹون نے اپنے کو اپنے ساتھیوں میں ممتاز کیا تھا دل و دماغ کی ایسی قوتوں کا اظہار کرتا ہے جن کی مناسب تربیت و رہنمائی ہو تو وہ مملکت کے بہت کام آ سکتی ہیں۔ برخلاف اس کے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس جزیرے کے شمالی حصے میں قدیم السنہ میں نظم لکھنے کے فن کی بہت کم تربیت ہوتی ہے اور غالباً ڈیوگالڈاس، پورٹ، ہارز، جیفری اور میکینٹوش کے سے مشہور اشخاص لاطینی کی جس میں شاعر الکیس کی بحر کا رنگ پایا جاتا ہو عمدہ نقل کرنے یا شکسیر کی دس سطور کا ترجمہ یونانی بحر میں کرنے سے قاصر تھے۔ ہم امتحان کا ایک ایسا طریقہ دیکھنا چاہتے ہیں جو کمپنی کی ملازمت سے کسی میکینٹوش یا ٹرنٹون یا کسی کیننگ یا ہارز کو محروم نہ کرے۔

ہم یہ توقع اور یقین بھی کرتے ہیں کہ کسی کار آموز کو سخت بد اطواری یا ایسی بد اعمالی کے باعث جو ایک معزز شخص کے لیے نازیبا ہو ملازمت سے خارج کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ کار آموز اشخاص ایسے نوجوان ہوں گے جو اپنے ساتھیوں سے علوم و فنون میں بہتر ہوں گے اور ایسے نوجوانوں میں جو اپنے ساتھیوں سے علوم

فنون میں بہتر ہوں عموماً قابل ملامت بد اخلاقی نہیں پائی جاتی۔ شاید بیس سال میں ایک مرتبہ سبھی کسٹورڈیا کیمبرج سے کوئی ایسا طالب علم جس نے اعلیٰ اور بچے کا علمی امتیاز حاصل کیا ہو بدنامی کے ساتھ خارج نہیں ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی زمانے میں علوم و فنون میں فوقیت کا حصول علیٰ العموم چند ایسی صفات کا وجود ظاہر کرتا ہے جو برائی سے محفوظ رکھنے کی ضامن ہوتی ہیں مثلاً محنت، ایشا، ایسی مسرتوں کا شوق جو نفسانی نہ ہوں، اعزاز و امتیاز کی قابل تحسین خواہش اور اس سے بھی زیادہ قابل تحسین یہ خواہش کہ احباب و اقربا سے تعریف و توصیف حاصل کیا جائے۔ لہذا ہم یقین کرتے ہیں کہ دماغی قابلیت کا جو معیار تقایم کیا جائے والا ہے وہ عملی طور پر خاطر خواہ بہترین اخلاقی معیار بھی ثابت ہوگا۔

یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ لارڈ کارلوس اور اس کے بعد کے حکمرانوں نے ملازمت دیوانی میں جو اصلاحیں کیں ان سے انتظام حکومت میں بہت بڑی بے لوثی اور عہدگی پیدا ہو گئی اور دوسری طرف اس قسم کے طرز عمل کو اختیار کرنے سے کچھ مدت کے لیے ہندوستانیوں کو اعتماد و ذمہ داری کے عہدوں سے ہٹا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ کرنل کیمپی لکھتا ہے کہ ہمارے مسٹنگل نے تاجر کو محصلان مالگزاری بنایا تھا اور لارڈ کارلوس نے انہیں حکام عدالت بنا دیا۔ ہندوستان کے ویسی اشخاص اس طرح ان تمام عہدوں سے رفتہ رفتہ علیحدہ کر دیے گئے جن پر وہ مغل دور میں مامور ہوئے تھے، اور جیسی جیسی انگریز شرفاء کے اطوار میں چشیت حکام انتظامی اصلاح ہوتی گئی ہندو کے ویسیوں کی بے قدری زیادہ بڑھتی گئی۔

ہند کے سیاسی مسلک کے بنیادی اصول پر غور کرتے ہوئے اس زمانے کے انگریز حکمرانوں نے صریح طور پر اس امر کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے باشتندگان ملک کو بھی حکومت کے انتظامی کام میں شریک کرنا چاہیے۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفسٹن نے سب سے پہلے اس فرض کو جو حکمرانوں پر واجب تھا تسلیم کیا کہ ”تعلیم اور سرکاری اعتماد کے ذریعے ہندوستانیوں کو ان کے موجودہ حکمرانوں کے معیار پر لانا چاہیے“۔ جیسا کہ مسٹر فارسیٹ نے بتایا ہے وہ ہندوستانیوں کی ترقی و تعلیم کے منصوبوں کو اس وقت تک اہم نہیں سمجھتا جب تک ایک ہی طریقے پر ایسی

تجاویز اختیار نہ کی جائیں جن سے ان کو اعزاز اور عہدے سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ان کی اموری کے متعلق انٹرنیشنل نے لکھا تھا کہ ”یہ منسلب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو رفتہ رفتہ اعلیٰ عہدوں اور بڑی تنخواہوں پر اور پھر زیادہ قابل اعتماد خدمات پر مامور کیا جائے۔ مجھے کسی ہندوستانی کے رکن بورڈ ہو جانے میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی بلکہ میری تو یہ خواہش ہے کہ آزمائش کے طور پر ایک ہندوستانی جج کے تحت ایک ضلع دیا جائے اور دوسرا ایک ہندوستانی کلکٹر کے تحت۔ اگرچہ اس نے یہ رائے قائم کی تھی تاہم اسے کوئی عجلت نہ تھی۔ اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ بہت سخت نگرانی کی ضرورت تھی تاکہ انتظام حکومت میں ایسی بد اعمالیاں نہ پیدا ہو جائیں جن کا بعد کو رفع کرنا محال ہو جائے۔ اس معاملے میں لارڈ ولیم بنٹنک نے بھی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو مال اور عدالت کے محکموں کی اعلیٰ تر خدمات پر مامور کر کے علمی حصہ لیا۔ مگر تھامس سنز اور سر جان میلکم بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے جن کا اظہار انھوں نے حسب ذیل خطوط میں کیا ہے:۔

”مگر میری خدمت پر ہندوستانیوں کی ماموری

ایسا واقعہ ہے جس میں مجھے ”کچھ نہ کچھ دلچسپی“ لینی چاہیے کیونکہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکتا تھا جس میں اس سے زیادہ دلچسپی لے سکتا۔ میں اس واقعہ پر سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی وجوہ سے عمیق رنج و ملال کا اظہار کرتا ہوں۔ اگر میں آپ کا وہ خط نہ دیکھتا جو آپ نے اپنے رائے و ہندوں کو لکھا تھا تب بھی میں بلا نااہلی یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ آپ کے مقاصد مقبول تھے، لیکن پھر بھی میں قوم کے نقصان کا کچھ کم تا سبب نہ کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پھر آپ کو جلد کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے ہوئے

*Source.—(i) Letters from Sir Thomas Munro to the Right

Hon. G. Canning. Dated June 30, 1821.

دیکھینگے، لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میری خواہش تو آپ کو کسی دوسرے عہدے کی نسبت سابق عہدے ہی پر دیکھنے کی ہوگی کیونکہ اس سے خود میرے عہدے کی وقعت دوگنی ہو جاتی ہے جب وہ ایک ایسے شخص کے تحت ہوتا ہے جس کے نام سے اس کے تمام ماتحتوں کو بھی کچھ شہرت نصیب ہو جاتی ہے۔

میں انڈیا بورڈ کی صدارت کے تغیرات سے ہمیشہ گھبراتا رہتا ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس پر کسی روز کوئی ٹھیکہ انگریز پہنچ جائیگا جو ہندوؤں کو اینگلو سیکسن بنانے پر مصر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انگلستان میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پسندیدہ تغیر پہلے ہی ایک حد تک ہو چکا ہے اور اس کی تکمیل بہت مدت قبل ہی ہو جاتی اگر کچھ کے ملازمین اس کی مخالفت نہ کرتے۔

میں ہندوؤں یا دیگر لوگوں کی مشتاق آمیز ترقی کے جدید اصول پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتا ہوں۔ ہندوؤں کا کردار غالباً اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ واسکو ڈا گاما کے پہلے پہل ہندوستان پہنچنے کے وقت تھا اور ایک صدی بعد تک بھی اس کے زیادہ بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہماری حکومت کی قوت اس میں شک نہیں اس مدت میں ان لڑائیوں کا سد باب کر کے جو سابق زمانے میں بہت عام تھیں ملک کی دولت اور آبادی میں اضافہ کر دیگی۔ ہم بھی مدارس کے قیام کے ذریعے ہندوؤں میں خود ان کے ادب کی معلومات سے نیز انگلستان کی زبان اور ادب سے واقفیت پیدا کر دیں گے لیکن یہ سب کچھ ان کے کردار کو درست نہیں کر سکتا، ہم ان کو بہت زیادہ مطیع و منقاد، محنت کش اور شاید فنون میں بھی ماسر نہالیں گے، اور ہم دیکھیوں کو بھی بہت کم کر دیں گے لیکن ہم ان کے اخلاقی معیار کو بلند نہ کر سکیں گے۔ ہمارے تمام قوانین اور درسی کتب کا جو اثر ان کے کردار کو درست کرنے میں ہو سکتا ہے اس کے بالمقابل ہمارا موجودہ نظام حکومت جو ہندوستانیوں کو اقتدار، اعتماد اور منفعت کے عہدوں سے محروم رکھتا ہے ان کے کردار کو ذلیل بنانے میں بہت زیادہ موثر ہے۔ ہم خود اپنے منصوبوں کے خلاف عمل کر رہے ہیں اور ہم کسی اصلاح کی توقع نہیں رکھ سکتے جبکہ ہم ترقی کے لیے ایک کمزور آلہ استعمال کریں اور تخریب کے لیے ایک قوی آلہ کسی قوم کے کردار کی اصلاح اور اس کے ساتھ ہی اس قوم

کو اجنبی مکرانوں کے تحت ایسی ذلیل ترین حالت میں رکھنا جس میں وہ مفتوح ہونے کے بعد بظاہر ہو سکتی ہے یہ دونوں چیزیں بالکل متضاد ہیں۔

ترقی کے لیے بڑے جوش و خروش کی کوئی توقع ہی نہیں ہو سکتی جبکہ اعلیٰ ترین تحصیل معلومات کسی معمولی عہدے سے زیادہ کچھ نہیں دلاتی اور نہ دو دولت یا عزت کا باعث ہو سکتی ہے۔ جب ہندوستانیوں کی توقعات اس طرح محدود ہوں تو ہر وقت دیر جو ان کی اصلاح کر دار کے لیے کی جائیگی لازماً ناکام ہوگی اور اس قسم کی کوئی تدابیر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک ایسے مقاصد کی طرف ہندوستانیوں کی رہنمائی نہ کی جائے جن کے حصول کے لیے دوسرے ممالک میں انسانوں میں محنت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ترقی کا یہ کام خواہ وہ کسی طریقے سے شروع کیا جائے بہت دیر ہونا چاہیے لیکن وہ ہمیشہ اسی قدر اعتماد کے تناسب سے ہوگا جس قدر ہم ہندوستانیوں پر کرینگے اور سرکاری کاروبار کے انتظام میں وہ اس حصے کے مطابق ہوگا جو ہم ان کو دینگے جو کچھ ہم اپنی برتری کو نظر میں ڈالے بغیر ان کو دے سکتے ہیں وہ دے دینا چاہیے۔ ہماری حقیقی فوجی قوت خود ہمارے ہی ہاتھ میں ہونی چاہیے لیکن رکن مجلس اعلیٰ سے سرورتر سیول عہدوں پر بلحاظ موقع ہندوستانیوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہونی چاہیے کیونکہ وہ ابھی کسی اعلیٰ سیول عہدے کے فرائض کو ہمارے قواعد و خیالات کے مطابق ٹھیک طور پر انجام دینے کے قابل نہیں ہیں لیکن جتنا جتنا ہمیں یہ معلوم ہوتا جائے کہ وہ اعلیٰ تر عہدوں پر بخوبی مامور ہونے کے قابل ہو گئے ہیں اتنا اتنا ان کی ماموری کا دائرہ وسیع ہوتا جائے۔

ہم ملک کے ذرائع آمدنی کا یا ان اسباب کا زیادہ صحیح مسلم جن سے وہ اگھٹتے یا بڑھتے ہیں کبھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس وقت تک ان ذرائع کی ہم ہمیشہ نہایت غیر متوازن تشخیص کرینگے اور اکثر بہت زیادہ جب تک ہم یہ نہ سیکھ لینگے کہ ہندوستانیوں کے اعلیٰ تر طبقے کے ساتھ شرفاء کی مانند برتاؤ کیا جائے اور ان سے ہماری امداد میں اسی طرح کام لیا جائے جس طرح انگلستان میں دارالمعاش سے رقم حاصل کی تشخیص و تقسیم میں لیا جاتا ہے۔

*میرے پاس کسی شخص کو دینے کے لیے دس روپے بھی نہیں ہیں اور جو کچھ بھی مجھے مل سکتا ہے، وہ میرے بنیادی اصول کے مطابق مقامی مستحقین کو دیا جانا چاہیے۔ میری کامیابی کا بڑا راز یہ ہے کہ میں اسی مواد سے کام کرتا ہوں جو مجھے کسی مقام پر مل جاتا ہے اور اسی میں سے جو کچھ انتخاب کروں اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف میں اپنے کو رجوع نہیں کرتا۔

مجھے اس بات پر اتنا ہی تاسف ہے جتنا آپ کو یا کسی شخص کو ہو سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ دباؤ کا طریقہ بہت زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جب کہ ہماری قوت بڑھتی جاتی ہے، لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے لازموں یا منشیوں وغیرہ کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے ہوں ذی رتبہ یا بااثر بنادیں۔ ہم کو چاہیے کہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے ہندوستانی ہمارے ساتھ حکومت کے کام میں اور اس سے جو فوائد و منافع حاصل ہوتے ہیں ان میں شریک ہو سکیں ورنہ ہم قائم نہ رہ سکیں گے۔ مجھے یہ توقع تھی کہ اس مقصد کی تکمیل میں ایسے ذرائع اختیار کر کے جو کم از کم ہمارے نظم و نسق کی اندر بھی مگر حقیقی اصلاح کی بنیاد ڈالیں بڑی بڑی پیش قدمیاں کی جائیں گی۔ میں اس اعتبار یا فراست کے خلاف کچھ کہنا نہیں جانتا جس کے نظر کرتے اس امر کے متعلق ایک مختلف رائے قائم کی گئی اور ایک ایسے موقع کو گزرنے دیا گیا جو شاید جلد نہ مل سکے کیوں کہ اس وضع کی حکومت میں جیسی کہ ہماری ہے صرف مقامی عہدہ دار ہی مواقع اور انسانی واقعات سے فائدہ اٹھائیں تو کوئی بہتری ہو سکتی ہے۔ کوئی عام تجویز خواہ وہ کتنی ہی دانشمندانہ اور مستحکم ہو تعصب، جہالت اور رقابت کی اس کثرت میں کبھی کارگر نہ ہوگی جو بقول اہل ایران بجز قوت یعنی انگلستان میں پائی جاتی ہے۔

*یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ متعدد معزز و قابل اشخاص نے ہندوستانیوں کو

*Source. — (ii) "Letters of Sir John Malcolm," by J. W. Young.

Reproduced in "Life and correspondence of Sir John Malcolm,"

J. W. Kaye. Vol. II., p. 392. (Smith, Elder & Co.)

*Source. — (iii) Minute of Sir Thomas Munro, dated December 31, 1824.

خارج کر دینے اور ان کی بجائے جہاں تک ہو سکے یورپیوں کو مامور کرنے کی اہم سفارش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر وہ قدم جو اس راستے میں اٹھایا جائیگا نہ صرف ہندوستانیوں کے کردار کو بد سے بدتر بنائیگا بلکہ ہماری حکومت بھی اس کے باعث کمزور ہی کمزور ہوتی جائیگی۔ اس ملک میں ہماری سلطنت کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام اعلیٰ تر عہدے خواہ وہ سیول ہوں یا فوجی یورپیوں سے مامور کیے جائیں لیکن وہ تمام عہدے جن پر ہندوستانی ہمارے اقتدار کو خطرے میں ڈالے بغیر مامور کیے جاسکتے ہیں بلحاظ منفعت انھیں کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ ہم اس خیال سے معذور ہیں کہ ہم اپنی محدود تعداد سے ایک قوم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ہم دس گنا زیادہ ہوتے تو اسی قدر کام اور بچھڑتا ہم پہلے ہی سے ہر اہم عہدے پر قابض ہیں۔ اگر ہم تنزل کے ساتھ ان عہدوں پر مامور ہوں جو کم تر درجے کے ہیں اور اب ہندوستانیوں سے پر کیے جا رہے ہیں تو ہم اپنے کردار کو بدتر کر لیتے اور فرائض کو اچھی طرح انجام نہ دے سکیں گے۔ ہندوستانیوں میں کم از کم وہ تمام صفات یورپیوں کے برابر موجود ہیں جو ان اوتی خدمات کی انجام دہی کے لیے درکار ہیں جن پر وہ مامور ہیں۔ وہ مجموعی حیثیت سے بہتر محاسب ہیں زیادہ صابر اور محنت کش ہیں، ملک کے حالات اور باشندوں کے اطوار و رسوم سے بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں اور سرتاپا بہت اچھے معاملہ فہم انسان ہیں۔

* ہم کس افتخار کی بنا پر اپنی پدرانہ حکومت کا ذکر کر سکتے ہیں اگر ہم ہر اہم عہدے سے ہندوستانیوں کو محروم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں جیسا کہ حال حال تک ہم کہتے رہے ہیں کہ ایک ملک میں جس میں پندرہ کروڑ باشندے ہیں یورپی کے سوا کسی شخص کو اس قدر اختیار بھی نہیں دیا جائیگا کہ وہ بید کی ایک ضرب کی سزا دینے کا حکم صادر کر سکے۔ اس قسم کی دست اندازی سے ایک پوری قوم کی تذبذب و تہوہن ہوتی ہے جس کی تلافی ایک لیے کوئی صورت مفید نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم کے متعلق کسی وقت بھی کوئی فیصلہ کیا گیا ہو۔ انسان کی کمزوری اور غلطی جو اس کی سرشت میں داخل ہے ہندوستانیوں کی نظر

میں کبھی اس بے عزتی کی کوئی معقول وجہ نہیں قرار پاسکتی جو ان کے ساتھ بیٹل ہار کر کے کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے چھوٹے چھوٹے جراثیم کے فیصلے کرنے میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ہم ان کی اصلاح کرنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن تنجاویز ایسی پیش کرتے ہیں جو کامیابی کی بالکل مخالف ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح کے ان مدعیوں نے وہ بڑی بنیادیں دیکھی ہی نہیں جن پر اصلاح کا انحصار ہے۔ وہ ہندوستانیوں پر اعتماد کرنا ان کو کوئی اختیار دینا نہیں چاہتے اور حتی الامکان ان کو عہدوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن علم کی عام اشاعت کر کے ان کو روشن خیال بنانے کے جوش و خروش میں وہ سرگرم ہیں۔

اس سے زیادہ ناشایستہ اور لغو مصلحت سمجھی بدترین زمانوں میں بھی ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ ہر زمانے اور ہر ملک میں علم کے شوق کی زبردست تحریک ٹھہرتی دولت یا قوت کے سوا اور کیا ہے؟ یا ان اعلیٰ قابلیتوں کے حاصل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے اگر ان کو ان کے بہترین مقصد یعنی خدمت عوام کی طرف اس طرح نہ نکال دیا جائے کہ اس قسم کی قابلیتیں رکھنے والے اپنے اپنے درجہ قابلیت کے مطابق ملک کے عام انتظام کے مختلف فرائض پر مامور ہوں؟ ہم یہ کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ ہندو علم حکمت کے شوق میں انہماک ظاہر کریں گے جب تک انہیں ایسی ترغیب نہ ہو جیسی دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے؟ اگر اعلیٰ درجے کی تحصیل معلومات پر بھی امتیاز و عزت کی راہ نہیں کھلتی تو یہ خیال کرنا بے سود ہے کہ ہندو اس کی تلاش میں اپنا وقت ضائع کریں گے اور اگر اس لئے ایسا کیا بھی تو اس کی مہارت، عہدے سے محرومی کے اصول کے تحت اس کے سوا کچھ اور کام نہ آئیگی کہ اسے خود اپنی اور اپنے اہل ملک کی افتادہ حالت کا اور صریح علم ہو جائیگا۔ وہ ایسا علم حاصل نہ کریں گے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ انجام کار اس سے کوئی فائدہ اسے نہ ہوگا، وہ صرف وہی چیزیں سیکھیں گے جن کی ضرورت ہوگی اور جن کے مفید ہونے کا امکان ہوگا یعنی حیرت حساب۔ ممکن ہے کہ کچھ مستثنیات ہوں مگر وہ چند ہی ہوں گے۔ چند ہندو جو بڑی بڑی نوآبادیوں میں رہتے ہیں اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ یورپیوں کے ساتھ گزارتے ہیں علم ادب کے حقیقی شوق سے یا نمائش کے لیے یا کسی امداد وجہ سے اپنی کتابیں

پڑھتے ہوں گے، اور اگر انھوں نے کچھ ترقی کر لی تو اس میں خوب مبالغہ کیا جائیگا اور اس پر مر جاؤ آفریں کی ایسی صدائیں لگائی جائیں گی گویا تمام ہندوستان میں پھیلنے والی روشنی اور حکمت کے عظیم نشان یوم کا آغاز ہوا ہے۔ لیکن اس قسم کے چند اشخاص ہندوستانیوں میں ہمیشہ آہوئے ہیں اور ہمیشہ ہونگے تاہم ان سے عوام کی جماعت میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ محض ہماری کتابیں بہت کم بلکہ کچھ بھی اثر نہیں کر سکیں گی۔ شک اور معمولی علم ادب کبھی کسی قوم کے کردار کو درست نہیں کر سکتا۔ خاطر خواہ نتیجہ پیدا کرنے کے لیے دولت عزت اور سرکاری خدمت کی راہ کھلی رہنی چاہیے۔ اس قسم کے نعم البدل کی توقع کے بغیر علم حکمت کی کوئی تحصیل عوام کے کردار کو کبھی بلند نہیں کرے گی۔

* فیاضانہ برتاؤ بہت سی اقوام کے کردار کو بلند کرنے کا موثر ترین طریقہ ثابت ہوا ہے اور ہم یقین کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کے کردار پر بھی اس کا اثر ایسا ہی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہوگی لیکن اسی سبب سے کام کے شروع کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کرنی چاہیے۔ ہمیں مشکلات سے بہت ہمت نہ ہونا چاہیے اور اس وجہ سے کہ خود ہمارے زمانے میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی اس کام کو بے فائدہ سمجھ کر نہ چھوڑنا چاہیے، اور ہندوستانیوں کی ضد اور تعصب پر اس ناکامی کو محمول نہ کرنا چاہیے جو صرف ہماری غیر مستقل مزاجی سے یوں واقع ہوئی ہے کہ ہم نے اس واحد طریقہ عمل کو ترک کر دیا جس کی بنا پر عقلیت کے ساتھ کامیابی کی کوئی توقع ہو سکتی تھی۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ ہی رہا نہیں کرنی چاہئیں جو اور اقوام کے ساتھ کی جاتی ہیں اور ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یورپ کی اقوام میں ترقی کی رفتار کس قدر سست رہی ہے اور ان کو موجودہ حالت پر پہنچنے سے قبل زمانہ ہائے وحشت و جهالت کی کس قدر طویل منازل طے کرنی پڑی ہیں جب ہم دوسرے ممالک کا انگلستان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم علی العموم انگلستان کی موجودہ حالت کا ذکر کرتے ہیں اور ہم عہد اصلاح سے پہلے کے زمانہ کا خیال تک بھی نہیں کرتے، اور ہم میں ہر اس امینی ملک کو

غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب سمجھنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے جس کا طرز حکومت کسی نہ کسی طرح ہمارے طرز حکومت کے لگ بھگ نہ ہو باوجودیکہ وہ ہمارے اُس طرز حکومت سے بہتر ہو جو کچھ ہی مدت قبل تھا۔

ہمیں ہندوستان کو عارضی نہیں بلکہ ایک ایسا مقبوضہ سمجھنا چاہیے جس کو مستقل اس وقت تک قائم رکھنا ہے جب تک کہ آئندہ کسی زمانے میں ہندوستانی اس قابل ہو جائیں کہ اپنے اکثر توہمات و تعصبات کو ترک کر دیں اور کافی طور پر ایسے روشن خیال ہو جائیں کہ اپنے لیے ایک باقاعدہ حکومت قائم کر کے اسے چلا سکیں اور محض رکھ سکیں۔ جب کبھی ایسا وقت آئیگا اس وقت غالباً دونوں ملکوں کے لیے بہترین صورت یہی ہوگی کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت رفتہ رفتہ اٹھالی جائے۔ اس امر کے متعلق کہ یہ مفید تغیر جس کا یہاں تصور باندھا گیا ہے آئندہ کسی نہ کسی زمانے میں ہندوستان کے اندر واقع ہو گا نا امید ہی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس قسم کا تغیر ایک زمانے میں خود برطانیہ کے اندر کم از کم اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا وہ اب یہاں ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ حکومتوں کے طرز سے قوموں کے کردار ہمیشہ کس حد تک متاثر ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ بعض جو کسی زمانے میں بہت ہی شایستہ تھے وحشیانہ حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بعض دوسرے جو سابق زمانے میں بہت ہی غیر مہذب تھے ہندیب کے انتہائی زمینے پر پہنچ گئے ہیں تو ہمیں اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر ہم اشتغال کے ساتھ مناسب تدابیر اختیار کریں تو ہم بروقت اپنی ہندوستانی رعایا کے کردار کو اس حد تک درست کر لیں گے کہ وہ حکومت اور اپنی مخالفت کرنے کے قابل ہو جائے۔

مذکور بالا آراء کے اظہار سے وہ اشخاص جو اپنی عظیم و صحیح قوت فیصلہ کی بنا پر مشہور رہے ہیں انگلستان کے حکام کو جلد متاثر کرنے لگے۔ ۱۸۳۳ء کے قانون میں اصلاح کا ایک بڑا قدم اٹھایا گیا جب کہ پہلی مرتبہ کمپنی کی ملازمت میں داخلے کے متعلق رعایا کے تمام فرقوں کی مساوات اس کے مقام پیدائش مذہب پارنگ کا لحاظ کیے بغیر واضح طور پر تسلیم کی گئی۔ اس وسیلے سے تمام قانونی رکاوٹیں دور

ہو گئیں لیکن یہ لازم نہ ہوا کہ ہندوستانی فوراً اعلیٰ عہدوں پر لے لیے جائیں۔ اس کے بعد سے اہمیت ملازمت میں داخلے کا معیار قرار پا گئی۔ لہذا قانون مذکور کے منظور ہونے کے ایک سال بعد مجلس نظمانے اپنے ایک مندرج ذیل قابل یادگار مسئلے میں حکومت ہند پر اس ضروری امر کے لیے زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے ایسی سہولتیں ہم پہنچائی جائیں جن سے وہ اپنے کو سرکاری خدمات کے اعلیٰ مدارج کے قابل بنانے کے مواقع پاسکیں۔

رفع موانع | مذکور بالا قانون کی دفعہ ۷ کی رو سے یہ امر طے ہو گیا ہے کہ کوئی شخص اپنی پیدائش مذہب یا رنگ کی وجہ سے ہماری ملازمت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے قابل نہ قرار پائے گا۔

یہ مناسب ہے کہ اس اہم دفعہ قانون کو سمجھ لیا جائے تاکہ اس کا پورا افشا اور مقصد ہمارے تمام نظام حکومت میں پہنچا یا جاسکے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا منشا کسی قابلیت کا تعین نہیں ہے بلکہ رفع موانع ہے۔ دفعہ مذکور سے ہمارے نظام حکومت کو جو خامسکر ہمارے باقاعدہ سیول اور فوجی ملازمین کے ذریعے چلایا جاتا ہے کوئی حرج یا نقصان نہیں پہنچتا ہے ورنہ ایسا کرنا گویا ان قواعد کو منسوخ یا کمزور کرنا ہو گا جو جماعت مقننہ نے ان کارپردازوں کی قابلیت کے اطمینان کے لیے نافذ کر رکھے ہیں جن کے ہاتھوں میں ہندوستانی نظم و نسق کے مخصوص فرائض سونپے جائیں گے، اور وہ ایسے قواعد ہیں جن میں حال کے قانون سے ایک اہم اضافہ ان شرائط میں ہوتا ہے جو پہلی بری کالج سے متعلق ہیں لیکن ان قواعد کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ برطانوی ہند میں کوئی ملکران جماعت نہ ہوگی، قابلیت کے متعلق خواہ کسی قسم کا معیار قائم کیا جائے اس میں مذہب اور فرقے کا امتیاز شامل نہ ہو سکیگا، اور ملک معظم کی رعایا سے کوئی شخص خواہ وہ ہندوستانی یا برطانوی ہو یا مخلوط نسل کا ان خدمات سے جو عام طہر پر ہمارے

ہندوستانی لازمان غیر متعہد کو برساتی ہیں یا خود خدمات متعہد سے محروم نہ ہوگا بشرطیکہ وہ اور طور پر ان قواعد کے مطابق تیزان شرائط کے موافق جو مذکورہ دو صورتوں سے متعلق ہیں ملازمت کے قابل ہو۔

اس اصول کے نفاذ میں جس کا تعلق خاص کر آپ سے ہے ہندوستانیوں کو سرکاری خدمات پر امور کرنا ہوگا خواہ وہ سفید فام ہوں یا مغلوطا نسل کے ہوں۔ خیال میں جہاں تک سابق الذکر جماعت یعنی سفید فام ہندوستانیوں کا تعلق ہے یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جماعت متعہد کی اعتراض میں بڑی حد تک پیش بینی سے کام لیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا اور جیسا کہ فی الحقیقت بعض اہم موقعوں پر آپ نے غل بھی کیا ہے کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معتبر خدمات پر ایسی آزادی اور وسعت کے ساتھ لیا جائے جو اس لحاظ سے جائز قرار پائے کہ اس قسم کی خدمات سے متعلق فرائض کی انجام دہی ٹھیک طور پر ہوگی۔ باب تو اہم اور وسیع عدالتی فرائض بھی انہیں سونپے جا رہے ہیں گو اس میں شک نہیں کہ کچھ تو کفایت کے خیال سے اور کچھ فیاضانہ و ہمہ گیر حکمت عملی کے اصول پر بھی ایسا ہو رہا ہے تاہم ایک خط فاصل جو اب تک ہندوستانیوں کو جہل اور دوسری طرف انہیں خارج کرتا ہے قائم رکھا گیا ہے۔ بعض خدمات ان کے لیے مخصوص کی جاتی ہیں اور بعض سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ مؤخر الذکر کا تعلق ملازمت متعہد سے ہے اور سابق الذکر اس سے غیر متعلق ہیں بلکہ ملائیم اس وجہ سے کہ ہندوستانیوں کی قابلیت کے اور سطح معیار کے متعلق یہی خیال ہو سکتا ہے کہ وہ صرف ایک معین حد تک بلند ہو سکتا ہے۔ یہی وہ خط فاصل ہے جس کو موجودہ قانون ملتا ہے یا یہ کہ اس کی بجائے وہ ایک دو سر قائم کرتا ہے جس میں فرقوں کا امتیاز مطلق نہ ہوگا۔ قابلیت آئندہ کے ملازمت میں داخل ہونے کا معیار ہوگی۔

اس تبدیل شدہ قاعدے کی پابندی آپ کو اپنے قول و فعل دونوں میں کرنی ضروری ہے۔ علامت شاید نتائج میں کوئی زیادہ نمایاں فرق واقع نہ ہوگا۔ ملازمت متعہد سے متعلق خدمات اور سرکاری نوعیت کی دیگر خدمات کے مابین جو امتیاز اب

ہے وہی عام طور پر آئندہ رہے گا۔

ہم اس اہم اصول کے نتائج پر جس کو اب جماعت متقنہ نے پہلی مرتبہ تسلیم کر کے قائم کر دیا ہے زیادہ خصوصیت کے ساتھ غور و خوض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم قیاسی نوعیت کی بحث سے احتراز کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک علی سبق ہے جسے ہم نے سابق مواقع پر آپ کے ذہن نشین کر دیا ہے اور جس پر ایک مرتبہ اور زور دینے کے لیے موجودہ موضوع میں منوجہ کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ بات قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ ہندوستانیوں اور مغلوط فرقوں کے مامور ہونے کے قابل سرکاری خدمات کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور دو سرے طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یورپی اشخاص جب ملک ہند میں داخل ہو کر مقیم ہو جائیں گے تو ان کا طبقہ غالباً انھیں خدمات کے لیے امیدوار بنایا کر دیگا جو ہندوستانیوں کو دیجا سکتی ہیں۔ یورپی قوم و تعلیم کے اشخاص میدان میں نمودار ہونگے اور اسی واقعے کی پیش بینی سے ہم خاص طور پر محول بالاسبق کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ہر نقطہ نظر سے یہ بات اہم ہے کہ ہندوستان کے ویسی لوگ یا ان میں سے وہ جو اپنی عادت کردار یا حیثیت کے لحاظ سے حصول خدمات کی جانب مائل ہیں حتیٰ الوسع اس قابل ہو جائیں گے۔ اپنے یورپی حریفوں کا مقابلہ کر سکیں۔ پس ایک مضبوط دلیل ہر اس تجویز کی تائید کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے جو ہندوستانیوں کی ترقی کی باعث ہو خواہ وہ انھیں فواید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے ذریعے یا ان میں علم و حکمت اور اخلاقی تربیت کے ذخائر کو اکھٹا لانے سے عمل میں آئے۔ ان خاطر خواہ نتائج کے برآمد ہونے کی خواہش میں خوب معلوم ہے آپ بھی ہماری طرح رکھتے ہیں اور ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کی ترقی کے متعلق آپ کو زیادہ محنت کی جانب آگے لانے کے لیے ان خیالات کے جو ہم نے یہاں ظاہر کیے ہیں محض حوالے سے بڑھ کر آپ کو اور کسی تحریک کی ضرورت نہ ہوگی۔

لیکن جب ہم اس قسم کی خواہشیں اور رائیں رکھتے ہیں تو ہمیں اس مفروضے کے خلاف پیش بندی کرنی چاہیے کہ سرکاری اہتمام کے ذرائع و مواقع کے جاری رہنے ہی کی بدولت ہم اپنی حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کرداروں

باشندوں کو فائدہ پہنچائیگی جو اس کے زیر اقتدار ہیں۔ ہم نے بارہا ایک بالکل مختلف خیال آپ پر ظاہر کر دیا ہے۔ سرکاری عہدوں پر ترقی کی آسائشوں سے کسی حکومت کے باشندوں کی بڑی تعداد پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا اور شاید ایک شایستہ حکومت کے باشندے تو ان سے مطلق متاثر نہیں ہوتے۔ حکومت عہدہ داری کے شوق کو بڑھانے کے لیے تحریص و ترغیب کے سلسلے کی برقراری سے نہیں بلکہ جرم کے انسداد سے جائیداد کی کفالت و حفاظت سے، اعتماد کی تخلیق سے، محنت کش لوگوں کو ان کی محنت کا پھل ملنے کے متیقن سے، عوام کو ان کے حقوق سے بے روک ٹوک منتفع ہونے کے انتظام اور ان کی قوتوں کے آزادانہ استعمال سے بہترین طور پر دولت اور عام فلاح پیدا کر سکتی ہے۔ غرض یہ کہ عہدوں تک پہنچنے کی آزادی خاص کر اسی وقت قابل قدر ہوتی ہے جب وہ عام آزادی کا ایک جزو ہو۔

محول بالا مراحل کے موخر حصے میں نظام نے ایسی آسانیاں پیدا کرنے کی ضرورت پر اصرار کیا ہے جن سے ہندوستانی اپنے کو سرکاری خدمات پر مامور ہونے کے قابل بناسکیں اور اپنے یورپی حریفوں کا مساوی شریک کے ساتھ ٹھکانا کر سکیں۔ جیسا کہ بعد کو بتایا جائیگا ملک کے اندر نظام تعلیم کی اصلاح کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کی حکومت ان بہتر ذرائع تعلیم سے وسیع حد تک فائدہ اٹھانے کی خواہشمند تھی جو اس وقت ہندوستانیوں کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ لہذا ایک تجویز ان طریقوں سے متعلق نافذ کی گئی جن کا استعمال ایسے ہندوستانیوں کو خدمات پر مامور کرتے وقت لازم تھا جنہوں نے ان مدارس میں تعلیم پائی تھی جہاں انگریزی زبان بولی جاتی تھی۔

*سرکاری خدمات میں انگریزی اور برٹش گورنر جنرل نے بنگال کی تعلیم کی موجودہ حالت کو ملحوظ رکھ کر اور یہ رائے زنی کرتے ہوئے کہ اس زبان کا استعمال

*Source.—Lord Hardinge's Resolution.

"Education in British India."

A. Howell. (Calcutta General Press.)

ترغیب ہر معقول طریقے سے اس طرح دینا مناسب ہے کہ جن اشخاص نے اُن مواقع تعلیم سے جو انہیں دیے گئے تھے فائدہ اٹھایا ہے ان کے لیے سرکاری خدمات پر ماموری کی خوش آئند توقعات پیدا کی جائیں اور ان کے فدیے نہ صرف نفعی لیاقت کو نوازا جائے بلکہ سلطنت کو بھی اس قابل بنایا جائے کہ وہ اُن تجاویز کے نتائج سے جو عوام کی تعلیم کے لیے گزشتہ سین میں اختیار کی گئی تھیں جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکے نیز حکومت، خانگی افراد اور جماعتیں بھی مستفید ہو سکیں یہ فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری ملازمت کے لیے امیدواروں کے انتخاب کے وقت ہر ممکنہ صورت میں اُن اشخاص کو ترجیح دی جائیگی جنہوں نے ایسے مدارس میں تعلیم پائی ہے جو کل مذکور کے تحت قائم ہوئے ہیں اور خصوصاً ان کو جنہوں نے اس قسم کے مدارس میں قابلیت و معلومات کے معمولی درجے سے گزر کر اپنے کو ممتاز ثابت کیا ہے۔

۲۔ پس گورنر جنرل کا یہ مسرت آمیز حکم ہے کہ مجلس تعلیمات مختلف مقامی مجالس اور دیگر حکام کے لیے جن کے سپرد حکومت بنگال کے محکوم صوبوں میں تعلیمات عامہ کی نگرانی کا کام کیا گیا ہے یہ ایک ہدایت منظور ہو کہ حکومت مذکور کو بہت جلد اور آئندہ سے ہر سال یکم جنوری کو اُن طلبہ کی کیفیت سے مطلع کیا جائے جو اپنی قابلیت و لیاقت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے ایسی مختلف سرکاری خدمات کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں جن پر ان کی ماموری اُن کی عمر استعداد اور دیگر حالات کے نظر کرتے مناسب سمجھی جاسکتی ہے۔

۳۔ گورنر جنرل کا مزید ارشاد یہ ہے کہ مجلس تعلیمات سے یہ خواہش کی جائے کہ وہ ان تمام درسگاہوں کے انستروں یا منتظموں سے بھی جن کی امداد سرکاری سرمائے سے نہیں کی جاتی ممتاز طلبہ کی کیفیت حاصل کرے اور اسے مناسب اور کافی تحقیق کے بعد سرکاری مدارس کی کیفیت کے ساتھ شامل کر دے نیز یہ کہ اس قسم کے اداروں کے منتظمین عام طور پر یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ مذکورہ نوع کی کیفیت، مقررہ میعاد کے اختتام پر مجلس تعلیمات کے پاس روانہ کیا کریں۔

۴۔ جب یہ کیفیت وصول ہو جائے تو اسے طبع کر کے تمام سرکاری دفاتر

کے بالا دستوں کے پاس خواہ وہ کلکتہ میں ہوں یا باہر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا جائے کہ جن امیدواروں کی طرف ان کو اس طرح توجہ دلائی جاتی ہے انہیں مامور کرنے اور ترقی دینے کے کسی موقع کو وہ نظر انداز نہ کریں اور اپنے زیر اقتدار ہر خدمت کے پُر کرنے میں خواہ وہ کسی درجے کی ہود و سروں کے مقابلے میں جو اعلیٰ تر قابلیت نہ رکھتے ہوں ہمیشہ انہیں ترجیح دی جائے۔ اس قسم کے تمام امیدواروں کے سرکاری خدمات پر تقررات کی اطلاع، تقرر کنندہ عہدہ دار فوراً مجلس تعلیمات کو دیگا اور وہ اپنی سالانہ رُود او میں حکومت اور عوام کو ان تقررات سے مطلع کیا کریگی۔ عہدہ دار ان نگران کا جنھیں اپنے ماتحت عہدہ داروں کے کئے ہوئے تقررات کی توثیق کا اعتبار حاصل ہے فرض ہوگا کہ وہ یہ دیکھیں کہ ہر اُس صورت کے متعلق جہاں ایسے تعلیم یافتہ امیدوار کا انتخاب نہ ہو سکتا ہو جس کا نام مطبوعہ فہرست میں درج ہے کافی وجوہ کا اظہار کیا گیا ہے۔

۵۔ عوام کے ادنیٰ تر طبقوں میں اشاعت تعلیم کی مزید ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے گورنر جنرل کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ادنیٰ ترین خدمات سرکاری کے پُر کرنے کے لیے انتخاب اشخاص میں بھی امیدواروں کی لیاقت کے مختلف مدارج کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر صورت میں ایک ناخواندہ پر اس شخص کو ترجیح دی جائے جو پڑھ لکھ سکتا ہو۔

پانچواں باب

خلاف انسانیت رسوم کا انسداد

گزشتہ صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرہٹوں کی لڑائیوں کے اختتام کے نتیجے میں برطانوی حکومت ہند کی نوعیت اور مقاصد کیا تھے۔ اس زمانے کے جلیل القدر حکمرانوں نے چند اصول مقرر کر لیے تھے جو ان کے سیاسی مسلک میں رہنمائی کرتے تھے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کر رہے ہیں وہ اپنے قدیم طرز حکومت سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کی رسوم کا خواہ وہ موجودہ تجربے کی روشنی میں ناقص ہی معلوم ہوں احترام ہونا چاہیے۔ لہذا ملکی نظم و نسق کی تعمیر میں انہوں نے ایسے نئے طریقوں کو جو عوام کے طریقوں سے مختلف تھے نافذ کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ نہایت صبر کے ساتھ قدیم اور مسلم طریقوں کی اصلاح کی اور جہاں تک ہو سکا ملک کے سرکاری کام میں ہندوستانی کارکنوں سے مدد لی۔ مالگزارہی کے معاملے میں یکساں طریق عمل قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ وہ طریقے جو حصص ملک میں رائج تھے اختیار کیے گئے اور ان میں جدید ضروریات کے مطابق آہستہ آہستہ اصلاح کی گئی۔ انتظامیہ عدالت کے

متعلق حکمرانوں نے دھرم شاستر یا شرع اسلام میں تبدیلی کی جانب توجہ نہیں کی اور حتی الامکان ملک کے قوانین و رسوم کا احترام کیا۔ انہوں نے اپنے نظام تعلیم میں جو مغربی علم و تجربے پر مبنی تھا ملکی زبان کے ادبی و تحقیقی کو اپنا مرکز نگاہ قرار دیا۔ مزید برآں انہوں نے مذہبی معاملات میں کامل رواداری سے کام لیا اور اگرچہ وہ خود راسخ الاعتقاد و خدا ترس عیسائی تھے انہوں نے ہندوؤں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا اصل مقصد ان اشخاص کو فائدہ پہنچانا تھا جن پر وہ حکومت کر رہے تھے۔ وہ نہایت صبر و اعتماد سے کام لیتے تھے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ ہندو مذہب کی تدریجی ترقی اور حقیقی علم کی افراش سے ہندوستان کے ہندو اپنے خاص مصلحتوں یعنی راجہ مہاراجہوں سے وغیرہ کی رہنمائی میں اپنی آزادانہ خواہش کی بنا پر خود کو ان فرقہ وارانہ اور محکمہ بندیوں سے آزاد کر لینگے جن سے ان کے خیالات و افعال مقید ہیں اور ”بہی نوع انسان کے اعلیٰ طبقوں میں اپنی جگہ پائینگے“

لیکن بعض امور ایسے تھے جن میں وہ اپنی عدم مداخلت کے فیاضانہ طرز عمل کو ایک مبین قاعدہ قرار نہ دے سکتے تھے۔ نازک سوتھوں پر جیسا کہ نفسیت کے معاملے میں پہلے بنایا جا چکا ہے ان حکمرانوں نے مجسوس کیا کہ انہیں قوت و استقلال سے کام لینا چاہیے۔ وہ مستحکم طور پر اس بات کے قابل تھے کہ خود ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے برطانوی سلطنت کی حفاظت قایم رہنی چاہیے اور اسی لیے محبت کے ساتھ کسی قسم کے تجربے نہ کیے جانے چاہئیں لیکن جب اقتضائے انسانیت نے عمل کی صدا دی تو انہوں نے ہمت اور فیصلہ کن قوت دکھائی۔

ان مسائل میں سب سے مشکل مسئلہ ہندوؤں کی سنی کی رسم سے متعلق تھا۔ لفظ سنی کے لغوی معنی ہیں ”وہ جو صادق ہو“ اور رفتہ رفتہ یہ لفظ ایک وفادار اور ایک ایسی سچی عورت کے متعلق استعمال ہونے لگا جو اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی کو بالکل ایک ہی جانتی ہو۔ اردو و ہندی پاکیزگی کا اعلیٰ معیار ہندو گھرانوں کے قصص اور روایات میں مشہور ہے اور سینا اور سادتری کی کہانیاں

اب تک ہندو میوں کی روش کو ان کے شوہروں کے تابع بنانے میں بہت موثر ہیں۔ رمان کے قصوں میں سنتوں کے مطابق دیدہ و دانستہ جانوں کے ہلاک کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ زمانہ حال میں اس رسم کی ابتدا اس عام تاریکی چھستان میں پوشیدہ ہے جس نے ہندوستان کی معاشرتی تاریخ کو دھندلا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں سستی کا رواج راجپوتوں کی حکمران قوم کے سوا کسی دوسرے زمانے میں عام طور پر نہ تھا۔ راجپوتوں اور نیم راجپوت قبیلوں میں شاید وہ زیادہ تر باہم دوامی جنگ و جدل سے اور بعد کو فاحش مسلمانوں کے تشدد کی وجہ سے باقی رہ گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں سستی کی واردات بعض ایسی اقوام میں پائی گئی جو کھتری نسل کی ہوئے کا دعویٰ نہ رکھتی تھیں اور سستی کا رواج ہندوستان کے شمالی صوبوں میں جن میں بنگال شامل تھا عام ہو گیا۔ یہ بات جلد معلوم ہو گئی کہ جو درجہ تحریک بیماری عورت کو اپنی ہلاکت کے فعل پر آمادہ کرتی تھی وہ پیشہ پاک دامن کی جویش یا ازدواجی و فاداری پر مبنی نہیں ہو کرتی تھی۔ اجتماعی حیثیت سے اور متعدد صورتوں میں جہاں طور پر جبر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مادی ہوس اور مذہبی جنون دونوں مل کر معصوم عورتوں کو اپنا شکار بناتے اور انہیں بے رحمی کے ساتھ موت گھاٹ اتارتے تھے۔ پس یہ رواج جو اپنی بہترین شکل میں بھی کوئی ایسی خوبی پیش نہ کر سکتا تھا جو انسانی فطرت کو بلند اور پاک کر کے انسانی مسرت کو بڑھا دے، خلاف انسانیت اور خبیانہ بن گیا اور سچا طور پر تمام صحیح الدماغ اشخاص نے اسے ایک انسانی قربانی قرار دے کر قابل نفرت ٹھہرایا۔

ہندو بیواؤں کے نذر آتش ہونے سے متعلق مسٹر پونڈریکی تجویز پر ۲۸ مارچ ۱۸۸۷ء کو ایوان ہند کے موضوع بحث میں سستی کی حسب ذیل نہایت اشتعال انگیز و ظالمانہ مثال پیش کی گئی:-

ایک برہمن سیتھو نامی جب وہ اپنے خاندان سے دور تھا سستی امر گیا۔ دو ہفتے بعد اس کی بیوہ ہونو لیا ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً

*Source.—“Good Old Days of John Company.” Vol. II, p. 129.

(Wm. Carey.)

چودہ سال نفعی ہونے کے لیے چل نکلی۔ چنانچہ اس کے ان قریب ترین رشتہ داروں نے تیار کی جو اس وقت اسی گاؤں میں موجود تھے جہاں وہ مقیم تھی۔ اس کا باب پٹناتپوری کسی اور حصہ ملک میں تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ پورہ تھا اس کی اطلاع اسے نہیں دی گئی۔ اس امر کی تحقیق انہیں کی گئی کہ آیا ہومو لیا گنتی ہومو بد رضا و رغبت تھا۔ یہ فرض کرنا چاہیے کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔

ابتدائی رسوم ختم ہونے کے بعد ہومو لیا گنتی پورہ چڑھ گئی جسے اس کے چچا شیو نعل قیدی نے آگ لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں تکلیف ناکاں برداشت ہو گئی اور وہ غٹلوں سے باہر کود پڑی لیکن شیو نعل بے ہوش اور دیگر اشخاص نے اس کے ہاتھ پاؤں کپڑے اسے دوبارہ تیار پھینک دیا۔ جب وہ زیادہ جھلنے لگی اور اس کے کپڑے بھی بالکل حل گئے تو وہ بھر خنیا پر سے کود پڑی اور قریب کی ایک باؤلی کو جا کر پانی کی جگہ روٹی ہوئی لیٹ گئی۔ اب شیو نعل نے ایک چادر لے کر جو اس موقع کے لیے مروسا نے اسے دی زمین پر پھیلا دی اور ہومو لیا سے اس پر بیٹھنے کی خواہش کی۔ اس نے کہا نہیں میں اس پر نہیں بیٹھ سکتی، تم مجھے بھڑک کے پاس لے جاؤ گے اور میں اس کو روانہ رکھوں گی میں خاندان کو چھوڑ دوں گی اور بھیک مانگ کر یا کسی اور طریقے سے زندگی بسر کروں گی اگر تم لوگ مجھے پر محض رحم کرو گے۔ شیو نعل نے اس پر گنگا کی قسم کھا کر کہا کہ اگر وہ چادر پر بیٹھ جائیگی تو وہ اسے اس کے گھر پہنچا دیگا۔ اس نے حسب عمل کیا۔ ان لوگوں نے اسے چادر میں باندھ دیا، ایک بالٹ بٹکوا یا جسے گانٹھ میں سمجھو چادر کو لپیٹ کر گنگا کی گہنی تھی گزارا گیا اور اس طرح اسے لٹکا کے چٹا کے قریب جا کر جواب خوب بھڑک رہی تھی اس پوٹلی کو غٹلوں میں پھینک دیا۔ چادر فوراً جل گئی اور بد قسمت لڑکی نے پھر ایک بار اپنے کو بچانے کی کوشش کی کہ اس اشنا میں باقی لوگوں کے اکسا نے پر ایک مسلمان بوجھی اپنی تلوار کے ساتھ اس کے بہت قریب پہنچا اور اس کا سر کاٹتے ہی وہ نشت کی جانب گر پڑی اور موت نے اسے مزید کشمکش سے نجات دلا دی۔

مسلمان حکمرانوں نے سنی کے رواج کو روار کھا تھا گو کم از کم ایک موقع پر

اکبر نے بذات خود مداخلت کر کے اس مہلک رسم کو روک دیا تھا۔ ایک طویل مدت تک انگریزوں نے بھی گو وہ اس رسم کی شناخت سے متنبہ ہو گئے تھے اس بات پر کہ یہ عمل خود بیوہ کی جانب سے نہ رضا و رغبت ہونا چاہیے اصرار کرنے کے سوا کچھ اور کرنا خلاف عقل سمجھا۔ لارڈ ہیسٹنگز کو بدقسمتی سے ایسے وقت حکمرانی کا موقع نہیں ملا جب کہ حکومت زیادہ اہم خطروں میں پڑ سکتی تھی، لیکن اس نے لارڈ ہسٹنگ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اس بیچ رسم کے انسداد سے متعلق اس کے ارادے کی تائید گرم جوشی سے کی۔ لارڈ اہرسٹ نے بھی اس معاملے پر اپنی عین ترین توجہ صرف کی لیکن وہ بہت دل برداشتہ ہو کر اس نتیجے پر پہنچا کہ مداخلت اگر ناممکن نہیں تو خلاف عقل ضرور ہوگی۔ اس نے ۱۸۰۲ء میں لکھا کہ ہمیں کسی ایسے قانون کی سفارش کرنے پر آمادہ نہیں ہوں جو جستی کو بالکل منع کر دے..... اگرچہ یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ میں نے اس بیچ رسم کی شدت پر کوئی توجہ نہیں کی لیکن میں صاف طور پر اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس ترقی سے متعلق اپنے اعتماد پر زور دینے کی جانب مائل ہوں جو اس مذموم رسم کے تدریجی انسداد کے لیے ہندوستانیوں میں اشاعتِ تعلیم کے ذریعے ہو رہی ہے میں یہ ممکن باور نہیں کر سکتا کہ ہر سال مفید و معقول علوم میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کے باوجود بیواؤں کو جلانے یا زندہ دفن کرنے کی رسم زیادہ مدت تک جاری رہے گی۔

یہ افتخار لارڈ ولیم ہسٹنگ ہی کو حاصل ہے کہ اس نے عظیم ترین اخلاقی جرأت سے سچیدہ صورت حال کا مقابلہ کیا۔ اس میں اور فی الواقع دیگر تمام اصلاحات میں جو اس کے نام سے موسوم ہیں اسے اپنے رفیق میر جارس (بعد ازاں لارڈ ہسٹنگ) کی اعانت و حمایت حاصل تھی۔ لارڈ ولیم ہسٹنگ نے معلوم کر لیا کہ کمال ممانعت سے کم درجے کی کوئی چیز ہرگز مفید نہیں ہو سکتی اور اس نے انسداد

بالواسطہ طریقوں کی تائید سے انکار کر دیا۔ ہندوستان میں علوم کی تدریجی ترقی سے بھی اسے کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ اس معاملے میں مستقل مزاج ہو کر اس نے نہایت اقیانوس کے ساتھ عمل کی جانب قدم بڑھایا اور ان اشخاص سے مشورہ کیا جو بہترین مشیر ہو سکتے تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ سستی کے واقعات زیادہ تر کلکتہ کے اختلاعات میں پیش آئے ہیں جہاں کے باشندوں سے غیر مخالفانہ حل کے سوا اور کسی چیز کے خطرے کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے اطمینان کے لیے مذاہیر بھی اختیار کیں تاکہ کامل ممانعت سے سپاہیوں میں علی مخالفت کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ تب اس نے اپنی کونسل کے غور و خوض کے لیے اپنی وہ مشہور یادداشت سپر وکلیم کی جو زبان کی نفاست اور فیصلے کی معقولیت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سرکاری مراسلات میں شمار ہونی چاہیے۔ اس کے جرائد امیر عمل سے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ سر جے۔ ڈبلیو۔ کیٹی بیان کرتا ہے ”قانون مذکور کے نفاذ سے کمپنی کے سارے علاقوں میں سستی کا خاتمہ ہو گیا۔“ اور اس سے زیادہ اطمینان بخش صورت یہ تھی کہ دیہی ریاستوں نے بھی رفتہ رفتہ میجر لٹلورڈ ریڈنٹ جیپور وغیرہ کے سے اشخاص کے دانشمندانہ مشوروں کی مدد سے یہ رضا و رغبت برپا کی کہ اس کی کامیابی کا راز اس کے مقصد کی محض سادگی تھی جس کے متعلق ہر وہ شخص جو بینکنگ کو جانتا تھا کوئی اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوؤں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا ہے جس کا اصلی مقصد ان کی اصلاح ہے اور اسی لیے انہوں نے اس کے افعال کا وہی نشا لیا جو درحقیقت تھا۔

لارڈ ولیم بینکنگ کو اپنے نہایت مشکل کام میں رام موہن رائے اور دیگر معاشری مصلحین سے قابل قدر مدد ملی۔ ایک قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ موہن رائے نے اپنے بھائی کی بیوہ کو سستی ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ اس عورت نے پہلے تو ان کی مزاحمت کی کچھ پروا نہیں کی لیکن جب شعلوں کی تکلیف محسوس ہوئی تو اس نے چتا سے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے کٹے مذہبی ارشاد داروں اور پیاریوں نے اسے بانسوں سے دبا کر

وہیں مرنے کے لیے رُوک رکھا اور ڈھول اور پتیلی باجے زور زور سے بجائے گئے تاکہ اس کی چیخوں کی آواز سنائی نہ دے۔ رام موہن نے اس کی جان بچانے میں بے بس ہو کر اور ناقابل بیان غصے اور رحم سے بھر کر وہیں اور اسی وقت از خود یہ عہد کر لیا کہ وہ اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس ظالمانہ رسم کی منہج کٹی نہ ہو جائے۔ انہوں نے اپنا عہد برقرار رکھا۔ انہوں نے اخباروں اور عام جلسوں میں اس منہج رسم کی خوب مذمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ اس مقصد کی بنا پر رام موہن رائے نے متعدد ہو کر اس وحشت اور بربریت کو جوستی میں متضمن متقی ظاہر کرنے کا کوئی موقع پاتھ سے نہ جانے دیا۔ رام موہن کی شخصیت تھی جس نے غیر قوم کے نیک نیت حکام کا معاشری اصلاح کی ان کوششوں میں ہاتھ نہ دیا جو راسخ الاعتقاد طبقے کی اخلاقی قوت کے ازالے کے ذریعے کی گئیں۔ جب کلکتہ کے ہندوؤں نے ۱۸۱۷ء میں ایک محضر بھیجا جس میں سستی کے واقعات سے متعلق مخالفانہ کارروائیوں کے مصدرہ احکام کی منہج کے لیے التماس کی گئی تھی تو انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک ترویدی محضر بھیجا گیا جس میں ان احکام کی خوبی اور انسانی ہمدردی کی گرم جوشی سے تائید کی گئی۔ سستی کے بڑے بڑے خوفناک نظروں میں سے بعض ان کی پرزور عبارت میں یوں بیان کیے گئے ہیں: ”یہ درخواست گزار اپنی ذاتی معلومات یا قابل اعتماد شواہد رویت کی بنا پر پوری طرح آگاہ ہیں کہ ایسے واقعات اکثر پیش آئے ہیں جن میں عورتوں کو ان کے آئندہ وارثوں نے جو ان کی موت کے خواہاں ہوتے ترغیب دے کر ان کے شوہروں کے ساتھ چتا پر جل مرنے کے لیے آمادہ کیا ہے، بعض عورتوں کو جنہوں نے خوف کھا کر اس ارادے کو ترک کرنا چاہا جو ان کے منو فی شوہروں کے ساتھ حل مرنے کی مصیبت کے ابتدائی لمحوں میں بے نداشتا ظاہر کیا گیا تھا جبراً چتا پر ڈھکیل دیا گیا اور وہیں ان کو رسیوں سے باندھ کر مرے ہاتھوں سے اس وقت تک داب رکھا گیا جب تک کہ وہ شعلوں سے جل کر خاکستر نہ ہو گئیں اور بعض کو جو شعلوں سے بچ نکلی تھیں ان کے رشتہ داروں نے

واپس لا کے جلا کر مار ڈالا۔ درخواست گزاروں کی یہ عاجزانہ انتہا اس ہے کہ مذکورہ تمام شاہیں ہر شہنشاہ کی رو سے نیز تمام اقوام کی معمولی فہم کے لحاظ سے ہنرِ اوتھل کے ہیں۔" موہن رائے سروتی فہم پر اکتفا نہ کر کے اپنی جان کو خطروں عظیم میں ڈال کر کلکتہ کے مرگھٹ پر جا بٹرتے تھے اور سستی کی مصیبت کو صداقتِ امیرِ ترغیب کے ساتھ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں جب لارڈ ولیم بنتینک نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے مستند اقتباسات سے یہ ثابت کیا کہ سستی کو فی مذہبی فرض نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے بہت کچھ کیا چنانچہ انہوں نے بتایا کہ سستی کی رسم کو جو مداومت حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ ایک بڑی حد تک کوئی مذہبی اعتقاد نہیں بلکہ رشتہ داروں کی یہ جریصانہ خواہش ہے کہ وہ بیوہ کی پرورش کے مصارف سے بچیں۔ لہذا اس رسم کے انسداد سے کوئی مضرت، مذہب کو نہیں پہنچے گی جس کے متعلق برطانیہ نے اپنی ساکھ پر رواداری و احترام کا عہد کیا تھا۔

*** سستی کی موقوفی** | روک دینے کا، دونوں صورتوں میں فیصلہ پر خطرِ ذمہ داری سے ملو ہے۔ سال بہ سال سینکڑوں بے گناہ منگلوں کے بے رحانہ ویلے وقت موت کے حوالے کیے جانے پر رضامندی کا اظہار کرنا جبکہ اس فعل کو روکنے کی قوت موجود ہو ایک ایسی صورت حال ہے جسے کوئی شخص خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں سوچ سکتا۔ لیکن دوسری جانب اگر سابق کی وصول شدہ رائیں کسی یکسی طرح قابلِ وقعت سمجھی جائیں تو ایک متضاد طریقِ عمل کے ذریعے ہندوستان میں خود برطانوی سلطنت کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنا اور سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں افراد کی حالت کو متاثر کرتے ہوئے ان اہم اصلاحات کی جن کی توقع ہمارے اقدار کے جاری رہنے ہی سے ہو سکتی ہے ساری اسدوں پر پانی پھیرنا ایک ایسا بدل ہے جو خود انسانیت کی روشنی میں بھی ایک عظیم تر قیامت سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی ایک اولین و اعلیٰ ترین خیال یعنی نبی نوع انسان کی فلاح و بہبود

مسلک "سواج و خطراتِ رام موہن رائے" مضامین، ج ۱ صفحہ ۳۱۔

کی بنا پر میری رائے میں کسی مذہب قوم کی حکومت اس خلاف انسانیت دور
ناپاک رسم کو زور رکھ سکتی ہے۔ جہاں اس مسئلے کا حل اس کے ممکن اثرات کی
حد تک امثال و سنت کے لحاظ سے کریشان کن سے وہاں وہ حالات جن سے
ان کا تعلق ہے ایسے ہیں کہ قوی ترین دماغ بھی اہل کی یکسوئی پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔
ایک طرف مذہب و انسانیت اپنی نہایت خطرناک شکل میں مع شجوت و قطع۔
مختصر یہ کہ انسانی دل پر اثر کرنے والی تمام زبردست ترین قوتیں — فیصلے کو
متاثر اور متضاد کرنے کے لیے صف بستہ ہیں اور دوسری طرف مدت مدید سے
سنی کے جاری رہنے کی سند تمام مسلمان فاتحوں کی مثال اور اسی قسم کی
روش سے خود ہمارے قابل ترین حکمرانوں کا کامل اتفاق نیز عوام کا عام جذبہ احترام
یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو احساس اور عقل دونوں کا لحاظ کرتے ان کے فطری
حق کے اشتغال میں کسی طرح کی مداخلت کرنے سے صریح طور پر ممانعت نظر آتی
ہیں۔ اس رواج سے پہلی مرنیہ انحراف کی جرأت کرنے میں ہمارے لیے
یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ کوئی چیز احساس کے تابع نہیں کی گئی ہے بلکہ
عقل اور محض عقل ہی کی بنا پر فیصلہ صادر ہوا ہے۔

اپنے پیشرووں کے طرز عمل کی مذمت کرنے کا خیال تو کہا میں یہ کہنے
کے لیے تیار ہوں کہ ان حالات میں مجھے بھی ویسا ہی کرنا پڑتا جیسا کہ انہوں
نے کیا۔ سیاسی بے اعتباری کے اس الزام سے بری ہو کر جو معین مسلک کے
موجودہ انحراف سے متشیخ ہو سکتا ہے میں اختیار کر دہ تدابیر کے پر اس موئے کو
اس قدر کامل طور پر ثابت کرنے کی توقع رکھتا ہوں کہ کسی قسم کے خوف و خطر
کے اس اندازے کی بھی ضرورت نہ ہوگی جو ایک فائدہ عظیم کے حاصل کرنے
کے لیے معقول اور منصفانہ طور پر کیا جاسکتا ہے۔ نیز اس کے برخلاف کہ میں
اس اہم و خطرناک جدت کا واحد حامی ہوں میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ موجودہ حکومت
غلبہ آراء مدت سے سنی کی موافقی کی تائید میں رہا ہے۔ فی الواقع گذشتہ
تجربہ دیگر تمام اشخاص کے قطع نظر میرے انسانی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے
بارے میں مزاحم ہونا چاہیے۔ میں نے یہ حیثیت گورنر مدراس کے بقاوت و بے
مصلحتانہ نے برجستہ گورنر مدراس اس لیے احکام جاری کیے تھے جن کی بناء پر انہوں کو جگہ

نہ ہی رسوم کی خیالی خلاف ورزی کے خطرناک نتائج کے اثرات ویسی رعایا اور فوج کے دماغوں پر وسط دیکھے تھے۔ میں یہ نہیں بھول سکتا کہ اس خوش سانس کا خود میں بے گناہ نشانِ لامنت بنا تھا اور میں معقول طور پر اس خوف کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ ناکامی کی صورت میں جو ذمہ داری بجا طور مجھ سے منسوب ہوگی وہ اُسی واقعے کا اعادہ کرانگی۔ احتیاط اور اپنی حفاظت کا تقاضا مجھے اپنے پیشرووں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن انسانیت اور تہذیب کے ایک عظیم و اہم معاملے میں جہاں انسان کو اپنی موجودہ یا آئندہ مسرت کی پروا نہ کرنی چاہیے ایسی قبیح و خود غرضانہ حکمتِ علی کے تقاضے پر کون عمل کر سکتا ہے۔ مستحکم اور مکمل یقین کے باوجود جو اس مسئلے کے متعلق مجھے حاصل ہو گیا ہے اگر میں اس سنجیدہ فرض کے ادا کرنے میں پس پیش کروں تو میرا جرم کئی قتلِ عمد کے ارتکاب سے کم نہ سمجھا جائیگا۔ اس احساس نے مجھے پہلے ہی سے مجروح کر دیا ہے۔ ہر روز کی ناخیر خوفناک فہرست میں ایک فرد کا اضافہ کرتی ہے جس کی روک تھام موجودہ مسئلے کو بہت پہلے پیش کر دینے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن بدورانِ سال جاںِ عوام میں بہت زیادہ بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور جب اضطراب پھیلنا ہوا تو ہر قسم کے مبالغے خوب گشت کرتے ہوں اور ہندوستانی فوج کسی حد تک اس خوف میں ہو کہ مبادا اس کے بھٹے بھی یورپی عہدہ داروں کے بمبوں کے سانحہ کم ہو جائیں تو اس وقت مکار اور منصوبہ باز دشمنوں کو ایسا موقع دینا جس سے وہ امن عامہ میں خلل ڈال سکیں خلاف عقل ہوتا۔ حکومت کی موجودہ تدابیر سے جو سپاہیوں کے مفاد کو مالیہ تخفیف افواج کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئیں حکومت کی نیت کے متعلق سارے و سو سے دور ہو جائیگے اور اسی صورت حال کا خیال میرے پس پیش کا

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ فوجی دردی میں ہوں تشفقہ لگانے اور کان میں بے سننے کی مانگ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوڑ میں بنادت ہو گئی۔ اس واقعے کو مجلسِ نظام نے سنگین قرار دیا اور جنگل کو اس طلب کر لیا۔ ملہ اس کا ناقص مسئلہ مٹھ سے ہے جبکہ نظام کے حکم سے ان کے بھتے کم کر دیے گئے تھے۔ نظام کے حکم سے ہندوستانی فوج کے دستوں میں ایک حد تک فطری طور پر بہت زیادہ اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔

و احد سبب بنا ہوا تھا مگر اب میں ہمارے منصوبوں میں رحمت الہی شامل
رہنے کی دعا کرتے ہوئے ان وجود کو بیان کرونگا جن پر میری رائے قائم
ہوتی ہے۔

اب ہمارے سامنے نظامت عدالت کی دو رودادیں موجود ہیں جن
میں ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء کی واردات سنی کا ذکر ہے۔ موزن الذکر سال میں ۱۹۲۱ء
کے بالمقابل ۵۴ واردات کی کمی ظاہر ہوتی ہے اور سابق سنین کے مقابلے
میں تو بہت زیادہ کمی ہے۔ اگر اس تخفیف کو تہذیب یا تعلیم کی ترقی کے باعث
مسئلہ زیر بحث سے متعلق کسی قسم کی تبدیلی برائے برجمول کیا جاسکے تو یہ امر
نہایت اطمینان بخش ہوگا اور ذاتی اصلاح کی اس یقینی گروہ مست رفتار عمل میں
خلل انداز ہونا بالکل خلاف عقل و مصلحت ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں اطمینان
کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ کلکتہ میں ممکن ہے اعلیٰ طبقوں پر صداقت
کا سکہ خوب بیٹھا ہوتا ہے، ہاں تک عام آبادی کا تعلق ہے کسی قسم کی کوئی
تبدیلی نہیں ہوتی ہے اور ان وجوہ سے کم از کم اس رسم کے متروک ہونے
کی کوئی معقول امید نہیں ہو سکتی۔

* * * * *
میرا خیال ہے کہ یادداشت ہذا کے دشنا ویزات * * * * *
نیز ان واقعات سے جو مجھے بیان کرنے ہیں یہ صاف طور پر واضح ہو جائیگا
کہ رعایا میں قانون سے متجاوز ہو کر اثر و اقتدار کو مجہول طور پر تسلیم کر لینے
کا مادہ اس قدر زیادہ ہے کہ حکومت کی طرف سے محض ضمنی منظور کی بھی سستی
کی رسم کو بالکل موقوف کر دیگی۔ اس طریق موقوفی کی سفارش ان اشخاص
میں سے بہتہ ویروں نے کی ہے جن سے مشورہ کیا گیا اور اس میں شک نہیں کہ
یہ طریقہ کئی اعتبارات سے قابل ترجیح ہو سکتا ہے کیونکہ یہ زیادہ خاموشی تو
ہوگا مگر ساتھ ہی ساتھ موثر بھی ہوگا اور اس سے وہ خوف پیدا ہوگا جو شاید کسی عام قانون سے ہو سکتا

نیز بصورتِ ناکامی زیادہ وقت اور کسی اخلاقی گفت و شنید کے بغیر اس سے انحراف لگائی ہو سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ایسی حکومت اختیار نہیں کر سکتی جو پارلیمنٹ کے نزدیک قانونی حکومت اور اس کے نیک نشانے کے مطابق عمل کرنے پر پابند ہو۔ مزید برآں برطانوی سلطنت کی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے یہ شبہہ جائز طور پر کیا جاسکتا ہے کہ آیا اس قسم کی کوئی پوشیدہ کارروائی درحقیقت عدولت عملی کی جاسکتی ہے۔ جب ہمارے ریٹروسی قومی تھے اور ہم اپنی حفاظت سے متعلق بے اطمینانی کی وجہ قومی ترہ رکھتے تھے تو ممکن ہے مصلحت وقت کا تقاضا بالوابسطہ و پورا احتیاط کارروائی کے لیے ہوتا ہو، لیکن اب جبکہ ہم مفکرِ راہی ہیں میری قطعی رائے ایک ایسی بر ملا علامہ اور عام مانعت کی تائید میں ہے جو بالکلہ قانون کی اخلاقی خوبی اور ہماری قوتِ نفاذ پر مبنی ہوگی اور کسی مذہب تجویز کے خلاف میری رائے اس قدر اٹل ہے کہ اگر میں کمال موقوفی کے پُر امن ہونے کا قائل نہ ہوتا تو یقیناً میں ہر قسم کی مداخلت کے انسداد کا مشورہ دیتا۔

ان تمام اشخاص میں سے جنہوں نے اس رسم کی موقوفی کے خلاف رائے دی ہے اور ان بیچ نتائج کا ذکر کیا ہے جن کا بصورتِ موقوفی پیدا ہونا ممکن ہے میں مسٹر ہوریس ولسن کی رائے سے زیادہ کسی شخص کی رائے کو قابلِ وقعت نہیں سمجھتا۔ اس کے خیال میں ایک خطرناک غلطی اُن حقیقی مشکلات سے گریز کرنا ہے جو اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش میں پیش آتی ہیں کہ سنی "لازمی طور پر ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے" مجھے اس سے کمال اتفاق ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں یہ رسم کیا ہے بلکہ یہ کہ اسے کیا سمجھا جاتا ہے اور مجھے اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ہر طبقے کے ہندو چند تستنیات کے حوالہ اپنے صدیق اعتقاد کی بنیاد پر اسے مقدس رسم خیال کرتے ہیں۔

مسٹر ولسن کا خیال ہے کہ اس رواج کو اٹھانے کی کوشش سے وسیع پیمانے پر بے اطمینانی پھیلے گی۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کامیابی محض جزدستی ہوگی جو میرے نزدیک مشتبہ ہے۔ اس کا تصور یہ نہیں ہے کہ مخالفت کا اعلان کسی فوری اور صریح عمل نافرائی کا باعث ہوگا بلکہ یہ کہ لازماً منافقے اور عوام کی بے اطمینانی کے مظاہرے ہونگے۔ لیکن وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ایک کمرتبہ بھی انہیں شبہ پیدا ہو جائے کہ برطانوی حکومت کا مشاہدہ ہے کہ اب تک مذہبی معاملات میں نہایت عمل رواداری کا جو مستحکم اصول جاری ہے اسے ترک کر دیا جائے تو سب کے دلوں میں ہمارے آئندہ مقاصد کے متعلق اس قدر بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی کہ وہ آئندہ کسی ایسے انتظام پر بھی عمل پیرا نہ ہوں گے جو ان کی ترقی کے لیے کیا جائے اور پاکیزہ اصول اخلاقی نیز نیک و اعلیٰ اصول عمل میں جو آب یورپی تعلیم اور علوم کے ذریعے تیزی کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرائے جا رہے ہیں ایک خطرناک مزاحمت ہوگی۔ میں مانتا ہوں کہ اسی قسم کی رائے کہ ہمارے آئندہ مقاصد کے متعلق گہری بے اطمینانی پھیل جانے کا اندیشہ ہے مجھ پر اس روشن خیال ہندوستانی رام موہن رائے نے ظاہر کی تھی جو تہی نیز ان تمام توہمات و قبائح کو مٹا دینے کے برزور حامی تھے جو ہندو مذہب میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندو مذہب ابتداءً ایک خالص توحید پرست مذہب تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ کشتی کا رواج خاموشی و غیر نمایاں طور پر اس کی راہ میں مشکلات کے اضافے سے اور پولیس کے بالواسطہ ذریعے سے مسرود ہو سکتا ہے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ سرکاری قانون سے عام سراپائی پیدا ہو جائے گی اور استدلال یوں ہوگا کہ ”جب انگریز اپنے اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے تو اس وقت انہوں نے یہ قرین مصلحت خیال کیا کہ عام رواداری اور ہمارے مذہب کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے، لیکن اعلیٰ اقتدار کے حاصل ہوتے ہی ان کا سب سے پہلا کام عہد شکنی ہے اور اس کے بعد مسلمان فائضوں کی طرح غالباً وہ اپنا مذہب قبول کرنے پر ہمیں مجبور کرینگے۔“

اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے جیسا کہ اس کی جانب میں ہمیشہ مایل رہنا ہوں کہ مذکور بالا تجا لات میں بہت کچھ صداقت ہے، لیکن ان نتائج سے مطلق اتفاق نہ کرتے ہوئے جو اگرچہ ظاہر نہیں کیے گئے تاہم بہت ناموافق آثار رکھتے ہیں اب میں اس قباحت نیز اس وسعت خطر کی تحقیقات کرونگا جو مذکورہ تجویز سے علانیہ اہم ہو سکتی ہے۔

یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سارے احاطہ فورٹ ولیم میں سستی کی جو ۳۶ سالہ تاریخیں ہوئیں ان میں سے ۴۲، بنگال بہار و اوڈیسہ میں جنہیں صوبہ جات نشیبی کہا جاتا ہے واقع ہوئیں اور ان موخر الذکر وارداتوں میں سے ۲۸ صرف قسمت کلکتہ میں واقع ہوئیں۔

کسی اجنبی شخص کو جو ہندوستان سے واقف نہ ہو یقین دلاؤ تو کجا سمجھنا بھی بہت مشکل ہو گا کہ لاکھوں باشندوں کی آبادی میں جس رقم منت کلنتہ مشتمل ہے اور جہاں کی صورت حال صوبہ جات نشینی پر بھی منطبق ہو سکتی ہے اخلاقی جراثیم اور فحش کی اس فذرکمی ہے اور صدیوں کی ایسی عادی علامانہ فطرت ہے کہ حکمران طاقت کے حکم کے خلاف بغاوت یا مخالفانہ مقابلہ کا خطرہ نامکن قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر انسانی جانوں کی اس افسوس ناک نہایتی کا منظر صوبہ جات نشینی کی بجائے صوبہ جات بالائی میں دلیر و شجاع اشخاص کے درمیان پیش آتا تو میں حفاظت کے سوال کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ انہما پر خیال نہ کرتا۔ ان صوبہ جات میں جہاں کی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے ہستی کی وار د میں صرف ۳۴ ہتھکڑی ہیں۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک ایسے مفار جہاں کسی قسم کا بھی اتحاد بالکل خلاف معمول ہے کوئی عام لیجان ایک ایسی رسم کی موافقت میں پیدا ہو سکتا ہے جس میں بہت کم اشخاص حصہ لیتے ہوں اور جو علانیہ دیگر ارکان خاندان کی جانب سے اکثر و بیشتر ذاتی اغراض کے نظر کرتے بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔

بہر حال یہ ایک بالکل مختلف اور اہم تر سوال ہے کہ ہندوستانی فوج

کس حد تک خوف زدہ ہو سکتی ہے اور عام طور پر وہ کب تک شنی کی رسم پر کاربند رہ سکتی ہے اور کہیں عبادتِ اشخاص و دیوتوں کے معاملے کی طرح فوری بغاوت پیدا کرنے یا دوامی منافرت کا بیج بونے کا قصد کر کے موجودہ صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھا سکنگے۔ ہمارے ہندوستانی اور یورپی فوجوں کے درمیان بلحاظ تعداد جو بڑی نامناسبیت ہے اس کے نظر کرنے سے یہ ظاہر ہے کہ فوجوں کا عام اتحاد سلطنت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن سکتا تھا اور اسی لیے یہ لازم ہوا کہ ہندوستانی سپاہیوں کے داغ پر جس اثر کے مترتب ہونے کا امکان ہے اس کا اندازہ کرنے میں یورپی احتیاط سے کام لیا جائے۔

مجھے کونسل کے سامنے اس گشتی کی نقلِ مع جوابات پیش کرنے کا شرف حاصل ہے جو ایسے پانچاں عہدہ داروں کے نام بھیجی گئی تھی جن کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی فہم اور تجربے کے لحاظ سے ہندوستانی فوج پر مجوزہ تدبیر کے اثر کا اندازہ لگانے کے لیے موزوں ترین افراد ہیں۔

اب مجھے کونسل کے غور و خوض کے لیے اس قانون کا مسودہ پیش کرنا ہے جس میں شنی کی موثقی مدون ہے۔ اس کے ساتھ ایک کاغذ منسلک ہے جس میں نظامتِ عدالت کے حکام کی آرا و تجاویز مندرج ہیں۔ اس کاغذ میں پیش کردہ تجویز کی تائید میں مذکورہ عدالت کی متفقہ آرا کا اعادہ کیا گیا ہے۔ نظامتِ عدالت کی تجاویز میرے ایک اہم مقصد سے جو شنی کے مزید فرق اور عہدہ داران کو توالی کے باہمی تصادم کو ترک کرنے کے متعلق تھا کسی قدر مختلف ہیں۔ صرف ابتدائی کارروائیوں میں یا عین اوائی رسم کے دوران میں جب کہ سب کے احساسات کم و بیش مشغول رہتے ہیں اعتبارات کے نامناسب و غیر معقول استعمال کی وجہ سے فسادات یا مناقشات کے درپیش آنے کا مجھے اندیشہ ہے۔ اسی لیے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ پولیس بصورتِ ابتدائی صرف ہدایت اور تاکید کر دے مگر تشدد کے ساتھ ممانعت نہ کرے اور اگر اس اطلاع کے خلاف شنی کی رسم ادا کی جائے تو اس کی رد واد مجسٹریٹ کو بھیجی جائے جو فریقین کو طلب کرے گا اور اس بارے میں کسی دوسرے مفید نتیجہ کی طرح باضابطہ کارروائی کریگا۔ یہ پیش بندیاں عدالتِ ہند کے خیال میں غیر ضروری

نظر آتی ہیں اور مجھے توقع ہے کہ وہ اسی خیال کی حامی رہیگی، لیکن ابتدا میں میرا خیال ہے ہم بہت زیادہ چوسکی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں خیال کہ مقامی جج کے انتہائی جوش کی بنا پر بہت عاجلانہ یا سخت حکم سنا نا فائدہ ہونے پائے میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس قسم کا مقدمہ کمشنران دورہ کے لیے قابل سماعت قرار دیا جائے۔

میں اب اپنا معروضہ ختم کر چکا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور و خوض کرنے میں احساسات و جذبات کا دخل نہ ہونے کا جو عہد میں نے کیا تھا اسے میں نے پورا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ظاہر ہو جائیگا کہ میں نے تمام مشکلات و اعتراضات کی اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے، واقعات کو صدق و غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اس کی تطبیق استدلال و اسناد سے ہوتی ہے۔ میرا سب سے پہلا اور اولین دلی مقصد ہندوؤں کی فلاح و بہبود ہے۔ میں ان کی آئندہ حالت کی اصلاح کے لیے کوئی شے اس قدر اہم نہیں جانتا جس قدر پاکیزہ اخلاق کی تلقین خواہ ان کا اعتقاد کچھ ہی ہو اور خداوند تعالیٰ کی مشیت کا جائز تصور ہو سکتا ہے۔ اس بہتر مفہوم کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلی تدبیر یہ ہونی چاہیے کہ مذہبی اعتقاد و رواج سے کشت و خون کے خیالات کو جدا کر دیا جائے۔ پھر وہ اس وحشیانہ جوش و خروش سے محفوظ رہیں گے تو ٹھنڈے دل سے مسئلہ صداقتوں کا احساس کریں گے۔ وہ دیکھیں گے کہ قوانین الہی میں کوئی تباین نہیں ہو سکتا اور اس حکم میں جسے تمام نئی نوع انسان الہامی مانتے ہیں کہ جس کسی بے گناہ کا خون نہیں بہایا جائیگا، کوئی استثناء نہیں ہو سکتا اور جب وہ اپنے اس اولین اور سب سے زیادہ مجرمانہ رواج کی غلطی کا اعتراف کر لیں گے تو کیا یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ دوسرے رسم و رواج بھی جو ان کی راہ ترقی میں حائل ہیں اٹھ جائیں گے اور اس طرح ان مزامتوں اور پابندیوں سے جب ان کے دل و دماغ اور افعال آزاد ہو جائیں گے تو وہ آئندہ ہر غیر ملکی فاتح کے غلام بنے رہنا گوارا نہ کریں گے جیسا کہ اب تک کرتے رہے ہیں بلکہ نئی نوع انسان کے اعلیٰ خاندانوں میں اپنی مناسب جگہ حاصل کر لیں گے، میں اس قسم کے خیالات میں یا اس

تجويز کے معاملے میں کوئی ایسی رائے قبول نہیں کر سکتا جو انہیں ہمارے مذہب میں داخل کرنے سے متعلق ہو۔ میں ہندوؤں کے لیے واضح قانون کی حیثیت سے محسوس کر رہا ہوں اور لکھ رہا ہوں اور جیسا کہ مجھے یقین ہے یہی احساس خیال متعدد درویشن ضمیر ہندوؤں کا بھی ہے۔

ان اعلیٰ خیالات سے قطع نظر ایک ایسی حکومت کے لیے جس کا میں ایک عضو ہوں ایسے قانون کا فخر حاصل کرنے کا خیال کوئی ذلیل منصوبہ نہیں ہو سکتا جس کی بدولت برطانوی حکومت کے دامن سے ایک بدنما و حصہ نکل جائیگا اور خطرناک نفس برہمنی کے لیے نا انصافی اور انسانی قربانی رک جائیگی۔ آخر میں ہمارے انتظام کے متعلق جو عام نظم و نسق سلطنت برطانوی کے ایک شعبے کی حیثیت رکھتا ہے مجھے اپنی اس خواہش کے اظہار کی اجازت دی جائے کہ ہمارا طرز عمل اس اعلیٰ مثال کی تقلید پر مبنی ہوگا جو برطانوی حکومت ہماری رہنمائی کے لیے انگلستان میں قائم کرے اور انجنیئرس اعلیٰ و ارفع اصول کو جب ممکن ہو ہندوستان کی کثیر آبادی کے حالات پر منطبق کرنے سے ہندوستان اور انگلستان کی عوام خوش حالی کو ترقی اور قوم کے کردار کو بلندی نصیب ہو سکتی ہے۔

مورخہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

ولیم بینٹنک

سنی یا ہندو میواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج انسان کے فطری احساسات کے بالکل مخالف ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں کہیں بھی اسے لازمی فرض نہیں بتایا گیا ہے، اس کے برخلاف پرہیزگاری اور گوشہ نشینی کی زندگی

قانون جس میں سنی یا ہندو میواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج ناجائز اور عدالتہائے فوجداری سے قابل سزا قرار دیا گیا اور جسے گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ۲۷ دسمبر ۱۸۵۹ء کو منظور کیا۔

* Source.—(ii) "Administration of the East India Company."

Sir J. W. Kaye. (Richard Bentley.)

ہوہ کے لیے مخصوص طور پر قابل ترجیح ہونے کی تعین کی گئی ہے اور ہندوستان کے باشندوں کا ایک کثیر حصہ اس رواج پر عمل پیرا نہیں ہے۔ بعض وسیع اضلاع میں نوازش کا وجود ہی نہیں ہے اور ان اضلاع میں جہاں یہ رواج بہت زیادہ رہا ہے یہ مشہور ہے کہ متعدد صورتوں میں ایسے مظالم کیے گئے جو خود ہندوؤں کے نزدیک نفرت انگیز اور ان کی نظر میں ناجائز و فبیح تھے۔ اب تک جو تعداد میں اس قسم کے افعال کو کم کرنے اور روکنے کے لیے اختیار کی گئیں انہیں کامیابی نہ ہو سکی اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کو کامل یقین ہے کہ زیر بحث فلاح عملاً اُس وقت تک رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس رواج کو پورے طور پر موقوف نہ کر دیا جائے۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر گورنر جنرل باجلاس کونسل نے برطانوی حکومت ہند کے نظام کے اس اولین و اہم ترین اصول کو ترک کرنے کا قصد کیا بغیر کہ رعایا کا ہر طبقہ اپنے مذہبی معمولات کی سجاوڑی میں اس وقت تک آزاد رہے گا جب تک اس اصول کی پابندی انسانیت و انصاف کے ناگزیر تقاضوں کی خلاف ورزی کے بغیر کی جاسکتی ہو۔ حسب ذیل قواعد کا نفاذ مناسب تصور کیا ہے اور انہیں بذریعہ ہذا اس وقت سے قابل نفاذ قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ ان تمام ممالک میں شائع ہو جائیں جو احاطہ فورٹ ولیم کے عین ماتحت ہیں۔

۱۔ سنی یا ہندو بیواؤں کو زندہ جلانے یا دفن کرنے کا رواج بذریعہ ہذا ناجائز اور عدالت فوجداری سے قابل منہ قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ (۱) تمام زمینداروں، تعلقداروں، یا دیگر مالکان اراضی کو، تمام صدر کاشتکاروں اور ہر حیثیت کے شہسکاروں کو، تمام ماتحت تعلقداروں، نااہلوں اور دیگر مقامی گماشتوں کو، تمام ہندوستانی عہدہ داروں کو جو حکومت یا محکمہ ہانغان کی جانب سے الگزارہی یا لگان وصول کرنے پر مامور ہوں اور

۱۔ مالکان اراضی جو نااہل یا لگزارہی کے متعلق حکومت کے نزدیک راستہ دہ دار ہوتے ہیں۔

۲۔ زمینداروں کے گماشتے۔

۳۔ اصل کاشتکار۔

تمام مندلوں اور دیگر دیہی ٹیلوں کو اس قسم کی قربانی کے جس کا ذکر مذکور بالا دفعہ میں کیا گیا ہے وقوع میں آنے کے اندیشے کی فوری اطلاع قریب ترین ٹھانے کے عہدہ دار کو دینے کا خاص طور پر ذمہ دار بذریعہ ہذا گردانا جانا ہے اور کوئی زمیندار یا دیگر قسم کے اشخاص جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور جن پر مذکورہ ذمہ داری عاید کی گئی ہے مذکورہ ضروری اطلاع دینے میں عمدتاً غفلت یا تاخیر تھے منکب قرار پائیں تو وہ مجسٹریٹ کی عدالت سے مستوجب سزا ہے جرمانہ ہونگے اور اس رقم جرمانہ کی مقدار دو سو روپیوں سے زیادہ نہ ہوگی اور زجر جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں انہیں سزائے قید دی جائیگی جس کی ميعاد چھ مہینوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

(ب) یہ اطلاع ملے ہی کہ جس قسم کی قربانی قانون ہذا میں ناجائز قرار دی گئی ہے اس کے واقع ہونے کا احتمال سے خود داروغہ کو تو الی اس مقام پر پہنچ جائیگا یا اپنے محضر یا جعدار کو مند و مذہب کے ایک یا زیادہ رفقہ اوروں کے ہمراہ بھیج دینا اگر عہدہ دار ان کو تو الی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان اشخاص پر جو اداے رسم کے لیے جمع ہوں یہ ظاہر کر دیں کہ وہ عمل خلاف قانون ہے اور انہیں منتشر ہونے پر مال کرنے کی کوشش کریں نیز انہیں یہ سمجھائیں کہ اگر وہ اپنے عمل پر مصبر ہونگے تو خود کو منکب جرم بنائیں گے اور عدالت فوجداری سے مستوجب سزا قرار پائیں گے۔ اگر جمع شدہ اشخاص ایسی تاکیدوں کے خلاف اداے رسم کی کارروائی کریں تو عہدہ دار ان کو تو الی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ قربانی کو وقوع میں آنے سے روکنے کے لیے اپنے تمام اختیاری طریقے استعمال کریں اور ان سرگرد ہوں کو گرفتار کر لیں جو اداے رسم کے لیے امداد یا ترغیب دے رہے ہوں، اور اگر عہدہ دار ان کو تو الی انہیں گرفتار نہ کر سکیں تو وہ ان کے نام اور تھے معلوم کرنے کی کوشش کریں اور فوراً مجسٹریٹ یا جائنٹ مجسٹریٹ کو تمام مفصل واقعات کی اطلاع دیں تاکہ وہ احکام صادر کرے۔

۳۔ اگر کسی ایسی قربانی کی اطلاع جو بذریعہ قانون ہذا ناجائز قرار دی گئی ہو فی الحقیقت اس کے وقوع میں آجانے کے بعد عہدہ داران کو تو آئی کوٹھالیہ یا ان کے مقام واردات تک پہنچنے سے قبل وہ عمل میں آچکی ہو تو بھی اس صورت حال کی پوری تحقیقات وہ اسی طرح کرینگے جس طرح غیر فطری موت کے دیگر تمام موانع پر کی جاتی ہے اور اس کی زد و ادب اسے اطلاع و صدور حکم اس مجسٹریٹ کے یہاں روا کرینگے جس کے وہ ماتحت ہیں۔

۴۔ (۱) اس اطلاع کی وصول یا بیچس کا رد اند کرنا سابقہ دفعہ کی شرائط کے تحت کو تو آئی کے داروغوں پر لازم کر دانا گیا ہے اس علاقے کا مجسٹریٹ یا جوائنٹ مجسٹریٹ جہاں قربانی وقوع میں آئی ہو حالات مقدمہ کی تحقیقات کریگا اور قربانی کو بروئے عمل لانے والے اشخاص متعلقہ کو عدالت دورہ میں پیش کرنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کریگا۔

(ج) بذریعہ ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس قانون کی اشاعت کے بعد وہ تمام اشخاص جو کسی ہندو بیوہ کو زندہ جلائے یا دفن کرنے کے قصد سے اس کی قربانی میں امداد یا ترغیب دینے کے مرتکب ہوں خواہ وہ قربانی بیوہ کی رضاد رغبت سے ہو یا نہ ہو، قتل انسان مستلزم سزا کے مجرم قرار پائینگے اور حالات مقدمہ کی نوعیت اور مرتکب کی حد جرم کے لحاظ سے عدالت دورہ کی صوابدید پر سزائے جسد ماند یا قید یا دونوں سزائوں کے مستوجب ہونگے، اور جواب دہی میں یہ عذر قابل سماعت نہ ہوگا کہ اشخاص مذکور نے مجرم یا مجرمہ سے بیوہ کو ہلاک کرنے میں امداد طلب کی تھی۔

(ج) اشخاص جو مذکور بالا جرم کی تحقیقات کے لیے عدالت دورہ کے سپرد کئے جائیں داخلہ ضمانت سے متعلق نافذ شدہ قواعد عام کے تحت ضمانت پر رہا ہو سکیں گے یا نہیں یہ امر مجسٹریٹ کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۵۔ مزید برآں یہ اعلان انگریز خیال کیا جاتا ہے کہ قانون ہذا کے کسی حکم کا نشاء ایسا نہ لیا جائیگا جو نظامت عدالت کے ایسے اشخاص کے حق میں سزائے موت صادر کرنے میں مانع ہو جو کسی ہندو بیوہ کو زندہ جلائے یا دفن کرنے میں

جبر و تشدد و باعانت کے مرتکب قرار پائیں جب کہ وہ بیوہ و مدہوشی یا بدحواسی کی حالت میں مبتلا ہو یا اور کسی سبب سے اس کی رضا مندی کا اظہار نہ ہو سکتا ہو اور جب کہ قیدی کے خلاف ثابت شدہ جرم کی سنگین نوعیت کے لحاظ سے عدالت مذکور اسے جائز طور پر سختی رحم قرار دینے کی کوئی وجہ نہ پائے۔

ایک اور معاملہ جو بینک کی توجہ کا طالب اور اس کی مداخلت کا خواہاں ہو ا طریق ٹھیک تھا جس کی نوعیت بہ الفاظ سر جان کیٹی ذیل میں بیان کی گئی ہے۔ کئی سال تک ہندوستان کے برطانوی حکمران اس طریقے سے بالکل نادانگہ تھے جس کے ذریعے پیشہ در اور آبائی قاتلوں کے گروہ سینکڑوں لے گناہ مسافروں کو وحشیانہ طور پر ہلاک کر ڈالتے تھے۔ اس قبیح طریقے کے انسداد کی دشواری اس شرمناک منہر مندی تک محدود نہ تھی جو ان بد معاشوں کی طرف سے ظاہر ہوتی تھی۔ جن دیہاتوں میں ٹھیک رہتے تھے وہاں کے عہدہ دار اکثر صورتوں میں ان کے ہندو سے واقف ہوتے تھے اور خود انھیں راز کی رشتوں سے مستفیع ہوتے تھے تنہا حاکموں اور صوبے کے عہدہ داروں کے لیے بھی اس مسئلے کا حل کرنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ ٹھیک اپنی گرفتاری کے منصوبوں کی خبر سنتے ہی ملک کے کسی دوسرے ایسے حصے میں منتقل ہو جاتے تھے جہاں مقامی پولیس کا قابو نہ چلتا تھا۔ ایسی شہادت کا فراہم کرنا بھی جو کسی قانونی عدالت میں ثبوت جرم کے لیے کافی ہو ایک بہت بڑا کام تھا۔ لہذا بینک نے بعض ضروری اصلاحیں نافذ کیں۔ اس نے ٹھیک اور دیکھی کا ایک مخصوص محکمہ قائم کیا جسے حدود مملکت کمپنی میں خاص اختیارات عطا کیے گئے۔ ایک قانون نافذ کیا گیا جس کی بنیاد ٹھیکوں کو سرسری تحقیقات کے بعد سزا دی جاسکتی تھی۔ ان مزید اختیارات سے مسلح ہو کر کرل سلیمن اور اس کے ساتھیوں نے بہت جلد اپنا کام شروع کر دیا اور ٹھیک کے فن کی اتنی ہی معلومات حاصل کر کے جتنی خود ٹھیکوں کو تھی ان کو انھیں کی بازی میں شکست دے دی۔ حکومت کے لیے گرفتار شدہ ٹھیکوں میں سے جن کے مفید ہونے کا بہت زیادہ امکان نظر آیا انہیں

معافی اور ملازمت دی گئی۔ ان ”مجرمانِ اقراری“ کی جیسا کہ انہیں کہا جاتا تھا امداد سے مختلف گروہوں کی جلد تلاش کی گئی اور انہیں کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔ یہ جیسا کہ سر جان کیمپ نے لکھا ہے ”ایک با وقعت کارنامہ اور عظیم الشان فتح تھی۔ چند انگریز عہدہ داروں نے اعلیٰ انتظامی حکام کے احکام پر عمل کر کے ہندوستان کو اس بھاری گنہگاری سے پاک کر دیا۔“

* ٹھٹھکی کا پیشہ | ٹھٹھکی کا پیشہ یہ تھا کہ دور دور از مقامات پر بزدلی کے ساتھ انجان مسافروں کا ٹھاکھوٹ دیا جاتا اور یہ عمل عموماً بدترین طریقے

کے کذب و فریب کے حالات میں کیا جاتا تھا۔ ٹھٹھک جو از نکاب جرم کے لیے ہم خوب متحد ہوئے انتہائی عقیدت کے ساتھ حلف اٹھا کر اپنے ظالمانہ انداز میں اُن تمام غافل راہ گروں کو قتل کرتے ہوئے جنہیں وہ ہکا بکا کر اپنے قابو میں لے آتے سارے ملک میں پھرتے رستے تھے۔ کوئی حیران عیاروں اور عام مسافروں میں مایہ الاتباز نہ تھی۔ ٹھٹھک کئی مختلف محسوس بدلتے اور انواع و اقسام کے رُوب بھرتے تھے۔ وہ سڑک پر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے، شہروں اور قصبوں کے اندر زمین میں اچار چار کی لولیوں میں گشت لگاتے اور جب باہم ملتے تو ایک دوسرے کے نزدیک اجنبی نظر آتے تھے۔ شاید ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس گروہ میں سے کوئی ایک ذی رتبہ شخص کی حقیقت سے کسی ریاست میں سفر کرتا، اس کے ساتھ متعدد ملازمین ہوتے اور چند میاں نے یا ڈولیاں بھی ہمراہ ہوتیں جن میں اس کے خاندان کی متورات ہونے کا ذکر کیا جاتا حالانکہ درحقیقت ان میں ان کے آلات پیشہ کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ سڑک پیروں میں بدلتے ہوئے جبکہ ان کے پاس کوئی چیز شبہ پیدا کرنے والی نہ ہوتی یہ سوداگرانِ اہل دوسرے راہ گروں سے اس طرح مل جاتے گویا انسانی سے ان کا ساتھ ہو گیا اور کسی جنگل کے قریب یا کسی سنان مقام پر جو کسی موزوں ندی سے متصل ہو مناسب موقع

* Source.—“Administration of the east India Company, 1858”

پاتے ہی جان لیوا پٹکا یا سوتی کپڑا اپنے شکار کے گلے میں ڈالتے اور حکمت کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ایک شخص مہلک کمند پھینکتا، دوسرا اس رسی یا کپڑے کا دوسرا سرا پٹکے اسے بے بس و بد نصیب راہ گیر کی گردن کے اطراف مضبوطی کے ساتھ پھینچتا اور دونوں مل کر اسے خالی ہاتھوں سے اس کا سرا منے کی جانب جھکاتے جاتے جبکہ ایک تیسرا شخص اس کے پاؤں پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیتا تھا۔ اس طرح کوئی مدافعت نہ ہو سکتی تھی اور محلت کے ساتھ کام تمام کر دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں نعش پر سے کپڑے اتار لیے جاتے مال حاصل کر لیا جاتا اور بہت جلد نعش دفن کر دی جاتی تھی۔ مقدس کدال سے جو حیرت انگیز خاموشی کے ساتھ استعمال کی جاتی تدفین نعش کے لیے ایک قبر جلد کھودی جاتی تھی۔ اگر کوئی اجنبی شخص ایسے وقت آ پہنچتا جب وہ اس طور پر مصروف کار ہوتے تو مقتول شخص کی نعش پر وہ شائستگی اور احترام کے ساتھ ایک کپڑا ڈال دیتے اور اس کے بازو و دواؤں پیچ کر اس طرح اپنی آوازیں بند کرتے گویا وہ کسی عزیز یا ساتھی کی موت پر گریہ و زاری کر رہے ہیں۔

یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانیوں کے کسی طبقے نے ان ٹھگوں کی نسبت اپنے مخصوص پیشے کو زیادہ شوق و رغبت کے ساتھ جاری رکھا ہوگا۔ وہ بچپن ہی سے خطرناک پیشے کے لیے تیار کر لیے جاتے تھے۔ تنگی ان کے لیے صرف ایک پیشہ ہی نہیں بلکہ مذہب بھی تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان کی کارگزاریوں پر ان کی دیوی اظہار خوشنودی کرتی تھی اور بعض سکہ علامتوں اور آوازوں کے ذریعے ان کے ساتھ سلسلہ مام جاری رکھتی تھی۔ دیوی کی رضا جوئی کے لیے وہ بڑے کثیف رسوم ادا کرتے اور پھر بقیہ رسی کے ساتھ متوقع شگونوں کے منتظر رہتے تھے۔ اس سے زیادہ ظاہری مذہبی رسوم یا متوقع انکشافات کے باطنی

۱۔ کدال جو خاص غنیمت ہے۔ یہ وہاں جاتی اور پھر بعض متین رسوم کے ساتھ قمر بنائی جاتی ٹھگوں کے نزدیک مخصوص طور پر قابل احترام بھی جاتی تھی۔ کسی اور آلے سے مردہ شخص کو دفن کرنا ممنوع تھا کیونکہ کدال ہی ان کے پیشے کی علامت تھی اور ان کا اعتقاد تھا کہ خود دیوی نے بطور میراث اسے چھوڑا ہے۔

مضبوط عقیدے کے ساتھ مسئلہ قدامت کے زمانہ ہائے بعید میں بھی کسی نالگو نے اپنے دیتوٹا سے کبھی مشورہ نہ کیا ہوگا۔

جب ٹنگوں خود ایک مرتبہ موافق نظر آگئے اور دیوی نے ہم پر خوشنودی کا اظہار کر دیا تو قتل نہ صرف ایک مذہبی فرض بلکہ ایک خوشگوار کام قرار پا گیا۔ پھر منقحہ ٹنگ کو کبھی شیشیانی کا سامنا نہ ہوا۔ کرنل سلیمین نے ایک ایسے ٹنگ سے جو مجرم اقراری بن چکا تھا یہ سوال کیا کہ ”کیا تم مقتول اشخاص کے ساتھ ہمدردی کبھی محسوس نہیں کرتے، ان کی حالت واجب الرحم یا قابل افسوس کبھی نہیں پاتے؟“ جواب ملا کہ ”کبھی نہیں“ اس انگریز عہدہ دار نے پھر پوچھا کہ ”تم بوڑھوں اور چھوٹے بچوں کو کچھ نہ کچھ نرس نکھائے بغیر کس طرح قتل کر سکتے ہو جب کہ وہ جان بوجھ کر دل جمعی سے تمھارے ساتھ بیٹھتے بات چیت کرتے، اپنے خانگی معاملات، اپنی توقعات اور خطرات کو بیان کرتے ہیں نیز اپنے اہل و عیال کا ذکر کرتے ہیں جن سے ملنے کے لیے وہ کئی سال کی مفارقت، تکلیف اور مصیبت کے بعد جا رہے ہیں؟“ جواب جو دیا گیا یہ تھا کہ ”ٹنگوں کے ٹنگ و موافق ہونے کے وقت سے ہم ان کو ایسے ٹنگار سمجھتے ہیں جنہیں دیوی نے قتل کرنے کے لیے ہمارے ہاتھوں میں ڈال دیا ہے، ہم ان کو نصیحت و نالود کرنے کے لیے دیوی کے ہاتھوں میں محض آلے بن گئے ہیں، اگر ہم ان کو ہلاک نہ کریں تو دیوی ہم پر پھر کبھی مہربان نہ ہوگی اور ہم اور ہمارے خاندان مصیبت و مفلسی میں مبتلا ہو جائیں گے۔“

* ٹنگوں کا طریق کار | یوم تک گھری پر رہا اور پھر ٹنگوں کی ایک ڈلی کے

ساتھ روانہ ہوا۔ ہم نے موسم برسات میں کوئٹہ سے مسافروں کی تلاش میں سفر شروع کیا، اور دو ٹنگ اعداد اور ساتار نے جن میں سے سو خال ذکر باکمال عیار تھا ایک مسافر کا اعتماد حاصل کر لیا۔ یہ مسافر لاہور کا ایک راجپوت تھا جو اپنے وطن

* Source.—“Report of the Thug Gangs of Upper and Central India in the Year 1839.” W. Sleeman. (G. H. Huliman, Calcutta.)

جار ہاتھا اور اسے اس کے درغلانے والوں نے ایک بنیے کے مکان میں ٹھہرایا۔ انہوں نے رات کے وقت اسے جگایا اور وہاں سے اس کے ساتھ وہ روانہ ہوئے مگر راستے میں اس نے دونوں درغلانے والوں سے کہا کہ ”تم دونوں شخص قابل اعتماد نہیں، تم ٹھگوں کی مانند نظر آتے ہیں، میرے نزدیک میں اسے یہ دیکھ کر کہ وہ بدگمان ہو گیا ہے میں نے اپنی محنتی ٹھگی زبان میں ساتھیوں سے کہا کہ ”الگ چلے جاؤ، وہ تم پر شبہ کرتا ہے“ ساتھی پلٹ گئے۔ مسافر نے پھر مجھے مخاطب کر کے اپنے شبہات بیان کیے اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہم دونوں کو ملکر چلنا چاہیے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ان دو آدمیوں کے متعلق اپنے شبہات بھی ظاہر کیے۔ پس ہم دونوں ملکر چلنے لگے اور میں نے جبکہ وہ چل رہا تھا متوقع پا کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ مگر میری ٹھگ مدد کے لیے قریب ہی تھا۔ ہم نے نعش ایک ایسے مقام پر پھینک کر چھوڑ دی جہاں پانی نہ تھا تاکہ شغال اسے کھا جائیں۔

اس کے بعد ہم دو ٹولیوں میں منقسم ہو گئے اور مدارا اور میں صرف دونوں ایک طرف ہو گئے۔ ہم مسافروں کی تلاش میں چل نکلے اور اسی روز میں نے ایک مسافر کو پھانسا جو نو جوان گھسارا تھا۔ اسے اس کے ٹوپر سے اتارنے کے لیے مدارا نے ہماری کاہانہ کر کے قے کے آتار ظاہر کیے۔ میں نے مسافر کو اتارنے اور مدارا کی طبیعت درست ہونے تک ٹھہر جانے کی ترغیب دی۔ وہ ٹوپر سے اتر کر نیچے بیٹھ گیا میں نے اس کی پشت کی جانب جا کر اس کا گلا گھونٹ دیا اور مدارا نے اس کے پاؤں کھینچے۔ ہم نے ایک توار اس کی بغل میں چوکر اس کی نعش ایک کنوئیں کے اندر پھینک دی جہاں سے اس کی اور تقریباً پندرہ یا سولہ دوسرے ان مسافروں کی ہڈیاں نکالی جاسکتی ہیں جنہیں خود میں نے اس کنوئیں میں پھینکا تھا۔ اس کے بعد ہم گھر واپس گئے کیونکہ ہم تقریباً ایک ہینہ باہر رہ چکے تھے اور دو واردات قبل سے مجھے اپنے حصے میں تقریباً چاس روپیے ملے۔ جو شخص گلا گھونٹتا ہے یا درغلانتا ہے وہ ہمیشہ سب سے زیادہ حصہ پاتا ہے۔

سفر کے بعد مجھے اپنے موضع کے زمیندار کو کوئی تحفہ دینا لازم تھا کیونکہ سارا موضع کو یہ معلوم تھا کہ میں ٹھگ ہوں اور اگر یہ تحفہ نہ دیے جاتے تو زمیندار مجھے قید کر دیتا۔ تمام ٹھگ اس طرح اپنے اپنے زمینداروں کی رضا جوئی کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی سے قتل کی مذکورہ وارداتوں کا یا اپنے ٹھگ ہونے کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ اس قسم کی باتیں ہم اپنی بیویوں سے اس خوف کی بنا پر نہیں کہتے کہ کہیں یہ راز وہ دوسروں پر فاش نہ کر دیں۔

* مقصد یہ اب ٹھگوں کا ایک گروہ جناب من۔ آپ کو مخاطب کرنے سے

میری غرض یہ ہے کہ ٹھگوں کی ان مختلف بستوں کا مختصر حال پیش کروں جنہوں نے ضلع کرپا و چتور اور شمالی سرکار و اولرہ کے باشندوں کو تنگ کر رکھا ہے کیونکہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام اس خطرناک طریقے کی مختلف صورتوں سے نیز ان کارروائیوں سے واقف کرائے جائیں جو اس کے کمال اسناد کے لیے جنوبی ہند میں کی جاتی ہیں۔

۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۷ء تک ایسے اشخاص کی ایک بڑی جماعت جو اراکائی ٹھگ کہلاتے ہیں چار شہور سرداروں شیخ احمد، امین صاحب، مہنور صاحب اور جیدر خاں کے زیر انتظام ضلع مسلی ٹیم کے موضوعوں میں حیدر آباد کے سرحدی انتظام موٹگل سے ایلور کی شمالی جانب ایک منزل کی مسافت کے موضع تنک قائم ہو گئی تھی۔ ان ٹھگوں میں سے اکثر خصوصاً سردار جفاکش کا شکار ہونے کی بنا پر ایسے موضوعوں میں نیک نام تھے۔ تیرہ سال کی مدت تک ان گروہوں نے اپنے موضوعوں کے اطراف تین سو میل کے اندر ملک کی تمام بڑی بڑی سڑکوں پر بے روک ٹوک قتل و غارت کا کام جاری رکھا۔ انہوں نے اپنی کئی فہموں میں جینیر فیس حاصل کی ہے۔ ضلع باندہ میں منیم ہونے کے بعد ان کا سب سے پہلا مال غنیمت چودہ ہزار روپیوں کی

ایک رقم تھی جو پانچ اشخاص کے قتل سے حاصل کی گئی اور یہ مال ہندو کے ایک تاجر کا تھا جو اسے حیدر آباد روانہ کر رہا تھا۔ اس واقعے کے تقریباً چودہ سال بعد جب وہ گوئی کی جانب اپنی ہم پر تھے تو انہوں نے چار اشخاص کو قتل کر کے بطور غنیمت چھ ہزار روپیوں کی ایک رقم حاصل کی جو کرپا کے ایک تاجر کی تھی۔ پھر اسی مقام کے قریب ایک ہی سال بعد ان کی مٹ بھٹ پانچ خزانہ برداروں سے ہوئی جن کے قتل سے انہیں آٹھ ہزار روپیوں کی اور ایک رقم ملی۔ اس کے دس سال بعد انہوں نے ایک منغل سوداگر اسپ کو جن کے ہمراہ چار اشخاص تھے اچانک آگھیرا اور سب کو قتل کر کے تین ہزار روپیوں کی قیمت کا مال غنیمت حاصل کیا۔ ان واردات قتل کی ایک چھوٹی تعداد ہے جن کا ارتکاب ان مردودوں نے کیا ہے۔ قتل کی جن وارداتوں کا علم مجھے ہوا ہے ان کی تفصیل سے جو میرے ہاں موجود ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین اسے ان گروہوں کی گرفتاری کے وقت تک وہ ساٹھ واردات قتل کے مرتکب ہوئے تھے جن سے ایک سوستر اشخاص ان کے شکار بنے اور پچاس ہزار روپیوں کی قیمت کا مال ان کے ہاتھ آیا۔ یہ ٹھگ شاید آج تک بے روک ٹوک اپنی کارستانیاں جاری رکھتے اگر دکنی ٹھگوں میں کا ایک مجرم اقراری ان کے وجود اور مقام سکونت کا پتہ نہ دیتا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کی تقریباً تمام آبادی جو ساٹھ اشخاص پر مشتمل تھی گرفتار کر لی گئی۔

ان گروہوں کی گرفتاری سے ضلع دیریکا پٹنم میں مسلمان ٹھگوں کی ایک بستی کے وجود کا علم ہوا ان مسلمان ٹھگوں سے ضلع پاندہ کے ٹھگ منٹروں پر دو تین مرتبہ ملے تھے اور اس طرح انہیں واقفیت ہو گئی تھی۔ صرف انھیں کو مسلمان ٹھگوں کے وجود کا علم تھا۔ اس امر کی معلومات کہ یہ بستی ہندوستان کے اس حصے میں کس طرح قائم ہوئی تھی ارکائی ٹھگ بہم نہ پہنچا سکے لیکن جب میں نے ان سب کو محفوظ طور پر حراست میں لے لیا تو ان کے تاریخی حالات سے میں نے جلد واقفیت حاصل کر لی۔ تقریباً بیس سال قبل ان کی تعداد ساٹھ اور ستر کے درمیان تھی لیکن ان کی گرفتاری کے وقت وہ گھٹ کر بارہ رہ گئی تھی۔ ان میں سے جو ضعیف ترین تھے ان کے اجداد دیگر کئی اشخاص کے ساتھ ہندوستان سے

آئے تھے، وہ ابتدا میں تین سرداروں کے تحت تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اجنبیوں کو اپنے گروہ میں کبھی داخل نہیں کیا۔ گزشتہ چند سال سے ان میں کے اکثر نوجوان اپنے پیشے سے واقف ہونے کے بعد سپاہی بن گئے اور اب مختلف پلٹوں میں مامور ہیں جہاں میں نے معلوم کیا ہے ان کا چلن اچھا ہے۔ اس برادری کا ایک مستعد خائف جسے حال میں سوئی پر چڑھا دیا گیا سابق میں ایک سپاہی تھا جو فوجی قواعد کے دو وقت کی رخصت لے لیتا، اپنے ساتھیوں سے جالٹا، چند واردات قتل کا مرتکب ہوتا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ ان ٹھگلوں کو کسی بڑی لوٹ کھسوٹ کا مال کبھی نہ ملا تھا نہ نہایت سنگ دل قاتل تھے جو صنف یا عمر کا لحاظ کرتے بغیر نہ ان فرقوں کے لوگوں کا کوئی احترام کرتے تھے جن کا قتل دوسرے ٹھگ ایک سنگین جرم سمجھتے تھے۔ وہ شاید ہی اپنے کو ٹھگونوں کے خیال میں ڈالتے تھے، ان کے نزدیک کدال کوئی باندھت چیز نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہر کاٹی ٹھگ ان کو ٹھگوں کا ایک منحوس گروہ خیال کرتے تھے۔ ان کی واردات قتل کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۳ء میں ان کی گرفتاری کے وقت تک وہ چالیس واردات قتل کے مرتکب ہوئے تھے جن میں انہی اشخاص شامل تھے۔

اس حصے میں جن اصلاحات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ولیم ٹینک کے نام سے منسوب ہیں۔ جیسا کہ اکثر صلحین کی قیمت میں ہوتا ہے اسے بھی بہت زیادہ مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا جو خاص کر اس کی ہی قوم کے افراد کی جانب سے عمل میں آئی۔ اس کی نیک نامی پر ایک نہایت سخت حملہ مسٹر تھامسن نے کیا جس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ”لارڈ ولیم ٹینک کا نظم و نسق کھوکھلا سا نظر آ گیا“ اور اس نے ہندوستان کے لیے یا خود اپنی نیک نامی کے لیے اتنا کام بھی نہ کیا جتنا ان دوسرے اشخاص نے ہرجا راج بار کو کے واحد استغناء کے سوا انجام دیا جو انیسویں صدی کے آغاز سے اسی منصب پر مامور رہ چکے ہیں۔“ اس کی سب سے

مذکورہ بالا۔

سے تاریخ برطانوی ہند، مصنفہ ای۔ تھامسن (شاہی دفتر حافظہ عام)۔

بڑی کمزوری، سخت تنہی۔ وہ شہرت کے بُت کا پرستار تھا اور اس کے انوار اس نے باطنِ رحمت اس شے کی قربانی سے حاصل کرنے کی کوشش کی جو روح زمانہ کہلاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی تہمتوں کے باوجود ولیم بینٹنک کے نام کی عزت آج بھی ہندوستان کے تمام طبقے کرتے ہیں۔ اس کے کام کی قدر و قیمت زمانے نے ثابت کر دی ہے۔ مسرُوت نے اس جلیل القدر حکمران کی یادگاریں حسب ذیل فیاضانہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

”درستہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنک نے ہندوستان کو خیر باد کہا۔ اس کی ہفت سالہ حکومت اس شخصیت اور اصلاح کا ایک دور تھی۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں امن قائم کر دیا اور ہندوستانی طاقتوں کے ساتھ اپنا زمانہ صلح و آشتی سے بسر کیا۔ اس نے سرکاری قرضے کی رقم گھٹادی کسالانہ خرچ میں کمی کر دی اور سبقت دکھائی۔ اس نے شمالی ہند میں اس اصلاح یافتہ بندوبست، مالگزاروں کا آغاز کیا جس سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو مالگزاری اور عدالت کے محکموں میں اعلیٰ خدمات پر مامور کیا۔ اس نے سستی کی رسم موقوف کر دی اور شعلگی کے جرم کا اشد اد کیا۔ اس نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو ترقی دی اور اس اصول پر بدرجہ غایت عمل پیرا رہنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا نظم و نسق اولاً رعایا کے ملک کے مفاد کے لیے ہے۔ اس کے جانشین سرچارلس ٹمکاف نے جو اس کے طریق روایات کا تربیت یافتہ تھا اسی پنج پر کام کیا اور انھیں اصول پر عمل کیا۔ اس نے ہندوستان کے مصلح کو آزادی دے دی اور ایک قابل و خیر خواہ حاکم کی حیثیت سے اپنے لیے اعلیٰ شہرت حاصل کی۔“

لیکن لارڈ ولیم بینٹنک کو اپنے سیاسی مسلک کے برحق ہونے کے متعلق تائنخ کے فیصلے کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہندوستان سے اس کی روانگی کے قبل ہی بہت سے انگریز اور تقریباً تمام ہندوستانی اس کے کاموں کی حقیقی قدر و منزلت سمجھنے لگے تھے۔ اس کی یادگاروں میں مقام کلکتہ ایک مجسمہ نصب کیا گیا جس کا کتابہ اس کے دوست و رفیق میکالے نے یوں لکھا:۔

یہ یادگار

ولیم کیوڈلش بنٹنک

جس نے نہایت دانشمندی، باقاعدگی اور خیرگالی کے ساتھ سات سال تک ہندوستان پر حکومت کی، جس نے ایک سلطنت عظیم پر حکمران بنائے جانے کے باوجود ایک عام شخص کی طرح سادگی اور میانہ روی سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی، جس نے مشرقی مطلق العنانی میں برطانوی آزادی کی روح بھونک دی، جس نے یہ امر کبھی فراموش نہیں کیا کہ حکومت کا مدعا محکوم کی خوش حالی ہے، جس نے ظالمانہ رسوم موقوف کر دیں، جس نے توہین آمیز امتیازات مٹا دیے، جس نے رائے عامہ کے اظہار کی آزادی بخشی، جس کو ہمیشہ یہ دھن لگی رہی کہ جو قوم اس کے سپرد کی گئی ہے اس کے ذہنی و اخلاقی معیار کو بلند کرے۔

یہ یادگار

اُن اشخاص نے قایم کی ہے جو قومیت، رسم و رواج، زبان اور مذہب میں مختلف ہونے کے باوجود یکساں احترام و احسان مندی کے ساتھ اس کی عافلانہ مصلحانہ اور پدرانہ حکومت کی یاد اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

چھٹا باب

نظامِ تعلیم کی ترقی

۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی لڑائیوں کے اختتام تک برطانوی حکومت ہند کوئی نظامِ تعلیم قائم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی نہ اس پر غور کرنے کا اسے موقع ملا تھا۔ اب تک ملک کے اندر اس کی ساری قوتیں خاص کر اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے میں مصروف تھیں۔ صرف چند عارضی کوششیں باشندگان ملک کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی گئی تھیں۔ ۱۸۱۸ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم ہوا تھا اور ۱۸۹۲ء میں جو نادن ڈکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ان درس گاہوں کا خاص مقصد ہندوستانیوں کی ایک تعداد کو ایسی تعلیم دینا تھا جس کے ذریعے اُسے دھرم شاستر اور شرع اسلام سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ وہ انتظامِ مہدلت کی ضروریات پوری کر سکے اور اسی لیے نصابِ تعلیم بالکل مشرقی تھا۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں چند حکمران رہنما یا گوجان کے زیر نگرانی تھی تعلیم دینے کا فرض محسوس کرنے لگے۔ ان حکمرانوں میں لارڈ ولیمو سبھی شامل تھا جس نے ۱۸۱۸ء کی ایک تحریر میں باشندگان ہند سے متعلق علم کی زوال پذیر حالت پر

اظہار تا مساف کیا۔ اس کے دو سال بعد جب کمپنی کے مشور کی تجدید ہوئی تو ایک لاکھ روپیوں کی رقم (۱۰۰۰۰ روپے) ”ادبیات کے احیاء اور ترقی“ کے لیے عطا کی گئی۔ ہند کی فاضلہ افزائی اور برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے ”مختص کی گئی۔ لیکن اس شخص میں جب کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل باجلاس کونسل نے یہ حکم دیا کہ ”تعلیمات عامہ کی ایک مجلس اس غرض سے مقرر کی جائے کہ رعایا کی تعلیم اور سرکاری تعلیم گاہوں کی حالت کا جو اس کی ترقی کے لیے فایم کی گئی ہو، اندازہ ہو سکے نیز غور و خوض کے بعد حکومت کے سامنے وقتاً فوقتاً ایسی تجاویز پیش کی جائیں جنہیں باشندگان ملک کی بہتر تعلیم ان میں مفید معلومات کی اشاعت اور ان کی اخلاقی روش کی اصلاح کے نظر کرتے اختیار کرنا مناسب معلوم ہو“۔ اس حکم کے نتیجے کے طور پر بڑے بڑے آباد مقامات پر مجالس فایم کی گئیں جن کا کام اسکولوں اور کالجوں کی نذر افسنائی و نگرانی کی بجائے بظاہر منسکرت اور عربی کتابوں کا شایع کرنا تھا۔ اس طریق کار کے اختیار کرنے کی وجہ سٹرزیولیان نے بیان کی ہے جس کا خیال یہ ہے کہ لارڈ ولزلی کے کالج واقع فورٹ ولیم کے اثر سے جو کمپنی کے محروم کی تعلیم کے لیے فایم ہوا تھا، واحد معیار لیاقت سیول سروس کے ارکان کے نزدیک مشرقی علوم کا جاننا قرار پالیا تھا۔ لہذا کلکتہ کے تعلیم یافتہ حلقے نے جس کا کارنامہ حیات بڑی حد تک ایشیاٹک سوسائٹی پر مرکوز تھا جو سر ولیم جونس نے ۱۸۳۰ء میں فایم کی تھی اس زمانے کے تعلیمی انتظام پر اپنا اثر غالب رکھا اور مغربی علوم کی بہ نسبت مشرقی علوم کی ترقی پر زیادہ زور دیا۔

تب بعض واقعات ایسے پیش آئے جن کی بنا پر برطانوی حکومت ہند کو اپنے تعلیمی انتظام پر کمر غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اولاً یہ کہ بعض عیسائی مبلغین احاطہ مدراس میں اور ان کی تعداد سے کچھ کم مبلغین بنگال اور دیگر مقامات پر

۱۔ ”ہندوستان ہندی تعلیم“ مصنفہ سی۔ ای۔ تریولیان (لانگ فس)۔

۲۔ ”ہندوستان ہندی تعلیم“ مصنفہ سی۔ ای۔ تریولیان (لانگ فس)۔

بس گئے تھے۔ ان اشخاص نے ملک کو انگریزی زبان اور مغربی علوم سے روشناس کر دیا۔ شاید ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ڈاکٹر شامرس کا قدیم شاگرد الکترینڈر ڈف تھا جو ۱۸۳۷ء میں کلکتہ پہنچا۔ اس نے تبلیغی کام کے متعلق اپنے پیشرووں سے جو لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے زیادہ تر اپنے وعظ و تلقین پر اعتماد کرتے تھے ایک بالکل مختلف طریق عمل اختیار کرنے کا فوراً فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد جس میں اُسے مہنئی کے ڈاکٹر ورسن کی مدد بھی ملی یہ تھا کہ مناسب تربیت کے ذریعے انسانی دماغ کی مختلف قوتوں اور قابلیتوں کو بیدار کرنے ترقی و تقویت دینے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اور اس غرض کے لیے انگریزی زبان کو موثر ترین آلے کے طور پر استعمال کیا جائے نیز اس ساری تربیت پر جو اس طرح دی جائے سچے مذہب کا گہرا رنگ چڑھایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہر جماعت کے وقت کا کچھ حصہ انجیل کی باقاعدہ تعلیم کے لیے وقف کیا جائے، اس نے رام موہن رائے کی مدد سے ایک عمارت کرایے پر لی اور اپنے مدرسے کا افتتاح کیا۔ ڈف نے ملکی زبانوں کے ساتھ کسی طور پر بے اعتنائی نہیں کی کیونکہ اس کے مدرسے کے کسی لڑکے کو اس وقت تک انگریزی شروع کرنے کی اجازت نہ تھی جب تک وہ اپنی مادری زبان کو آسانی سے نہ پڑھ سکے۔ پس کامیابی فی الفاظ نظر آتی اور ڈف نے اپنے تجربے سے ذریعہ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کے استعمال کی مصلحت اور امکان دونوں کو ثابت کر دکھایا۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے ڈف کے عمدہ کام کی تصدیق الفاظ ذیل میں کی ہے:

میں نے ہمیشہ ہندو کالج کو مفید اغراض کا ایک عظیم ترین ادارہ خیال کیا ہے جو ہندوستان میں ہماری حکومت شروع ہونے کے بعد قائم کیا گیا، لیکن وہ ادارہ بلحاظ افادت آپ کی تعلیم گاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں ہر قسم کی ترقی یافتہ تعلیم کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ میں اب اس خط کو اس سے زیادہ بڑھ کر طویل نہیں دوں گا کہ مجھے آپ کی بجائے کسی اور شخص کی نیک رائے سے زیادہ طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

ڈف، اڈبرائیس ۱۸۴۲ء کی مجلس عام کے انعقاد کے وقت موجود تھا

جب کہ ہندوستانی مبلغین کی حمایت کرنے کا موقع اسے اپنی اس تقریر میں حاصل ہوا تھا تو اس وقت فاکس اور پیٹ کی بہترین تقریروں کی ہم پایہ بھیجی گئی تھی۔ اس تقریر کا بہت زبردست اثر ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف اس چیز کی قدر و قیمت ثابت کر دکھائی جسے مبلغین کا ”نظام تعلیم“ کہا جاسکتا ہے بلکہ ایک ایسی قوم اور مذہب دونوں کی تائید بھی حاصل کر لی جنہوں نے ہندوستان کی تعلیمی ترقی میں ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

ہندوستانیوں میں بھی ترقی پسند مفکرین کا ایک مختصر طبقہ ایسا تھا جس نے یہ پُر زور خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کے ہم وطنوں کو انگریزی تعلیم و تربیت کے فواید سے بہرہ یاب ہونا چاہیے۔ ان مفکرین کی رائے کا بہترین اندازہ حسب ذیل خط سے کیا جاسکتا ہے جو راجہ رام موہن رائے نے لارڈ امبرسٹ کو لکھا تھا۔

میرے معزز لارڈ

* مغربی علوم کا نفاذ

اگرچہ ہندوستان کے باشندے حکومت پر اس کی مرضی کے خلاف ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو کسی سرکاری تجویز کے متعلق وہ رکھتے ہوں غرض نیاز کے ساتھ تامل کرتے ہیں تاہم بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جہاں یہ جذبہ حصولِ مفاہی کے باعث قابلِ گرفت حد تک پہنچ جاتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کو جو ممئی ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے ایسے باشندگان ملک پر حکومت کرنے آتے ہیں جن کی زبان، ادب، طور و طریق، رسم و رواج اور خیالات ان کے لیے بالکل جدید اور غیر مانوس ہوتے ہیں یہاں کے حقیقی حالات سے اس قدر گہری واقفیت، آسانی نہیں ہو سکتی جس قدر خود اس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے۔ پس ہم اپنے فرض کو بالکل ترک کرنے کے خطاوار قرار دیا جائیگا اور اپنی بے حسی کے باعث اپنے حکمرانوں کے سامنے اعتراض کی حقول و جنبش کرینگے اگر ہم اس موجودہ اہم موقع پر انہیں ایسی صحیح معلومات جس کی بدولت وہ بعد

غور و خوض اُن تجسّات و نیز کو اختیار کر سکیں جو ملک کے لیے مفید متصور ہوں بہم نہ پہنچا کر اور اس طرح انہی مقامی علم و تجربے سے ملک کی اصلاح و ترقی کے متعلق ان کے ظاہر کردہ نمیک تصویبوں کی تائید نہ کریں۔

حکومت میں ایک جدید سنسکرت اسکول کا قیام حکومت کی اس قابل تائش خواہش کا مظہر ہے جو ہندوستان کے باشندوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق ہے اور یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کے لیے انہیں ہمیشہ شکر گزار رہنا چاہیے۔ جب اس تعلیم گاہ کی تحریک ہوئی تھی تو ہم نے یہ سمجھا تھا کہ حکومت انگلستان نے ایک کثیر رقم کی منظوری دی ہے تاکہ اس کی ہندوستانی رعایا کی تعلیم پر وہ ہر سال صرف کی جائے۔ ہمارے دل ان حقیقی توقعات سے لبریز تھے کہ یہ رقم ایسے قابل و ماہر تعلیم یورپی اشخاص کو مامور کرنے میں ضرور کی جائیگی جو ہندوستان کے باشندوں کو ریاضی، فلسفہ، طبیعی، کیمیا، علم تشریح الاعضاء اور دیگر مفید علوم سکھائیے جن میں یورپ کی اقوام نے اس درجہ کمال حاصل کیا ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے باشندوں سے بالادتر ہو گئی ہیں۔

جب ہم خوش آئند توقعات کے ساتھ اس نور علم کے منتظر تھے جسے ترقی پذیر قوم میں پھیلانے کا وعدہ کیا گیا تھا تو ہمارے دل خوشی اور شکر گزاری کے مخلوط جذبات سے تر تھے۔ ہم پہلے ہی رب العالمین کا شکر کر چکے ہیں جس نے مغرب کی نہایت فیاض اور روشن خیال اقوام میں یہ عظیم ولولہ پیدا کر دیا کہ وہ ایشیائیں یورپ جید کے علوم و فنون کی بنا ڈالیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت ہند پنڈتوں کے زیر نگرانی ایک سنسکرت اسکول قائم کر رہی ہے جس میں ایسی تعلیم دی جائے گی جو پہلے ہی سے ہندوستان میں رائج ہے۔ اس تعلیم گاہ سے رجوع بلحاظ نوعیت ان تعلیم گاہوں کی سی ہے جن کا وجود یورپ میں لارڈ بیکن کے زمانے سے قبل تھا (صرف یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ جو انوں کے دماغوں کو قواعد زبان کے نکات اور مابعد الطبیعیات کے امتیازات سے بھر دیگی جو سوسائٹی یا صاحب علم کے لیے عملی طور پر مفید نہیں ہو سکتے۔ وہاں طالب علم وہی چیز حاصل کریں گے جو وہ ہزار برس پہلے معلوم تھی اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی لغو

اور پوج باریکوں سے بھی واقف ہو گئے جو مفکرین نے بعد کو پیرا کی ہیں اور ہندوستان کے تمام حصوں میں پہلے ہی سے سکھائی جا رہی ہیں۔

سنسکرت زبان جو اس قدر مشکل ہے کہ اس کے حصول کے لیے تقریباً ساری عمر ورکار ہے صدیوں سے اشاعتِ علم میں افسوس ناک طور پر مزارحہ رہنے کے لیے مشہور چلی آئی ہے اور جو ذخیرہ علم اس غیر ممکن الدخل نقاب میں منور ہے وہ اس کے حصول کی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ضروری سمجھا جائے کہ اس زبان کو اس قیمتی معلومات کی غرض سے جو اس میں شامل ہے زندہ رکھا جائے تو یہ امر ایک جدید سنسکرت کالج قائم کرنے کی بجائے اور طور پر بہت زیادہ آسانی سے انجام پاسکتا ہے کیونکہ ملک کے مختلف حصوں میں سنسکرت کے متعدد معلم ہمیشہ پائے گئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو اس زبان اور دیگر ایسے ادبی مضامین کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں جنہیں جدید تعلیم گاہ کا مقصد قرار دیا جا رہا ہے۔ لہذا ان علوم کی زیادہ محنت کش تعلیم کو بشرطیکہ مناسب سمجھا جائے موثر طور پر اس طرح ترقی دی جاسکتی ہے کہ ان ممتاز ترین معلموں کے لیے انعامات مقرر کرنے کے علاوہ بھتے بھی منظور کیے جائیں جو بطور خود پہلے ہی سے علوم مذکور سکھا رہے ہیں تاکہ اس قسم کے معاوضوں سے انہیں عظیم تر ماسعی کی ترغیب ہو۔

ان خیالات کی بنا پر یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جو رقم ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے لیے مختص کر دی گئی تھی اس کے متعلق حکومت ہند کا منشا یہ تھا کہ وہ اس کی ہندوستانی رعایا کی ترقی میں صرف ہو میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر موجودہ اختیار کردہ تجویز پر عمل کیا گیا تو اس سے مجوزہ مقصد میں سخت ناکامی ہوگی کیونکہ نوجوانوں کو قواعد سنسکرت کے نکات سیکھنے میں بارہ سال صرف کر دینے کی ترغیب دینے سے کسی ترقی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اور نہ کوئی مزید ترقی حسب ذیل قیاس آرائیوں سے ہو سکتی ہے جو دیانت کے ظاہر کردہ مضامین پر مبنی ہیں کہ روح کس طرح الٰہیت میں جذب ہو جاتی ہے اذات الٰہی سے وہ کیا تعلق رکھتی ہے؟ اور نہ نوجوان ویدانت کے ان نظریوں سے موساسٹی کے بہتر افراد بننے کے قابل ہو سکتے جو انہیں

یہ یقین کرتے ہیں کہ تمام مرئی اشیاء کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے اور چونکہ ماں باپ وغیرہ کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتے اس لیے وہ کسی حقیقی محبت کے مستحق نہیں ہیں۔ پس جس قدر جلد ہم ان سے چھٹکارا حاصل کر کے دنیا کا مقابلہ کریں اسی قدر بہتر ہے۔

نیاے شاستر کے طالب علم کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے دماغ نے ترقی کی ہے اگر اس نے یہ معلوم کر لیا ہو کہ دنیا کی اشیاء کتنے خیالی درجوں میں تقسیم کی گئی ہیں اور کیا قیاسی تعلق روح کا جسم سے، جسم کا روح سے یا روح کا کان وغیرہ سے ہے۔

بائیں خیال کہ معزز لارڈ کو ایسے موہوم علم کی جس کی خصوصیت اوپر بیان کی گئی ہے ترغیب کے فائدے کا صحیح اندازہ ہو سکے میں معزز لارڈ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ لارڈ بکن کے زمانے سے پیشتر یورپ کے علم و ادب کی جو حالت تھی اس کا مقابلہ اس کی تحریروں کے بعد کی ترقی علم سے کرنے پر توجہ مبذول کی جائے۔

اگر برطانوی قوم کو حقیقی علم سے محروم رکھنے کا منشا ہوتا تو بکن کے فلسفہ کو علمائے تدیم کے اس طریق تعلیم کو ہٹا کر جگہ نہ دی جاتی جو لاعلمی کو برقرار رکھنے کا ایک طریق آزمائش متصور تھا۔ اسی طرح سنکرت کا نظام تعلیم اس ملک کو ظلمت میں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوتا اگر اسی قسم کا طرز عمل برطانوی جماعت متفہم اختیار کرتی۔ لیکن حکومت کا مقصد ہندوستانی آبادی کی ترقی ہے اس لیے وہ زیادہ فیاضانہ اور اصلاح یافتہ نظام تعلیم کو تقویت دے گی جس میں ریاضی، فلسفہ، طبیعی، کیمیا، علم تشریح الاعضا اور دیگر مفید علوم شامل ہونگے اور یہ تعلیم مجوزہ خم سے اس طرح ہو سکتی ہے کہ یورپ کے تعلیم یافتہ چند قابل و فاضل اشخاص کو امور کیا جائے اور ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جو ضروری کتب، آلات اور دیگر سامان سے آراستہ ہو۔

معزز لارڈ کی خدمت میں یہ معروضہ پیش کرتے ہوئے میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے ایک ایسا سنجیدہ فرض ادا کیا ہے جو میرے ہم وطنوں کی جانب

نیز اس روشن خیال فرمانروا اور جماعت مقننہ کی جانب سے مجید پر عاید ہوتا ہے جنہوں نے اپنا سایہ عاطفت اس دور و دراز سرزمین تک اس تقاضے کو پیش کی بسا پر پھیلارکھا ہے کہ ہندوستانی باشندوں کی اصلاح کی جائے اور اسی لیے عاجزانہ طور پر یہ توقع رکھتا ہوں کہ میں نے معزز لارڈ کی خدمت میں اپنے خیالات کا اظہار جس آزادی کے ساتھ کیا ہے اسے معاف فرمایا جائے گا۔

زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خود برطانوی حکمرانوں نے وہ روش اختیار کر لی جو عیسائی مبلغین اور ہندوستانی معلمین نے پیش کی تھی۔ الفنسٹن اور منرو دونوں نے ہندوستانی طالب علموں کے لیے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے متعلق گہری دلچسپی لی۔ الفنسٹن نے معلوم کر لیا کہ ان عظیم معاشرتی قبائح کا جن میں ملک مبتلا ہو گیا تھا صرف ایک علاج ہے اور وہ تعلیم ہی ہے۔ شاخہ میں بمقام پبلیک سروس کی درسی کتب و مدارس کی ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس کی کارروائیوں کی مثل اب تک الفنسٹن کالج میں موجود ہے گو دیکھ کی غارت گری سے وہ بہت خستہ حالت میں ہے۔ اس انجمن کے ارکان نے اس قسم کا انتظام کیا تھا جو مشرقی علوم کی کتب کے اضافے کے لیے منظور ہوئی تھی۔ ۱۸۲۲ء میں الفنسٹن کی خدمت میں ایک وفد پہنچا جس نے یہ درخواست کی کہ رقم مذکور کا کچھ حصہ ایک مدرسے کے قیام کے لیے وقف کیا جائے۔ گورنر کے جواب کا ایک حصہ جو وسعت نظر اور مقامی حالات کی معلومات کے لحاظ کرتے میکالتے کے جواب سے بہتر معلوم ہوتا ہے ذیل کے اقتباس میں درج کیا جاتا ہے:

*بمبئی میں تسلیم اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حکومت کی امداد ناگزیر ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح بہترین طور پر دیا جاسکتا ہے؟ اس کے دو طریقے ہیں جو غور و خوض کے لیے پیش نظر ہوتے ہیں حکومت ہندوستانیوں کی تعلیم پورے طور پر اپنے ذمے لے سکتی ہے یا اس سوسائٹی کے ذرائع میں

اضافہ کر سکتی اور اس کی مساعی میں تعویت دے سکتی ہے جو پہلے ہی سے اس غرض کے لیے قائم ہے۔ ان دونوں طریق ہائے کار کے انضمام سے غالباً بہترین نتیجہ نکلے گا۔ بہت سی تجاویز جو اشاعت تعلیم کے لیے ضروری ہوں لازماً افراد کی دلی انگلیوں پر منحصر ہوں گی اور حکومت کے احکام سے وہ متاثر نہیں ہو سکتیں۔ پس ان تجاویز تعلیم کی ترقی کا کام سو سائٹی کے سپرد ہونا چاہیے، لیکن بعض تجاویز ایسی بھی ہوں گی جن کے لیے باقاعدہ انتظام کی نیز ان میں خوش اسلوبی اور استقامت کے جس کے وجود کی توقع کسی ایسے منصوبے سے ہو سکتی ہو جس کی کامیابی کا انحصار شخصی کردار پر ہوتا ہے اعلیٰ تر درجے کی ضرورت ہوگی۔ لہذا اس آخری شعبے کا کام حکومت کو اپنے ذمے لینا چاہیے۔

ہندوستانیوں میں اشاعت علم کے لیے ذیل کی اہم تدابیر ناگزیر ہیں:

اول: ہندوستانی مدارس کے طریق تعلیم کی اصلاح کی جائے اور مدارس کی تعداد بڑھائی جائے۔ دوم: ان کے لیے دسی کتب مہیا کی جائیں۔ سوم: ہندوستانیوں کے ادنیٰ طبقوں کو کوئی ایسی ترغیب دی جائے کہ وہ ان ذرائع تعلیم سے جو ان کے لیے مہیا ہوں مستفید ہو سکیں۔ چارم: یورپی علوم اور اعلیٰ تر شعبہ ہائے تعلیم کی اصلاحات سکھانے کے لیے مدارس قائم کیے جائیں۔ پنجم: ہندوستانی نوجوانوں میں اخلاقی و طبیعی علوم کی کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ ششم: انگریزی سکھانے کی غرض سے ان اشخاص کے لیے مدارس قائم کیے جائیں جو اسے ایک مستند زبان کی حیثیت سے نیز یورپی ایجادات کے ذریعہ علم کے طور پر حاصل کرنا چاہیں۔ ہفتم: ان آخری شعبہ ہائے تعلیم کی تحصیل میں ہندوستانیوں کے لیے ترغیبی انعامات مقرر کیے جائیں۔

بہر کیف کسی وقت بھی میری یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ ہندوؤں کا خاص جزو نصاب بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ یقیناً ایک مہل طریقہ ہو گا کہ کسی قوم کے

ذہنی ذخیرہ معلومات میں اضافہ کرنے کی ابتدا اس کے دسی علم و ادب کی تباہی سے کی جائے اور میں یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستانیوں کی آئندہ تعمیل اپنی وسعت و نوعیت میں ترقی کر جائے گی بشرطیکہ ان کے سابق علم میں اس طرح اضافہ ہو کہ ان کی ذاتی و مخصوص خصلت کا رنگ برقرار رہے۔

رام موہن رائے کی یادداشت کو جو اوپر درج کی جا چکی ہے کوئی فوری کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ لارڈ امہرسٹ نے اسے مجلس تعلیم کے حوالے کر دیا اور وہ جواب طلب رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجلس مذکور کے کام میں اس کے ارکان کا باہمی شدید اختلاف مڑا تھا۔ مشرقی جماعت جس میں معتد کھومت مسٹر تھاپی پرنسپ بھی شامل تھا اس امر پر بہت زور دیتی تھی کہ عربی اور سنسکرت کتابوں کو طبع کرنے اور طالب علموں کو عربی کالج کی تعلیم کے لیے اجرت پر طلب کرنے کا قدیم طریقہ جاری رہنا چاہیے۔ مخالف جماعت مساوی قوت و شدت کے ساتھ یہ کہتی تھی کہ کلاس کی آمدنی خاص کر ایسے مدارس کے قیام کے لیے وقف کر دینی چاہیے جہاں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ ایک طویل مدت تک دونوں جماعتوں میں برابر تقرب رہی۔ آخر کار لارڈ ولیم ہنٹنگ کا اثر اور خصوصاً میکالے کا اثر جو اولین رکن قانون کی حیثیت سے ہندوستان آچکا تھا اور مجلس تعلیم کی صدارت پر کارفرما تھا انگریزی زبان کی حامی جماعت کی بنیادیں مستحکم کا باعث ہوا۔ اس تصفیے کی اہم نوعیت کے نظر کرتے ہم میکالے کی مشہور یادداشت کھومت کی تجویز جو جدید تغیر کو وضع کرتی ہے اور الگزینڈر ڈف کی عہدہ رائے جو اس کی اہمیت اور قیود سے متعلق ہے ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

* نظام تعلیم میں ایک اہم تغیر | چونکہ بعض اصحاب کی مجلس تعلیمات عامہ کے ارکان ہیں یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ

جس طریقے پر وہ اب تک عمل پیرا رہے ہیں وہ من و عن ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کی جانب سے مقرر ہوا تھا اور اگر رائے مذکور صحیح ہو تو اس میں تغیر کرنے کے لیے مجلس وضع قوانین کے آئین کی ضرورت ہوگی اس لیے میں نے یہ مناسب خیال کیا ہے کہ ان مخالف بیانات کی تائید میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں کوئی مضد لینے سے باز رہوں اور اس معاملے پر اپنے اظہار رائے کو اس وقت تک محفوظ رکھوں جب تک کہ رکن مجلس ہند کی حیثیت میں میرے آگے وہ پیش نہ ہو۔

۲۔ میں نہیں سمجھتا کہ پارلیمنٹ کے قانون کی کسی ترکیب سے ایسی تعبیر کی جاسکتی ہے جیسی کہ کی گئی ہے۔ اس میں مخصوص زبانوں یا علموں کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایک رٹھم ادبیات کے احیاء و ارتقاء، تعلیم یافتہ باشندگان ہند کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے مختص کی گئی ہے۔ استدلال یہ کیا جاتا ہے بلکہ یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ادبیات سے پارلیمنٹ صرف عربی اور سنسکرت ادب مراد لے سکتی ہے اور یہ کہ وہ کس بھی تعلیم یافتہ ہندوستانی کا معزز لقب ایسے ہندوستانی کو نہ دینی جو ملٹن کی شاعری، لاک کے علم مابعد الطبیعیات اور نیوٹن کے علم طبیعیات سے واقف ہو بلکہ اس نام سے اس کا مقصد صرف ایسے اشخاص کو موسوم کرنے کا تھا جنہوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں خس کے تمام نواید اور دیوتا کی ذات میں ضم ہو جانے کے تمام اسرار کا مطالعہ کیا ہو۔ یہ تاویل قطعاً قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتی۔ اسی قسم کی ایک مثال لیجئے: فرض کیجئے کہ مصر کا پاشا جس کے ملک کو کسی زمانے میں بلحاظ علوم اقوام یورپ پر فوقیت حاصل تھی مگر جو اب ان کے درجے سے بہت نیچے گر گیا ہے ایک رٹھم ادبیات کے احیاء و ارتقاء اور تعلیم یافتہ باشندگان مصر کی حوصلہ افزائی کی غرض سے مختص کر دے تو کیا کوئی شخص نتیجہ نکالے گا کہ اس کا مشابہ تھا کہ اس کی سلطنت کے نوجوان ہیر و غلیف کی تحصیل میں اور ان تمام نظریوں کی ترقی میں

جوازیر کے قصبے میں پوشیدہ ہیں نیز ممکنہ صحت کے ساتھ ان رسوم کو معلوم کرنے میں جن کے ساتھ قدیم زمانے میں بی اور پیاز کی پرستش کی جاتی تھی کئی سال صرف کر دیں؟ کیا اس پر جائز طور سے تباین کا الزام عاید کیا جاسکتا ہے اگر وہ اپنی نوجوان رعسایا کو چہار گوشہ مناروں کی تشریح کے لیے مامور کرنے کی بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی نیز ان تمام علوم کی جن کی خاص کلیدیں مذکورہ زبانیں میں تعلیم دینے کا حکم صادر کرے؟

۳۔ جن الفاظ پر طریق قدیم کے مؤدین نے تکیہ کیا ہے وہ ان کی تائید نہیں کرتے اور دیگر متعاقب الفاظ ایسے ہیں جو دوسری جانب بالکل فیصلہ کن معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیوں کی یہ رقم نہ صرف ہندوستان میں ادبیات کے احیاء کے لیے جس فقرے پر ان کی ساری تاویل مبنی ہے بلکہ ”برطانوی مملکت کے باشندوں میں مختلف علوم کی ترویج و ترقی کے لیے“ بھی مختص کی گئی ہے اور یہ متعاقب الفاظ بجنسہ ان تمام تغیرات کو جسائز قرار دینے کے لیے کافی ہیں جن پر میں زور دے رہا ہوں۔

۴۔ اگر کونسل کو میری توضیح سے اتفاق ہو تو کوئی جدید قانون وضع کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر وہ مجھ سے اختلاف رکھتی ہے تو میں ایک مختصر قانون کی تحریک کرنا ہوں جو ۱۸۳۷ء کے منشور کے اس فقرے کو منسوخ کر دیگا جس کے باعث بحیثیت گئی پیدا ہوتی ہے۔

جس استدلال پر میں بحث کر رہا ہوں اس سے صرف طریق کارروائی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی طریق تعلیم کے مداحوں نے ایک اور استدلال پیش کیا ہے جسے ہم معقول تسلیم کر لیں تو ہر قسم کے تعمیر کا وہ قطعی مخالف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرکاری عہد و پیمان موجودہ طریق تعلیم کا یا بند ہو گیا ہے اور کسی مخصوص رقم میں تبدیلی کرنا جو اب تک عربی اور سنسکرت کی تعلیم کی ترغیب میں صرف ہوتی رہی ہے اس کی صریح خلاف ورزی ہوگی یہ سمجھنا آسان نہیں ہے کہ کس طریق استدلال سے وہ اس نتیجے پر پہنچ سکے ہوں گے۔ محاصل ملکی سے جو رقم ادبیات کی ترغیب کے لیے منظور کی جاتی ہے

وہ کسی طرح اس قسم کی منظوری سے مختلف نہیں ہو سکتی جو انہیں محاصل سے حقیقی یا فرضی فائدے کی دیگر اغراض کے لیے دی گئی ہو۔ ہم نے ایک صحت گاہ ایسے مقام پر قایم کی جسے ہم صحت بخش تصور کرتے ہیں تو اس بنا پر کیا ہم اپنے کو اس امر کا پابند بناتے ہیں کہ ہم اس صحت گاہ کو وہاں پر قرار دیں خواہ اس کے نتائج ہماری توقعات کے مطابق نہ ہوں؟ ہم کسی پل کے ستون کی تعمیر شروع کرتے ہیں تو کیا اس کام کو روک دینا سرکاری عہد و پیمان کی خلاف ورزی ہوگی اگر ہمیں بعد کو یہ یقین کرنے کی وجہ نظر آئے کہ تعمیر بے سود ہوگی؟ حقوق ملکیت بے شبہہ قابل احترام ہیں، لیکن ان حقوق کو کوئی چیز اس قدر خطرے میں نہیں ڈالتی جس قدر غیر متعلق اشیاء انہیں منسوب کرنے کا رواج جو اب بدقسمتی سے بہت عام ہو گیا ہے۔ جو اشخاص قبائح سے احترام ملکیت کو ملوث کرتے ہیں وہ درحقیقت مسئلہ ملکیت کو اسی قدر ملبھون اور کم زور کرتے ہیں جس قدر خود وہ قبائح ہوتی ہیں۔ اگر حکومت نے کسی شخص کو سہی طور پر یقین دلایا ہو یا حکومت نے کسی شخص کے دل میں کوئی مقول وقوع پیدا کر دی ہو کہ وہ سنسکرت یا عربی کے معلم یا طالب علم کی حیثیت سے کچھ آمدنی پائے گا تو میں اس شخص کے مالی مفاد کا احترام کروں گا۔ میں افراد کے ساتھ فیاضانہ سلوک میں تساہل کروں گا مگر سرکاری عہد و پیمان پر کوئی اعتراض وارد ہونے کا موقع نہ دوں گا۔ لیکن یہ کہنا کہ حکومت نے بعض زبانیں اور علوم سکھانے کا عہد کر لیا ہے خواہ وہ زبانیں بے فائدہ ہو گئی ہوں اور خواہ وہ علوم ترک کر دینے کے قابل ہوں مجھے بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ کسی سرکاری دستاویز میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حکومت ہند نے کبھی اس معاملے پر کوئی عہد کرنے کا منصوبہ کیا یا کبھی اس قسم کے مصروف کو غیر منفی طور پر معین سمجھا۔ لیکن اس کے خلاف بھی کوئی عمل ہوتا تو میں اپنے پیشرووں کے اس اختیار سے انکار کرتا کہ وہ ہمیں اس قسم کے معاملے میں کسی عہد کا پابند کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک حکومت گزشتہ صدی میں نہایت سنجیدہ طور پر حکم دیتی کہ

اس کی تمام رعایا بہر مدت مقررہ کے اختتام پر چھپک کا ٹیکہ لیا کرے تو کیا وہ حکومت چینی کے اختراع کے بعد بھی اس عمل کو جاری رکھنے کی پابند ہوتی؟ یہ وعدے جن کے ایفا کا کوئی شخص دعویدار نہیں اور جن سے کوئی شخص نجات نہیں دلا سکتا، یہ منتقل حقوق جو کسی شخص کو حاصل نہیں یہ ملکیت جس کا کوئی مالک نہیں یہ چوری جس سے کوئی شخص زیادہ مفلس نہیں بنتا یہ ساری چیزیں ایسے ہی اشخاص کی سمجھ میں آسکتی ہیں جو مجھ سے اعلیٰ تر قوت اور اک رکھتے ہیں۔ میں مذکور بالا استدلال کو محض ایسے الفاظ کی ایک مہین شکل خیال کرتا ہوں جو انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ ہر اس برائی کی حمایت میں باقاعدہ استعمال کیے جاتے ہیں جس کے لیے کوئی دوسرا عذر قایم نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ میں یہ قرار دیتا ہوں کہ ایک لاکھ روپیوں کی یہ رقم کسی ایسے طریقے پر جو مناسب ترین سمجھا جاتا ہو ہندوستان میں ترقی علوم کی غرض کے لیے صرف کرنا بالکل ہیہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے اختیار میں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ معزز لارڈ یہ حکم دیئے ہیں کہ رقم مذکور آئندہ عربی اور منکرت کی ترغیب کے لیے استعمال نہ کی جائے بالکل اسی طرح آزاد ہیں جس طرح یہ حکم دیئے ہیں کہ میسور میں شیروں کے شکار کا انعام کم کر دیا جائے یا عبادت خانے میں راگ الاپنے پر آئندہ کوئی سرکاری رسم صرف نہ کی جائے۔

۶۔ اب ہم اصل مطلب پر آتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک رقم ہے جو حکومت کی ہدایت کے مطابق اس ملک کے باشندوں کی ذہنی ترقی کے لیے استعمال کی جائیگی۔ سادہ سوال یہ ہے کہ اس کا استعمال کا مفید ترین طریقہ کیا ہے؟

۷۔ تمام فرقے اس ایک امر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کے اس حصے کے باشندوں میں جو زبانیں عام طور پر بولی جاتی ہیں ان میں ادبی معلومات۔ بے نہ علمی اور علاوہ بریں وہ اس قدر کم مایہ اور ناشائستہ ہیں کہ جب تک انہیں کسی دوسرے ملک کی زبان کے ذریعے ترقی نہ دی جائے

ان میں کسی قابل قدر تصنیف کا ترجمہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ یہ امر عام طور پر مسلم معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کے ان طبقوں کی ذہنی ترقی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع رکھتے ہیں فی الحال صرف کسی ایسی زبان کے ذریعے ہو سکتی ہے جو ان کی بول چال کی زبان نہ ہو۔

۸۔ پھر وہ زبان کو نسی ہوگی؟ اگر کان مجلس کی نصف تعداد کا خیال ہے کہ وہ انگریزی ہونی چاہیے۔ باقی نصف تعداد عربی اور سنسکرت کی پُر زور سفارش کرتی ہے۔ مجھے پورا سوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ کو نسی زبان بہترین طور پر قابل حصول ہے؟

۹۔ سنسکرت جانتا ہوں نہ عربی۔ لیکن میں نے ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اپنی امکانی حد تک کوشش کی ہے۔ میں نے نہایت مشہور عربی اور سنسکرت کتب کے تراجم پڑھے ہیں۔ میں نے یہاں اور وطن میں دونوں جگہ ایسے اشخاص سے گفتگو کی ہے جو مشرقی زبانوں کے باہر ہونے کے باعث ممتاز ہیں۔ میں مشرقی علوم کو خود مشرقیوں کی آنکھوں پر قیمت پر قبول کرنے کے لیے بائبل آمادہ ہوں۔ ان میں سے مجھے ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو اس امر سے انکار کر سکے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی ایک الماری ہندوستان اور عرب کے تمام مقامی ادب کے مساوی ہے۔ مغربی ادب کی حقیقی فوقیت کو فی الواقع ان ارکان مجلس نے کامل طور پر تسلیم کر لیا ہے جو مشرقی طریق تعلیم کی حمایت کرتے ہیں۔

۱۰۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ مشرقی مصنفین کو

ادبیات کے جس شعبے میں اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے وہ شاعری ہے۔ یقیناً کوئی ایسا مشرقی مجھے کبھی نہیں ملا جسے یہ کہنے کی جرأت ہو کہ یورپی اقوام عظیم کی شاعری سے عربی اور سنسکرت شاعری کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ہم تصوریات سے گزر کر ایسی تصانیف کی طرف آتے ہیں جن میں حقائق مندرج ہوں اور عام اصول کی تشریح موجود ہو تو یورپی اقوام کی فوقیت بالکل ناقابل اندازہ ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ

تمام تاریخی مواد جو سنسکرت زبان کی تمام کتب سے جمع کیا گیا ہے اس قدر قیمتی نہیں ہے جس قدر وہ مواد جو ابتدائی مدارس انگلستان کی نہایت معمولی و مختصر کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ طبعی یا اخلاقی فلسفہ کی ہر شاخ میں دونوں قوموں کی اضافی حیثیت تقریباً یکساں ہے۔

۱۱۔ پھر صورت معاملہ کیا ہے؟ ہمیں ایک ایسی قوم کو تعلیم دینی ہے جسے فی الحال اس کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ جس کوئی غیر زبان اسے سکھانی جاسیے۔ ہماری زبان کی برتری کا یہاں اعادہ کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ مغرب کی زبانوں میں بھی ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس میں تصورات کی بہتات ہے جس کا پایہ ان بہترین تصانیف سے کم نہیں ہے جو یونان نے ہمارے لیے بطور میراث چھوڑی ہیں اس میں فصاحت و بلاغت کے ہر قسم کے نمونے موجود ہیں اس میں ایسے تاریخی حالات ہیں جو محض حکایات تصور ہونے کے لحاظ سے شاذ ہی کم مایہ گردانے گئے ہوں مگر اخلاقی و سیاسی تعلیم کے وسائل قرار پانے کے لحاظ سے کسی زبان نے کبھی ان کی ہمسری نہیں کی ہے اس میں انسانی حیات و فطرت کے صحیح اور جیتے جاگتے مرقعے بکثرت ہیں اس میں مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، حکومت، اصول قانون اور تجارت کے متعلق عمیق ترین تحقیقات مجتمع ہیں اور اس میں ان تمام تجربی علوم کے متعلق کامل اور صحیح معلومات کا ذخیرہ ہے جن سے انسان کی فطرت کی حفاظت، راحت میں اضافہ یا ذہنی قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ جو شخص اس زبان کو جانتا ہے اس کی فوری رسائی اس ساری ذہنی دولت تک ہو سکتی ہے جو کہ ارض کی تمام فرزانہ اقوام نے نوے پشتوں سے پیدا کر کے جمع کی ہے۔ بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں جو ادب اس وقت موجود ہے وہ اس تمام ادب سے زیادہ با وقعت ہے جو تین سو سال قبل بحیثیت مجموعی دنیا کی تمام زبانوں میں موجود تھا اور یہی سب کچھ نہیں بلکہ ہندوستان میں انگریزی ایسی زبان ہے جو حکمران طبقہ بولتا ہے۔ دارالحکومتوں میں ہندوستانیوں کا اعلیٰ طبقہ بھی انگریزی

بولتا ہے۔ تمام مشرقی سمندروں میں اس کا تجارتی زبان بن جانا ممکن ہے۔ وہ دو بڑے یورپی فرقوں کی زبان ہے جن میں سے ایک جنوبی افریقہ میں اور دوسرا آسٹریلیا میں بڑھتی کر رہا ہے اور یہ ایسے فرقے ہیں جو ہر سال زیادہ با وقعت اور ہماری سلطنت ہند کے ساتھ زیادہ مربوط ہونے جا رہے ہیں۔ خواہم اپنے ادب کی اصلی قدر و قیمت پر نظر رکھیں خواہ اس ملک کی مخصوص حالت کو دیکھیں ہمیں یہ خیال کرنے کی قوی ترین وجہ نظر آئیگی کہ تمام غیر ملکی زبانوں میں انگریزی ہی وہ زبان ہے جو ہماری ہندوستانی رعایا کے لیے نہایت مفید ہوگی۔

۱۲۔ اب ہمارے سامنے سوال صرف یہ ہے کہ جب انگریزی زبان کی تعلیم ہمارے اختیار میں ہے تو کیا ہم ایسی زبانوں کی تعلیم دینگے جن میں مسلم طور پر کسی مضمون سے متعلق ایسی کتب نہیں ہیں جو ہماری کتب کا متبادل کر سکیں جب ہم مغربی علوم سکھا سکتے ہیں تو کیا ہم ایسے علوم کی تعلیم دینگے جو یورپی علوم سے جہاں کہیں اختلاف رکھتے ہیں وہ یقیناً غلطی ہی پر مبنی ہوتا ہے اور جب ہم صحیح فلسفہ اور حقیقی تاریخ کی حمایت کر سکتے ہیں تو کیا ہم سرکاری مصارف سے ایسے طبی نظریوں کی قدر افزائی کریں گے جو ایک انگریز بھٹار کے لیے باعث ننگ ہوں یا ایسے علم نجوم کو رو کر کھینکے جو کسی انگریزی مدرسے کی لڑکیوں میں مضحکہ خیز ہو گا یا ایسی تاریخ کی تعلیم دینگے جو تین فیٹ کے قد اور بادشاہوں اور تین ہزار سال کی طویل حکومتوں کے تذکرے سے معمور ہو یا ایسا جملہ سکھائیے جو شیرے اور مسکے کے سمندروں سے مرکب ہو۔

۱۳۔ ہماری رہنمائی کے لیے تجربہ موجود ہے۔ تاریخ میں ایک ہی قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں اور وہ سب کی سب ہیں ایک ہی سبق پڑھاتی ہیں۔ ماضی سے قطع نظر کہ کسے حال ہی کے زمانے کو لیجئے جس میں ایسے ممالک کی دو مثال یا دو گار مثالیں موجود ہیں جہاں ایک پوری سوسائٹی کے دل و دماغ کو خوب متاثر کیا گیا، تصعبات کو مٹا دیا گیا، علم پھیلا دیا گیا، مذاق کو پاک و صاف کر دیا گیا اور علوم و فنون کی بنا ٹھال دی گئی حالانکہ ممالک مذکور حال حال تک جہالت اور حیوانیت میں مبتلا تھے۔

۱۴۔ پہلی مثال جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے مغربی اقوام میں علوم کے اُس احیائے عظیم کی ہے جو ہندو عہد کی او آخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اس زمانے میں تقریباً ہر چیز جو قابل مطالعہ تھی یونانی اور رومی متقدمین کی تحریروں میں موجود تھی۔ اگر ہمارے آبا و اجداد اسی طرح عمل کرتے جس طرح مجلس تعلیمات عامہ نے اب تک کیا ہے اگر وہ نحو سی ڈاڈس اور افلاطون کی زبان کو اور سسرو اور سیسیٹس کی زبان کو نظر انداز کر دیتے اگر وہ اپنی توجہ کو ہمارے جزیرے کی قدیم زبانوں تک محدود رکھتے اگر وہ اینگلو سیکسن تاریخوں اور نارمن فرانسیسی افسانوں کے سوا کچھ اور شائع کرتے نہ اپنی جامعات میں کوئی تعلیم دیتے تو کیا انگلستان کی وہ حیثیت جو اب پائی جاتی ہے کبھی ہو سکتی تھی؟ تو را اور آشام کے سمعہروں کے حق میں یونانی اور لاطینی زبانیں جس قدر مفید تھیں اسی قدر ہندوستانی باشندوں کے حق میں ہماری زبان مفید ہے۔ اب انگلستان کا ادب مستند قدیم ادب کی یہ نسبت زیادہ با وقعت ہے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ سنسکرت ادب اسی طرح قابل قدر ہو سکتا ہے جس طرح ہمارے سیکسن اور نارمن اسلاف کا ادب تھا۔ بعض شعبوں میں مثلاً تباہیخ میں مجھے یقین ہے وہ بہت کم مایہ ہے۔

۱۵۔ دوسری مثال کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گزشتہ ایک سو بیس سال کی مدت میں ایک قوم جو زمانہ سابق ایسی حشیانہ حالت میں رہ چکی تھی جیسی محاربات صلیبی سے قبل ہمارے آبا و اجداد کی تھی رفتہ رفتہ اس جہالت سے جس میں وہ مبتلا تھی باہر نکل آئی اور اس نے ہند اقوام میں اپنی جگہ حاصل کر لی۔ اس قوم سے میری مراد روس کی قوم ہے اب اس ملک میں ایک بڑا تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس میں ایسے اشخاص کی افراط ہے جو سلطنت کی اعلیٰ ترین خدمات بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور جو کسی طرح بھی اُن باکمال ہستیوں کے مقابلے میں کم پایہ نہیں ہیں جن سے پیرس اور لندن کے بہترین طبقوں کو زینت ہے۔ اس توقع کی گنجائش ہے کہ یہ وسیع سلطنت جس کا رتبہ ہمارے اجداد کے زمانے میں شاید پنجاب سے بھی گرا ہوا تھا ہمارے

پوتوں کے زمانے میں رفتار ترقی کے لحاظ سے فرانس اور برطانیہ کے لگ بھگ ہو جائیگی۔ مذکور بالا تفسیر کس طرح عمل میں آیا؟ وہ قومی تقصبات کو اگسا نے سے نہیں، نوجوان باشتندگان ماسکو کے دماغوں میں بڑی بڑیوں کی کہانیوں کو جن پر ان کے جاہل اجداد یقین رکھتے تھے بھرنے سے نہیں، سنیٹ کوکس کے متعلق جھوٹی روایتوں کو ان کے سروں میں داخل کرنے سے نہیں، انہیں اس مسئلہ عظیم پر کہ آیا دنیا ۱۳ ستمبر کو پیدا کی گئی یا نہیں غور و خوض کرنے کی ترغیب دینے سے نہیں اور جب وہ ان تمام تعلیمی امور پر حاوی ہو چکے ہوں تو انہیں ”تعلیم یافتہ روسی“ کہنے سے نہیں بلکہ انہیں ان غیر زبانوں کے سکھانے سے جن میں معلومات کا عظیم ترین ذخیرہ جمع تھا اور اس طرح ان کی رسائی اس ذخیرہ معلومات تک کر دینے سے وہ (تفسیر) عمل میں آیا تھا۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو جذب بنایا، مجھے اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ زبانیں ہندوؤں کو سبھی اسی طرح شایستہ بنائیگی جس طرح انہوں نے تاتاریوں کو بنایا ہے۔

۱۶۔ وہ دلائل کیا ہیں جو اس طریقے کے خلاف پیش کی جاتی ہیں جس کی تائید نظریہ اور تجربہ دونوں سے ہوتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہم ہندوستانی رعایا کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور یہ تعاون ہم صرف سنسکرت اور عربی پڑھانے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۷۔ میں یہ کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ایک قوم جو اعلیٰ درجے کے دماغی اوصاف سے متصف ہو کسی ایسی قوم کی تعلیم کی نگرانی اپنے ذمے لیتی ہے جو نسبتہ جاہل ہو تو طالب علم بالکل اس طریق تعلیم کو مقرر کرے جسے جو معلموں کو اختیار کرنا چاہیے۔ بہر حال اس معاملے کی نسبت کچھ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ناقابل تردید شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فی الحال ہم ہندوستانیوں کا تعاون حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بڑی بددلتی ہوگی کہ ان کی ذہنی صحت کو قربان کر کے ان کے ذہنی رجحان کو ٹھنڈا رکھا جائے۔ لیکن ہم ان دونوں چیزوں میں سے کسی کا بھی پاس نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انہیں ایسے علم سے روک رہے ہیں

جوان کے نزدیک مرغوب ہے اور ایسا جھوٹا علم ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں جیسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔

۱۸۔ مذکور بالا امر اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم عربی اور سکرٹ کے طلبہ کو ولٹا ایف عطا کرنے پر مجبور ہیں اور جو طلبہ انگریزی سیکھتے ہیں وہ ہمیں اجرت تعلیم ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہندوستانی اپنی مقدس زبانوں سے جو محبت اور ایمان کا جو احترام کرتے ہیں اس کے متعلق دنیا کی لٹاٹھی کسی غیر جانب دار شخص کی رائے میں اس ناقابل تردید واقعے سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتی کہ ہمیں اپنی ساری وسیع سلطنت میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں ملتا جو ہم سے مذکورہ زبانوں کی تعلیم پانے کے لیے تیار ہو جو ہر اس صورت کے کہ ہم اسے تعلیم پانی کا معاوضہ دیں۔

۱۹۔ اس وقت میرے سامنے مدرسے کے حسابات ایک ماہ بابت دسمبر ۱۸۳۲ء موجود ہیں۔ عربی کے طالب علم تعداد میں، معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب سرکاری وظیفے پاتے ہیں۔ کل رقم جو انہیں دی جاتی ہے ہر ماہ پانچ سو روپیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس حساب کی دوسری جانب حسب ذیل مدد قائم ہے:

انگریزی کے سابق طلبہ سے گزشتہ ماہ مئی و جون و جولائی کی بابت حاصل کردہ رقم جو نہا شدنی ہے۔ ۱۰۳ روپے۔

۲۰۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ محض منگامی تجربے کی کمی کا باعث ہے کہ مجھے مذکور بالا حالات پر تعجب ہوتا ہے اور یہ کہ ہندوستان کے طلبہ کا یہ طریقہ ہی نہیں کہ وہ اپنے مصارف سے تعلیم حاصل کریں۔ اس بیان سے میرے خیالات کتنی توثیق ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز قابل یقین نہیں ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں انسانوں کو ایسا کام کرنے کے لیے جسے وہ خوشگوار اور مفید سمجھیں اجرت دینا بھی لازم نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدے سے ہندوستان مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کو جب وہ بھوکے پیوں چاول کھاتے یا موسم سرما میں ادنیٰ کپڑے پہننے کے لیے کوئی رقم لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خیر ہمارے پیش نظر معاملے کے زیادہ قریب آئیے: دیہی کتب کا مدرس ان بچوں کو جو اس سے اسجد اور کچھ ابتدائی حساب سیکھتے ہیں کوئی اجرت نہیں دیتا بلکہ انہیں تعلیم دینے کی اجرت اسے دی جاتی ہے۔ پھر جو اشخاص سنسکرت اور عربی آسکھتے ہیں انہیں اجرت دینا کیوں لازم ہے؟ مگر اس لیے کہ عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں جن کا علم اس فحنت کا کافی معاوضہ نہیں ہوتا جو ان کے حصول میں کی جاتی ہے۔ ایسے تمام امور کے متعلق بازار کی حالت سے قطعی آزمائش ہو کرتی ہے۔

۲۱۔ اگر کسی اور نبوت کی ضرورت ہو تو اس کی کچھ کمی نہیں ہے۔ گزشتہ سال سنسکرت کالج کے کئی قدیم طالب علموں کی جانب سے مجلس کے پاس ایک درخواست پیش ہوئی تھی۔ درخواست گزاروں نے لکھا تھا کہ انہوں نے دس بارہ سال کالج میں تعلیم پائی، ہندو ادب اور علوم سے واقفیت حاصل کی اور قابلیت کے اسناد بھی حاصل کر لیے۔ اس ساری محنت کا پھل کیا ہے؟ وہ کھتے ہیں کہ ”ان اسناد کے باوجود معزز مجلس کی مہر آمیز اعانت کے بغیر ہماری حالت کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اس بے اعتنائی کے باعث جو ہمارے ہم وطن عام طور پر ہمارے ساتھ روا رکھتے ہیں ان کی جانب سے کسی قسم کی امداد یا حوصلہ افزائی کی کوئی توقع نہیں رہی ہے۔“ لہذا وہ استدعا کرتے ہیں کہ گورنر جنرل کی خدمت میں انہیں سرکاری خدمات دینے کی سفارش کی جائے۔ یہ خدمات اعلیٰ اعزاز یا بڑی آمدنی کی نہیں بلکہ ایسی ہوں جو محض ان کی زندگی کو برقرار رکھ سکیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”ہم اپنی شریفانہ زندگی اور تدریجی ترقی کے لیے توسل کی ضرورت ہے جو کسی طرح ہم اس حکومت کی اعانت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے جس نے ہمیں سے ہماری پرورش کی اور ہمیں تعلیم دی۔“ وہ نہایت درد انگیز پیرائے میں اپنی درخواست اس امر کے اظہار پر ختم کرتے ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ حکومت کا کبھی یہ نشانہ نہیں رہا کہ وہ ان کی تعلیم کے زمانے میں ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کر کے آئندہ انہیں منطقی اور کس پیرسی کی حالت میں چھوڑ دے۔

۲۲۔ میں حکومت کے نام معاوضے سے متعلق متقدم درخواستیں دیکھتا رہا ہوں۔ وہ تمام درخواستیں بلکہ ان میں سے نہایت غیر معقول درخواستیں بھی اس مفروضے پر مبنی تھیں کہ کچھ نقصان اٹھایا گیا ہے اور نا انصافی کی گئی ہے۔ یہ یقیناً پہلے درخواست گزار ہیں جنہوں نے اس بنا پر معاوضہ طلب کیا ہے کہ انہیں مفت تعلیم دی گئی سرکاری رقم سے بارہ سال تک ان کی مدد کی گئی اور پھر انہیں علوم و فنون سے خوب واقف ہونے کے بعد دنیاے عمل میں بھیجا گیا۔ وہ اپنی تعلیم کو ایک ایسا ضرر ظاہر کرتے ہیں جس سے انہیں یہ حق پیدا ہونا ہے کہ حکومت سے داؤد اٹھائی کی جائے نیز وہ اسے ایک ایسا ضرر بیان کرتے ہیں جس کے عائد کرنے کے دوران میں جو وظائف انہیں دیے گئے ان سے اس کی کافی تلافی نہیں ہوئی، اور مجھے اس میں شبہ نہیں کہ وہ حق بجانب ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایسی تعلیم کی تحصیل میں صرف کیے جس سے انہیں روٹی مل سکتی ہے نہ عزت۔ جو رقم ان اشخاص کو ناکارہ اور مصیبت زدہ بنانے میں صرف ہوئی اسے یقیناً ہم بہتر غرض کے لیے محفوظ کر سکتے تھے۔ یقیناً اس سے کسی قدر کم سرکاری خرچ پر ایسے اشخاص کو تعلیم دی جاسکتی جو حکومت کے لیے بارگراں اور ہمسایوں کے نزدیک قابل نفرت ہوں۔ لیکن ہماری روش ہی ایسی ہے کہ ہم صدق اور کذب کے باہمی مقابلے میں غیر جانب دار رہنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ہم ہندوستانیوں کو انھیں کے موروثی تعصبات کے زیر اثر چھوڑنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان فطری دشواریوں میں جو مشرقی علوم کی راہ ترقی میں مزاحم ہیں ہم اپنی پیدا کردہ عظیم دشواریوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ایسے علیے اور وٹھے جو حق کے فروغ کے لیے بھی نہ دیے جاتے چاہیں ہم غلط آزمائش اور باطل فلسفہ پر صرف کرتے ہیں۔

۲۳۔ اس طرح عمل کرنے سے ہم وہی قباحت پیدا کرنے ہیں جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ ہم ایسی مخالفت کر رہے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ ہم عربی اور سنسکرت کالجوں پر صرف کرتے ہیں وہ محض حق کے معاملے میں ایک نقصان عظیم ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی فیاضانہ رحم ہے جو حامیان اغلاط

کے پیدا کرنے میں صرف کی جا رہی ہے۔ وہ نہ صرف عاجز اور کاہل اشخاص کا ایک گروہ پیدا کر رہی ہے بلکہ ایسے متعصب اشخاص کا بھی جو جذبات اور اغراض سے یکساں طور پر متاثر ہو کر ہر مفید منصوبہ تعلیم کے خلاف مدائے احتجاج بلند کر دیتا۔ اگر میرے پیش کردہ تغیر کے متعلق ہندوستانیوں کی جانب سے کوئی مخالفت ہو تو وہ ہمارے ہی نظام تعلیم کا نتیجہ ہوگی۔ اس مخالفت کے بانی وہی اشخاص ہونگے جنہوں نے ہمارے ولیفوں کی مدد سے ہمارے کالوں میں تعلیم پائی۔ جس قدر زیادہ مدت تک ہم اپنے موجودہ طرز پر قائم رہینگے اسی قدر آزیادہ خطرناک ان کی مخالفت ہو جائیگی اور ان میں سال بسال زنگروٹوں کی بھرتی ہوتی جائیگی جنہیں ہم وظایف دیا کریں گے ہندوستانی سوسائٹی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس سے ہمیں مشکلات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ ساری شکایت کا باعث مشرقی علوم کا وہ رجحان ہو گا جسے ہم نے مصنوعی ذرائع سے پیدا کیا اور پال کر قوی بنایا ہے۔

۲۴۔ ایک واقعہ اور ہے جو تنہا اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ہندوستانی رعایا کا احساس جب اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے ایسا نہیں ہوتا جیسا قدیم نظام تعلیم کے حامی اسے ظاہر کرتے ہیں۔ مجلس نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک لاکھ روپیوں سے زائد رقم عربی اور سنسکرت کتابوں کی چھپائی کے لیے مختص کر دی جائے۔ ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں ملتا۔ یہ بہت شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک نسخہ فروخت ہو جائے ۲۳ ہزار جلدیں جن میں سے اکثر بڑی اور چھوٹی تقطیع کی ہیں اس مجلس کے کتب خانوں بلکہ انبار خانوں میں بھری پڑی ہیں۔ مجلس اپنے مشرقی ادب کے عظیم ذخیرے سے کتابیں بخش دے کہ اس کا کچھ حصہ خارج کرنے کی تدبیر کر رہی ہے لیکن کتابیں اس قدر جلد وہ نہیں دے دے سکتی جس قدر جلد انہیں وہ طبع کرتی ہے۔ تقریباً بیس ہزار روپے سالانہ ردی کا خدات کے تازہ ڈھیر کا اس انبار میں اضافہ کرنے کے لیے صرف کیے جاتے ہیں جو ہر شخص کے خیال میں پہلے ہی سے کافی طور پر بڑا ہے۔ اس طرح گزشتہ تین سال میں تقریباً ساٹھ ہزار روپے

صرف کیے گئے ہیں۔ انھیں تین سال میں عربی اور سنسکرت کتابوں کی فروخت سے پورے ایک ہزار روپے بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اسی زمانے میں انجمن کتب مدارس سائنٹیفک ہزارگریزی کتابیں ہر سال فروخت کرتی رہی اور نہ صرف ان کی بلایت کے مصارف اس نے ادا کیے بلکہ اپنے سرمائے پر ۲۰ فی صد نفع بھی حاصل کیا۔

۲۵۔ اس امر پر بہت زور دیا گیا ہے کہ دھرم شاستر کو خاصکر سنسکرت کتابوں سے اور شرع اسلام کو عربی کتابوں سے یکجہا چاہیے، لیکن اس کا کوئی تعلق مسئلہ زیر بحث سے نہیں معلوم ہوتا۔ پارلیمنٹ نے حکم دیا ہے کہ ہم ہندو مت کے قوانین سے واقفیت اور ان میں مہارت حاصل کریں۔ اس غرض کے لیے ہمیں ایک قانونی کمیشن کی مدد بھی دی گئی ہے۔ جو تہی مدون قانون کی اشاعت ہوگی شاستر اور ہدایتہ کسی منصف یا صدر امین کے لیے بے سود ہوگی۔ مجھے امید اور بھروسہ ہے کہ جو طلبہ اس وقت مدرسہ اور سنسکرت کالج میں داخل ہو رہے ہیں ان کے فارغ التحصیل ہونے سے پیشتر مذکورہ عظیم تنظیم یا جارجیکہ یہ علامہ ایک لغو فعل ہو گا کہ نوجوانوں کو اس صورت حالات کے نظر کرتے تعلیم دی جائے جسے ہمارا منشا بدل دیئے گا ہو قبل اس کے کہ انہیں لوازم انسانیت حاصل ہوں۔

۲۶۔ لیکن ایک اور استدلال باقی ہے جو نسبتاً زیادہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں جن میں دس کروڑ اشخاص کی مقدس کتابیں لکھی ہوئی ہیں اور اسی سبب سے وہ حاصل اور پر تائید کی مستحق ہیں۔ یقیناً برطانوی حکومت ہند کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مذہبی معاملات میں نہ صرف رواداری برتے بلکہ غیر جانبدار رہے۔ لیکن ایک ایسے ادب کی تعلیم کو جس کی حقیقی قدر و قیمت بہت کم تسلیم کی گئی ہے محض اس لیے تقویت دینا کہ اس ادب میں اچھ ترین معاملات کے متعلق اچھ ترین اعلاط کی نہایت کی گئی ہے ایک ایسا طریقہ ہے جو عقل اخلاق یا خود اس غیر جانبداری پر بھی مشکل منطبق ہو سکتا ہے جو احترام کے ساتھ جیسا کہ ہم سب کا خیال ہے

برقرار رہنی چاہیے۔ یہ مسلم ہے کہ ایک زبان مفید معلومات سے محروم ہے لیکن
ہیں اس زبان کی تعلیم دینی ہے کیونکہ اس میں عظیم توہمات کی بہتات ہے۔
ہیں غلط تائید، غلط علم، گہیت غلط علم طب پڑھانا ہے کیونکہ ہم انہیں ایک
باطل مذہب کے ساتھ آسانہ پاتے ہیں۔ ہم احترام کرتے ہیں اور مجھے اعتماد
ہے کہ ہم ہمیشہ ان اشخاص کو سرکاری امداد دینے سے احتراز کرتے رہینگے
جو ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ہمارا
طرز عمل یہ ہے تو کیا ہم غلط نہ یا شریفانہ طور پر سرکاری محامل میں سے کوئی
رقم ہندوستانی اشخاص کو بطور رشوت دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے عالم شباب
کو یہ سیکھنے میں برباد کر دیں کہ گدھے کو چھوئے کے بعد انہیں ایسے کوس طرح
پاک کرنا چاہیے یا بکرے کو ہلاک کرنے کے جرم کا کفارہ دینے کے لیے انہیں
وید کے کوئٹے فقرے پڑھنے چاہیے؟

۲۷۔ مشرقی علوم کے حامی یہ مسلم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کا کوئی باشندہ
انگریزی زبان کی سطحی واقفیت سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اس
امر کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ہمیشہ اس کی تلقین کرتے ہیں۔
وہ اس تعلیم کو جس کی سفارش ان کے مخالفین کرتے ہیں محض ایک کتاب
الہ کی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ اس امر کو ناقابل اکترا تصور کرتے ہیں کہ
اصل سوال ایک طرف ہندی اور عربی ادبیات و علوم کی گہری معلومات
اور دوسری طرف مبادیات انگریزی کی سطحی معلومات حاصل کرنے کا ہے۔
یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے بلکہ ایسا مفروضہ ہے جو بالکل عقل اور تجربے کے خلاف ہے ہم جانتے ہیں کہ
تمام اقوام کے غیر اشخاص ہماری زبان اس قدر کافی سیکھتے ہیں کہ ان کی رسائی
تمام مشکل ترین معلومات تک جو اس میں موجود ہے ہو جاتی ہے نیز وہ ہمارے
معیاری مصنفین کی نہایت بامحاورہ تحریروں کی لطافت و نزاکت سے
لفظ اندوز ہوتے ہیں۔ خود اسی شہر میں ایسے ہندوستانی اشخاص موجود ہیں
جو روانی اور درستی کے ساتھ انگریزی زبان میں سیاسی یا علمی مسائل پر بحث
کرنے کے قابل ہیں۔ میں نے خود اسی مسئلے پر جس کے متعلق میں اب لکھ رہا ہوں

ہندوستانی اشخاص کو ایسی ذکاوت اور وسعت نظر کے ساتھ بحث کرتے ہوئے
 مٹنا ہے جو مجلس تعلیمات عامہ کے کسی رکن کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتی ہے۔
 فی الواقع براعظم یورپ کے ادبی مطلقوں میں بھی کوئی غیر ملکی شاعر ہی ایسا ملتا ہے
 جو انگریزی زبان میں اپنے خیالات کو ایسی سہولت اور صحت کے ساتھ
 ظاہر کر سکتا ہو جیسا کہ اکثر ہندوؤں میں پاتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی شخص
 یہ دعویٰ نہ کرے گا کہ انگریزی کسی ہندو کے لیے اسی قدر مشکل ہے جس قدر یونانی
 ایک انگریز کے لیے مشکل ہے۔ بریں ہم جس مدت میں آپ کے بد قسمت
 طالب علم سنسکرت کالج سے کامیاب ہو کر نکلتے ہیں اس سے بہت ہی کم مدت
 میں ایک ذہین انگریز لڑکا بہترین یونانی مصنفین کی تحریروں کو پڑھنے ان کا
 لطف اٹھانے نیز معہ کی سے ان کے اسلوب بیان کی نقل کرنے کے قابل
 ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز لڑکا جس مدت میں ہیرودوٹس اور سافوکرز کی
 تصانیف پڑھنے کے قابل ہوتا ہے اس کے نصف سے بھی کم مدت میں ایک ہندو
 کو بیوم اور مکن کی کتب پڑھنے کے قابل ہو جانا چاہیے۔

۲۸۔ جو مجھ میں نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: میں ان امور کو واضح
 خیال کرتا ہوں کہ ہم پرستار کے قانون پارلیمنٹ کی پابندی مایہ نہیں ہوتی
 ہم کسی صریح یا معنوی عہد و پیمان کے پابند نہیں ہیں ہم اپنی رجم کو جس طرح چاہیں
 استعمال کرنے میں آزاد ہیں ہمیں چاہیے کہ اسے ایسی تعلیم میں استعمال کریں جو
 بہترین طور پر قابل حصول ہو انگریزی کی واقعیت سنسکرت اور عربی کی نسبت
 زیادہ بہتر ہے ہندوستانیوں کی خواہش یہ ہے کہ انہیں انگریزی سکھانی جائے
 نہ کہ عربی یا سنسکرت عربی اور سنسکرت قانونی زبان کی حیثیت سے نہ
 مذہبی زبان کی حیثیت سے ہماری نائیڈ کا کوئی خاص استحقاق رکھتی ہیں اس
 ملک کے باشندوں کو کامل طور پر انگریزی کے حقیقی عالم بنانا ممکن ہے اور ہیں
 اس مقصد کی جانب اپنی مساعی کا رخ پھیر دینا چاہیے۔

۲۹۔ ایک مسئلے میں مجھے ان اصحاب سے کامل اتفاق ہے جن کی عام رائے
 کی مخالفت میں نے کی ہے۔ میں ان کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے

محدود ذرائع کے نظر کرتے رہا یا کی اکثریت کو تعلیم دینے کی کوشش کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ یہیں فی الحال اپنی بہترین کوششیں ایک ایسی جماعت کے قایم کرنے میں صرف کرنی چاہئیں جو ہمارے اور ان لاکھوں نفوس کے درمیان جن پر ہم حکومت کرتے ہیں ترجمانی کا کام کرے اور یہ ایک ایسی جماعت ہو جو خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، تخیل، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے فرنگی ہو۔ اس جماعت کے سپرد ہم یہ کام کر سکتے ہیں کہ وہ ملک کی زبانوں کو شستہ بنائے، ان کو مغربی علمی اصطلاحوں سے معمور کرے اور رفتہ رفتہ ان کو عوام کی کثیر آبادی میں اشاعت علم کا موزوں ذریعہ بنائے۔

۳۰۔ میں تمام موجودہ اغراض کا کامل احترام کرونگا۔ میں ان تمام افراد کے ساتھ سچی فیاضانہ سلوک کرونگا جنہیں کسی مالی امداد کی متقول توقع ہو گئی ہے۔ لیکن میں اس قبیل طریقے کی بیخ کنی کرونگا جسے اب تک ہم نے جاری رکھا ہے۔ میں فوراً عربی اور سنسکرت کتابوں کی طباعت بند کرونگا۔ میں مدرسہ اور سنسکرت کالج (مکملہ) کو برخاست کرونگا۔ بنارس برہمنی علوم کا بڑا مرکز ہے اور دہلی عربی علوم کا۔ اگر ہم بنارس کے سنسکرت کالج اور دہلی کے چھٹن (اسلامی) کالج کو برقرار رکھیں تو ہمارا یہ عمل میری رائے میں مشرقی زبانوں کی بقا کے لیے کافی بلکہ کافی سے بہت زیادہ ہوگا۔ اگر بنارس اور دہلی کے کالج برقرار رکھے جائیں تو میں کم از کم اس امر کی تائید کرونگا کہ ان طلبہ کو جو آئندہ ان کالجوں میں داخل ہوں کوئی وظائف نہ دیے جائیں بلکہ یہ عوام پر جھوڑ دیا جائے کہ خود وہ ہمہ سر تعلیمی طریقوں میں سے کسی کا انتخاب کر لیں اور ہماری طرف سے انہیں ایسے علوم سکھانے کے لیے رشوت نہ دی جائے جن کے حصول کی خواہش وہ نہیں کرتے۔ اس طرح جو رقم ہمارے زیر تصرف ہوگی اس سے ہم ہندو کالج مکملہ کو زیادہ امداد دینے نیز فورٹ ولیم اور آگرہ کے احاطوں کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے مدارس قایم کرنے کے قابل ہو سکیں گے جن میں انگریزی کا دل طور پر بخوبی

سکھائی جا سکے۔

۳۱۔ اگر معزز لارڈ بہ ابلاس کوئل کا فیصلہ میری توقع کے مطابق ہوتا
میں اپنے فرایض کی بجائے اور سی انتہائی جوش و مستعدی کے ساتھ شروع کر دوں گا۔
اگر بصورت دیگر حکومت کی یہ رائے ہو کہ موجودہ نظام تعلیم میں کوئی تغیر
نہ ہونا چاہیے تو میں استدعا کرتا ہوں کہ مجھے مجلس کی صدارت سے ہٹا دیا
ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجلس میں میرے
رہنے سے قلیل ترین فائدہ کبھی نہ ہو سکیگا اور میں یہ سبھی محسوس کرتا ہوں کہ
وہاں میرا رہنا گویا اس امر کی تائید کرنا ہے جسے میں کامل یقین کے ساتھ
محض ایک مغالطہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ نظام تعلیم سے صداقت
کی رفتار میں تیزی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس سے فانی اعلاط کی فطری موت
میں سبھی تاخیر ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم بحالت موجودہ مجلس تعلیمات عامہ
کے معزز نام کے مستحق نہیں ہیں۔ ہماری مجلس سرکاری رقم ضایع کرتی ہے،
وہ ایسی کتابیں طبع کرتی ہے جن کی قدر و قیمت ان سادہ کاغذات سے بھی
کم ہے جن پر وہ طبع کی جاتی ہیں وہ لایعنی تاریخ، لغو علم، مابعد الطبیعیات،
یہودہ علم طبیعیات اور نامعقول علم فقہ کی مصنوعی ترغیب دیتی ہے، وہ
طالب علموں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرتی ہے جو اپنی علمیت کو ایک بار
اور عار سمجھتی ہے اور جو حصول تعلیم کے زمانے میں سرکاری رقم برباد کرتی ہے
اور جس کی تعلیم اس قدر بے سود ہوتی ہے کہ جب وہ اسے حاصل کر چکی ہے
تو وہ فاقہ کرنے یا اپنی تمام باقی زندگی سرکاری امداد سے بسر کرنے پر مجبور
ہوتی ہے۔ ان خیالات کی بنا پر میں فطرتاً ایسی مجلس کی تمام ذمہ داری سے
بری ہونے کا خواہشمند ہوں جسے میں لازماً اس وقت تک نہ صرف یکا بلکہ
مضر سمجھتا ہوں جب تک کہ وہ اپنی کارروائیوں کا سارا طریقہ نہ بدل دے۔

ٹی۔ بی۔ میکالے

مورخہ ۲ فروری ۱۹۳۷ء

میں ان خیالات سے جو اس یادداشت میں ظاہر کیے گئے ہیں کمال اتفاق کرتا ہوں۔

ڈبلیو۔ سی۔ ہٹنگ

* مجلس تعلیمات عامہ کے نام معتمد کے دو مراسلے مورخہ ۲۱ و ۲۲ جنوری گزشتہ مع کاغذات محولہ گورنر جنرل ہند بہ اجلاس کونسل نے بغور ملاحظہ فرمائے۔
اول، معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ برطانوی حکومت کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے باشندوں میں یورپی علوم و فنون کو ترقی دی جائے اور تمام رقوم جو تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے بہترین طور پر صرف انگریزی تعلیم کے لیے صرف ہو سکتی ہے۔

دوئم، لیکن معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی علوم کا کوئی کالج یا اسکول برخاست کر دیا جائے جبکہ ہندوستانی رعایا ان فوائد کو جو وہاں موجود ہوں حاصل کرنے کے لیے راغب معلوم ہوا اور معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا حکم یہ ہے کہ مجلس کے زیر انتظام تمام تعلیم کا ہوں کے کل موجودہ معلمین اور متعلمین اپنے اپنے بھتے اور وظیفے پاتے رہیں۔ لیکن معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل طلبہ کو ان کے زمانہ تعلیم میں مالی امداد دینے کے طریقے پر جواب تک رائج رہا صریحاً اعتراض کرتے ہیں۔ معزز لارڈ کا خیال ہے کہ ایسے طریقے کا صرف یہ اثر ہو سکتا ہے کہ ان علوم کی مصنوعی ترغیب دی جائے جو واقعات کی قدرتی رفتار میں مفید تر علوم سے مغلوب ہو جائینگے، لہذا لارڈ موصوف کا حکم یہ ہے کہ مذکورہ تعلیم کا ہوں میں سے کسی میں آئندہ جو طالب علم داخل ہوا اسے کوئی وظیفہ نہ دیا جائے، اور جب مشرقی علوم کا کوئی معلم اپنی خدمت ترک کر دے تو مجلس اس کی جماعت کی حالت و تعداد کی اطلاع حکومت کو دیگی تاکہ حکومت اس کے جانشین کے تقرر کی واجبت کا تصفیہ کر سکے۔

سوم، گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ معلوم ہوا ہے کہ مجلس نے مشرقی کتب کی طباعت میں ایک بڑی رقوم صرف کر دی ہے۔ معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا ارشاد یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں آئندہ کوئی رقوم استعمال نہ کی جائے۔
چہارم، معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کا حکم یہ ہے کہ وہ تمام رقوم جو ان

اصلاحات کے باعث مجلس کے زیر تصرف ریگی آئندہ ہندوستانی باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادبیات و علوم کی تعلیم دینے میں صرف کی جائے اور معزز لارڈ بہ اجلاس کونسل کی خواہش یہ ہے کہ ایک مقصد کی تکمیل کے لیے مجلس بجماعت تمام ایک تجویز حکومت کے سامنے پیش کرے۔

* ان تعلیمی قوتوں کا جن میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے کیا ان پر ہوگا؟

ہم انجام پر زور دیتے ہیں کیونکہ ہم پریشان خیال نہیں ہیں۔ ہم معجزات کی توقع نہیں کرتے، ہم فوری اور عاجلانہ تغیرات کی امید نہیں رکھتے بلکہ ہم اعتماد کے ساتھ ایک آخری انقلاب عظیم کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم لارڈ ولیم سنٹاک کے قانون کو ایسے سلسلہ اسباب کا بانی سمجھتے ہیں جو ممکن ہے غیر محسوس طور پر کچھ مدت تک اس طرح عمل کرے کہ سرسری یا اتفاقی طور پر مشاہدہ کرنے والوں کی نظر سے اوجھل رہے لیکن اہم اور عظیم نتیجے کے متعلق یقیناً اس کا عمل برابر جاری رہے گا۔ ان قوانین کی طرح جو اپنی خاموش مگر اٹل قوت کے ساتھ مادی عالم کی حرکات کا انضباط کرتے ہیں یہ تعلیمی امور جو خلاق توفیق کی سہی نوعیت اور قوت رکھتے ہیں ترقی پذیر ہوتے جائینگے حتیٰ کہ ان سے ہندوستان کی قومی ذہنیت میں انجام کار ایک عام تغیر پیدا ہو جائیگا۔

لیکن جہاں ہم لارڈ ولیم سنٹاک کے قانون کو اس کی وسعت کے لحاظ سے بہت پسند کرتے ہیں وہاں ہم اس تحریر پر یادداشت کو ختم کرنے سے پہلے اپنی ذاتی رائے میں دنیا کے اعلیٰ ترین و تشریف ترین مقصد کو بھی بجانب قرار دینے کے لیے پُر زور طور پر اپنے اس بے لوث ایمان کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ قانون مذکور کافی موثر نہیں ہے۔ کسی شعبہ علم میں خواہ وہ ادنیٰ ترین ہو یا اعلیٰ ترین راستی کو غلطی پر فوقیت ہوتی ہے۔ اسی سبب سے

*Source.—(iii) Memorandum by Alexander Duff, reproduced in

the "Life of Alexander Duff." Vol. I., pp. 200-3. G. Smith.

(Hodder & Stoughton.)

ہم اُس شخص کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے ہیں جس نے یہ حکم دیا کہ ہندوستان کی سرکاری تعلیم کا ہوں میں جھوٹے ادب، جھوٹے علوم اور جھوٹے مذہب کی بجائے آئندہ سچا ادب اور سچے علوم سکھائے جائیں۔ لیکن جہاں ہم اس امر سے خوش ہیں کہ جو چیزیں صریحاً جھوٹی ہیں ان کی بجائے سچا ادب اور سچے علوم سکھائے جائیں گے وہاں ہم یہ اظہارِ افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ واحد سچے مذہب عیسائیت کو اس جھوٹے مذہب کی بجائے قائم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے جسے ہمارا ادب اور ہمارے علوم لازمی طور پر فضا کر دیں گے۔

ہمارا مقولہ یہ رہا ہے، اب رہے اور ہمیشہ رہے گا کہ ”جہاں کہیں جب کبھی اور جس کسی کی جانب سے دنیوی مصالح پر عیسائیت کو قربان کر دیا جائیگا وہیں اور اسی وقت انسان کی اعلیٰ نیکی کا خون ہو جائیگا“ لیکن کیا یہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک عیسائی حکومت ایسے مذہب کی جانب جسے وہ احترام کے ساتھ قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے اپنے فرائض سے غفلت برت رہی ہے تو برطانیہ کے عیسائی تبلیغی مرکز بھی اپنے فرائض کو فروغ کر دیں؟ پس ہم کو حالتِ جمود سے بیدار ہو کر اپنے فرائض کی انجام دہی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم بروقت دانشمندی سے کام کریں تو ہم حکومتِ ہند کے قانون کو اپنا مدد و معاون بنا لیں گے۔ قدیم تو ہمارا ست کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہم ایک عظیم الشان مشنری کے قیام کو بفضلِ الہی غیر فانی انجیل کی اشاعت کے متعلق جدید پہلوئوں کا آغاز خیل کر سکتے ہیں جس سے ایک ادنیٰ بانی کی طرح اُس عظیم تودہ لغویات کو پاک و صاف کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے جو بصورتِ دیگر الہامی صدق کے آزادانہ فروغ کی راہ میں مڑا ٹھہرتا۔ جہاں کہیں سرکاری تعلیم کا قیام کی جائے جس کا اثر یہ ہو کہ بت پرستی اور اودھام پرستی کی عمارتیں مسکرا ہو جائیں اسی منگاپر ہیں ایک عیسائی درس گاہ بنانے کے لیے تیار ہونا چاہیے جو برکاتِ الہی کی بدولت مذکورہ عمارتوں کے کھنڈروں پر عیسائیت کی فیاضانہ عمارت

قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔

اسکا تعلق دہلی کے سکلیا نے پہلے ہی سے سرگرمی کے ساتھ میدانِ عظیم میں قدم رکھ دیا ہے مگر اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے صرف سرحد کو عبور کیا ہے۔ اس نے پہلے ہی سے ایک جرات آمیز اور فاسخانہ انداز و دشمن کے مقابلے میں اختیار کیا ہے مگر اسے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جناب کی صرف ابتدا ہوئی ہے۔ اسے اٹھنا چاہیے اور عیسائی مسیح کا نام لے کر ملک پر قبضہ کرنے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس نے پہلے ہی حکومت کی تعلیمی ستاروں سے مفید کام لینے کے امکان کو ایک مثال پیش کر کے ثابت کر دکھایا ہے۔ جہاں حکومت نے اپنا پہلا انگریزی کالج قائم کیا وہیں اس نے اپنے مبلغین کے قیام کا انتظام کیا اور اپنی اولین عیسائی مدرسہ گاہ کی بنیاد رکھی۔ اس درس گاہ میں سرکاری کالج کے بعض لائق ترین افراد بلیز دی سب سے پہلے عیسائی بن گئے جو ہندوستان میں اس کی تبلیغی کوششوں کے اولین شرتھے۔

اب پاسا پھیلنے کا جاکچکا تھا اور مغربی علوم کی جیت ہو چکی تھی۔ بہت غور و نال کے بعد ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں نے اپنے اس مسئلہ طرزِ عمل میں جو یہاں کے باشندوں کی معاشری ترقی میں مداخلت نہ کرنے سے متعلق تھا ایک تغیرِ عظیم پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو مغربی تصورات اور خیالات کی تعلیم پر مبنی تھا اور اسی فیصلے کے نتیجے کے طور پر ان کی یہ رائے تھی کہ یہ تعلیم زیادہ تر ایک اجنبی زبان کے ذریعے اور اکثر و بیشتر ایک اجنبی قوم کے اساتذہ کے ذریعے دی جائے۔ فی الحقیقت یہ ایک خطرناک تجربہ تھا جو خوفناک امکانات سے بھرپور تھا۔ اس کی اہمیت کے متعلق مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ لارڈ مارلے نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ جامعات کا قیام حکومتِ تاج کے

۱۔ - ہندو کالج۔

۲۔ - یہ اب اسکاٹش چرچ کالج ہے۔

انتقال کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم اور اوق امر تھا۔ آج ہندوستانی نظم و نسق کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اتنے زیادہ مباحثے پیدا کرتا ہو اور ایسے مخالفانہ جذبات کا حامل ہو جیسا کہ شعبہ تعلیمات ہے۔ سوالات اور تحریکات کی تعداد جو شاہی اور صوبہ داری مجلسوں کے سامنے پیش کی گئی، تقاریر جو عام جلسوں میں کی گئیں، خطوط اور مضامین وغیرہ جو سرکاری اخباروں میں شائع ہوئے سب کے سب اس دہائی کی نمایاں شہادت دیتے ہیں جو ہندوستانی قوم نے اپنی حکومت کی تعلیمی روش کے متعلق ظاہر کی تھی۔ کئی سال قبل سرمنتری مین نے یہ الفاظ کہے تھے کہ کسی شے کو دیکھنا ضروری ہے تاکہ اس پر یقین کیا جائے اور میں نہیں جانتا کہ آیا طلبہ کے گروہ جواب نہیں تو جلد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں شمار ہو گئے زیادہ تعجب خیز اور نمایاں ہیں یا وہ ذوق و شوق جو انہوں نے ظاہر کیا ہے۔ میں اپنی حد تک تو یہ خیال نہیں کرتا کہ اس قسم کی کوئی حالت کسی یورپی جامعہ نے ازمنہ و سطلی کے بعد سے دیکھی ہو اور مجھے اس میں شبہ ہے کہ آیا کوئی چیز اس کی بنیاد برطانوی حکومت ہند نے رکھی ہو یا جس کا تعلق اس سے ہو ایسی ہے جو کلکتہ سے لاہور تک اعلیٰ تر طبقے کے ہندوستانی گھرانوں میں امتحان جامعہ کی بہ نسبت زیادہ سرگرمی پیدا کر سکتی ہے۔“

بہت کم امتحان اسے کو اُن خطروں سے غافل ظاہر کر سکتے ہیں جو اس عظیم تغیر سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلے ہی سے ایسے تجربہ کار اشخاص موجود تھے جنہوں نے ان قبائح کو معلوم کر لیا جو مغربی تعلیم کے سلسلے میں رونما ہونگی اور یہ اشخاص نظام تعلیم کے جدید تغیر کے باعث سیاسی ہیجان پیدا ہو جانے کا اندیشہ کر رہے تھے۔ لارڈ مٹکاف نے ان خیالات کی مخالفت حسب ذیل یادداشت میں کی:

*مغربی علوم اور سیاسی ہیجان | بہر حال معزز لارڈ علوم کی اشاعت اور

*Source.—Minute of Sir C. Metcalfe, dated May 16, 1835.

صحافت کے عمل میں مزید خطرہ دیکھتے ہیں۔ میں اپنی حد تک تو ان اسباب سے یقینی طور پر کئی خطرے کے پیدا ہونے کا تصور نہیں کرتا۔ میں رعایا کی جہالت، مذہبی جوش اور وحشت میں کچھ ایسا خطرہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اشاعت علم ہی سے مزید قوت اور حفاظت کی تنہا کڑی سی توقع ہو سکتی ہے۔ تب رعایا ہمارے حکومت کے محاسن و معائب کا اندازہ کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہو سکے گی اور اگر محاسن غالب ہوں تو وہ جان لے گی کہ تفر سے اس کا نقصان ہوگا۔ کسی کی خیر سگالی پر اعتماد کے بغیر یہ اغلب مقوم ہوتا ہے کہ ہندوستانوں میں سے وہ اشخاص جو ہماری معزولی پر بہت زیادہ لعن طعن کر چکے اور اس میں کم سے کم حصہ لینے سب سے زیادہ باخبر اور روشن خیال ہونگے بجز اس صورت کے کہ وہ خود انفرادی طور پر اپنے اعلیٰ اقتدار کے خواب دیکھنے لگیں۔ بہر حال اشاعت علم سے اگر کوئی جدید خطرہ محسوس ہوتا ہے (جس کے برخلاف میں اطمینان کے ساتھ پیش گوئی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں) تو وہ ایک ایسا خطرہ ہے جس سے قطعاً گریز نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ علم کی اشاعت کریں خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو اور اگر ہم نے اس کی راہ میں مزاحمت کی تو کبھی وہ اشاعت پذیر ہو سکے گی۔ وہ زمانہ گزر چکا جب کہ صحافت کے عمل کو موثر طور پر روکا جاسکتا تھا اگر ایسا تفرض، حفاظت کا کوئی ذریعہ ہو سکتا جو لازماً ایک بہت مستحب امر ہے۔ اس قسم کی کسی غیر معین چیز پر معقولیت کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا علوم کی ترقی سے اگر خطرے کی زیادتی کا واقعی اندیشہ ہے تو وہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں خوشی سے قبول کرنی چاہیے۔ ہمیں اسے دور کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور اگر ہم نے ایسی کوشش کی تھی تو ہم ناکام رہتے۔

یہ فیض قیاس ہے جیسا مسٹر ایچ۔ آر۔ جیس نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم، میکا کے کی مشہور یادداشت کی بنیاد پر اس کی انتظامی قابلیت کی زیادہ محنون احسان ہو۔ مجلس اب اپنے تعلیمی نظام کے متعلق اختلاف آراء سے نجات پا کر تعجب خیز قوت کے ساتھ کام کرنے لگی۔ لیکن

دواہم سوال اب سبھی قابل توجہ تھے، ایک یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے مدرسے میں ویسی زبانوں کی حیثیت کیا ہوگی اور دوسرا یہ کہ قوم کے شہر لائقوں کو انگریزی تعلیم کے فوائد سے مستثنیٰ کیا جائے۔ پہلے امر کے متعلق مجلس نے یہ محسوس کیا کہ ہنوز کہ ویسی زبانوں میں ایسی ادبی یا علمی معلومات نہیں ہے جو درسی و اطلاقی تعلیم کے لیے ضروری ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ قرار دیا کہ ویسی ادبیات کی تکمیل اس کی مساعی کی آخری غرض ہے۔ دوسرے مسئلے کے متعلق مجلس نے یہ طے کیا کہ جدید کورس گاہوں میں ہر طبقے کے لڑکے بلا امتیاز شریک کیے جائیں، لیکن عملاً اس نے وہ طریق اختیار کیا جسے تعلیم کا ”طریقہ تدریس“ کہا گیا ہے۔ پہلے پہل تعلیم کو بالکل اعلیٰ اور متوسط طبقوں تک اس توقع پر محدود کیا گیا کہ وہ فطری طور پر عوام کے ہادی ہونے کی حیثیت سے ان میں اپنا علم پھیلا سکیں۔

* طریق جدید کی تنظیم | ہمیں ویسی زبانوں کی تعلیمی ترغیب کی اہمیت کا کامل احساس ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی ترغیب دی سے حکم صدر، مارچ میں روکتا ہے اور اسی تعبیر پر ہم نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ ان مباحثوں میں جو حکم مذکور سے قبل ہوئے تھے ویسی زبانوں کے مطالبات کو تمام فریقوں نے علانیہ اور واضح طور پر تسلیم کر لیا تھا اور جو مسئلہ حکومت کے فیصلے کے لیے پیش کیا گیا تھا وہ صرف ایک طرف انگریزی تعلیم کی اور دوسری طرف مشرقی علمی زبانوں کی تعلیم کی نسبتی خوبیوں سے متعلق تھا۔ لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ ”یورپی ادبیات و علوم“، محض انگریزی تعلیم اور ہندوستانی باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادبیات و علوم کی تعلیم دینا“ ایسے فقروں سے صرف یہی مراد ہے کہ مشرقی علوم پر جو سنسکرت اور

*Source.—The first Annual Report of the Committee of Education.

Reproduced in Trevelyan's "Education of the People of India,"

pp. 28-5, 47-9. (Longmans.)

عربی زبانوں کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں یورپی علوم کو جو انگریزی زبان کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں ان ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں ترجیح دی جائے جو ہماری دہس گاہوں میں معیاری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مذکورہ فقرہ میں ہمارے مفہوم کے مطابق کوئی حوالہ اس مسئلے کے متعلق نہیں ہے کہ ایسی تعلیم جسے عوام حاصل کر سکیں انگریزوں کی زبان کے ذریعے دی جائے گی۔ اگر انگریزی ترک کر دی جاتی اور مشرقی علمی زبانیں اختیار کی جاتیں تو بھی عوام لازماً ویسی زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے۔ پس حکومت کے لیے ہمسہ زبانوں کا مسئلہ حل کرتے وقت ویسی زبانوں کی طرف توجہ کرنا قطعاً غیر ضروری تھا اور اسی سبب سے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی غلط توجہ سے معقول طور پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ویسی ادبیات کی تشکیل ہمارا مطمح نظر ہے جس کے لیے ہماری ساری کوششیں عمل میں آئی چاہیں۔ بحالت موجودہ ویسی ادبیات کے انوسس ناک فقدان سے اور صرف اسی کے ذریعے معقول تعلیم حاصل کرنے کا امکان نہ ہونے سے کسی غیر زبان کی وسیع تحصیل جو ہمیشہ دہس کو بہت ترقی دیتی ہے لازم ہوگئی ہے۔ پس انگریزی زبان کی تعلیم جسے ترجیح دینے کی گئی وجہ ہندوستانیوں کے نزدیک پیدا ہوگئی ہیں نیز اس تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی واقفیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ہماری رائے میں اس عمل کا پہلا درجہ ہے جس کے ذریعے ہندوستان کو روشن خیال بنایا جائیگا۔ ہندوستانیوں کو خود تعلیم یافتہ ہونا چاہیے قبل اس کے کہ وہ تعلیم دے سکیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں انہیں ہمارے علوم سے خوب واقف کرانا چاہیے قبل اس کے کہ وہ اپنی زبان میں انہیں منتقل کر سکیں۔ یہی یقین ہے کہ اس قسم کے تراجم کی تعداد ہر سال بڑھتی جائے گی۔ جیسا جیسا یورپی علوم کی فوقیت مام طور پر زیادہ قابل قدر ہوتی جائے گی ویسا ویسا ان کا مطالعہ یقیناً بڑھتا جائے گا اور ہم ایسی عمدہ کتابوں کو جو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کی جائیں فراخ دلی کے ساتھ پانی دس گاہوں کے

نصاب میں داخل کر کے ان کی تدریس فرمائی کر سکیں گے۔

ہر صوبے کی دیسی زبان کا ایک ایک استاد پہلے ہی غصے ہماری کئی درس گاہوں میں مقرر ہو چکا ہے اور ہیں توقع ہے کہ یہ طریق عمل جلد عام ہو جائیگا۔ اس اہم شعبہ تعلیم پر جو توجہ کی جاتی ہے اس کی مقدار کا بطور خود اندازہ کرنے کے لیے اہم نے حصول ذرائع کی کوشش اس طرح کی ہے کہ انگریزی زبان سے دیسی زبان میں یا اس کے برعکس جو بہترین تراجم ہوں وہ ہر سال امتحان کے بعد ہمارے پاس بھیجے جائیں اور اگر وہ مستحق انعام معلوم ہوتے ہیں تو ہماری جانب سے منتر جموں کو رٹنی انعام دیا جاتا ہے۔

* * * * *
مجلس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے جذبات پسند تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ میں مغربی علوم بکھیر دیتے جائیں تاکہ وہ اپنے باقی ہم وطنوں کے سامنے اپنی زبان میں ان کی ترجمانی کر سکے۔ اس غرض کے لیے جہاں ایک طرف طلبہ کو یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ گونا گوں معلومات کو جو انگریزی ادب میں موجود ہے حاصل کریں اور بہترین انگریزی نمونوں پر اپنے مذاق کی بنا رکھیں وہاں دوسری طرف ہر کوشش اس امر کے لیے کی جاتی ہے کہ انہیں اپنی دیسی زبان میں روانی اور سلیکے کے ساتھ لکھنے کی عادت ہو جائے۔
مجلس کی اولین خواہش یہ ہے کہ ہر ضلع کے مستقر پر ایک درس گاہ جو مذکور بالا اصول پر مبنی ہو قائم کی جائے۔ بڑے شہر رقناترتی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ایسے مخصوص افراد جو اپنے حالات کے لحاظ سے معینہ اغراض کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی فرصت پاتے ہیں اور اپنی مثال کی تقلید کرانے میں اثر سے کام لیتے ہیں دیگر مقاموں کی بہ نسبت مشہروں ہی میں بہ تعداد کثیر جمع رہتے ہیں۔ ماکان اراضی سبھی جو اضلاع پر اپنے علاقوں میں رہتے ہیں اپنے صوبے کے بڑے شہروں سے قریبی تعلق قائم رکھتے ہیں جہاں عموماً ان کے شہری مکان اور منیم کارندے ہوتے ہیں۔

انھیں مقامات سے حکومت کے ذیلی عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے اور وہ مضافات میں اپنی خدمات کی انجام دہی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یورپی عہدہ دار بھی وہاں موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ درس گاہوں پر عام بخاری، کمپس اور اپنی اعانت اور تجربے سے اساتذہ کا ہاتھ بٹائیں۔ ان اہم اعضا کے ذریعے دوران خون کی اصلاح کرنے سے کل نظام جمالیں تازہ روح پیدا ہو جائیگی، ابتدا میں اس سے دولت مند ذی علم اور کاروباری اشخاص مستفید ہونگے، اساتذہ کی ایک نئی جماعت تربیت پا کر تعلیمی، ویسی زبانوں میں کتابوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور ان وافذائع کی مدد سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ رفتہ رفتہ اپنے دائرہ عمل کو شہر سے ملک تک اور قلیل تعداد سے کثیر تعداد تک وسیع کر سکیں حتیٰ کہ ہر موضع میں ایک ابتدائی مدرسہ قائم ہو جائے۔ غریبوں کے متعلق مجلس کاتر دوامیوں کی بہ نسبت کچھ کم نہیں ہے لیکن جب اس کے اختیاری ذرائع بہت محدود تھے اس وقت تمام طبقوں کے لاکھوں آدمیوں کی تعلیم کا مسئلہ پیش تھا۔ ان میں سے انتخاب کرنا نہایت ضروری تھا اور اسی لیے مجلس نے سب سے پہلے اپنی توجہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی طرف پھیر کر ان کا انتخاب کیا کیونکہ پہلے انہیں تعلیم یافتہ بنانے سے ان کے ذریعے اسی قسم کے فوائد بہت جلد باقی طبقوں تک پہنچائے جاسکتے تھے۔ وہ ہمارے مدرسین ماستر جمین اور مصنفین ہونگے جن کے فرائض میں سے کسی کو غریب آدمی اپنے محدود ذخیرہ علم سے انجام نہیں دے سکتا۔ وہ عوام کے ہادی ہیں۔ پہلے اپنے نظام تعلیم سے انہیں روشناس کرنے پر ہم اس قابل ہونگے کہ چند ہی سال کی مدت میں مناسب کتب اور مدرسین کی کافی تعداد فراہم کر کے اور ملک کی تمام دولت و قوت اپنے حق میں حاصل کر کے ایک ایسا عام نظام تعلیم قائم کر دیں جس کے ذریعے ہر طبقے کا ہر شخص اسی قدر علم حاصل کر سکے گا جس قدر اسے حاصل کرنے کی فرصت ہو۔

جب اس قسم کی تحریک حکام تعلیمات کے طرز عمل کی موید تھی تو

یہ لازمی امر تھا کہ ابتداء عوام کی ضروریات نظر انداز کر دی جائیں "عمل ترشیح" کی تھوڑی بہت کامیابی طویل و تکلیف وہ مدت انتظار کے بعد ہی ہوتی ہے۔ کئی سال قبل یعنی ۱۹۳۷ء میں ایک نہایت جفاکش یاد رکھنا سہ آؤم جو ہندوستانیوں اور ان کی زندگی کے طریقوں سے واقف تھا اور وہ ہندو کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دیسی تعلیم کے متعلق جو ہندوستانی اساتذہ کے ذریعے دی جاتی تھی اسے خیال رکھ کر نظر کر لیا۔ اس کے بعد اس کے اُس حصے سے جو ویل میں نقل کیا جاتا ہے اس زمانے کے مدارس کی افسوس ناک حالت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے مسٹر آؤم نے جو شجاویر پشیش کش انہیں تقریباً ناقابل عمل آؤم بن کر مجلس تعلیمات نے خیال کیا جس کے ارکان کو یہ توقع تھی کہ علی اور مسٹر آؤم کی تسلیم کی ترقی سے مصافحاتی دیسی مدارس پر مفید اثر پڑے گا اور مملو بہ نتائج بروقت برآمد ہونگے۔ ۱۹۴۷ء میں جب تک منصوبہ ہائے شمال مشرقی کے اٹینٹ گورنمنٹ رٹھاسن نے اس مسئلے پر توجہ نہ کی اور عہدہ داران ضلع کے نام فیسوری احکام جاری نہ کیے اس مخصوص میں کوئی حقیقی ترقی نہ ہو سکی۔

* دیسی تعلیم: دیسی نصاب

شاگردوں پر ہے اور چونکہ ان کی عزت نہیں کی جاتی اور انہیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے اس لیے شریف، قابل یا ذی علم اشخاص کو اس پیشے میں داخل ہونے کے لیے کوئی ترغیب نہیں ہے۔ مدارس عموماً بعض معزز ترین ہندوستانی باشندوں کے مکانوں میں یا ان کے بہت قریب قائم ہیں۔ خاندان کے تمام بچے ملکی دیسی زبان میں تعلیم پاتے ہیں اور استادوں کی آمدنی میں اضافہ ہونے کے لیے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ شریف گھرانوں کے اتنے بچوں کو جتنے وہ قرب و جوار میں فراہم کر سکتے ہیں

اپنے شاگردوں کے طور پر مدارس میں داخل کر لیں۔ یہ طالب علم ایک کھردری تختی پر انگلی لٹک کر حروفِ ہجے پڑھنا شروع کرتے ہیں اور بعد کو یہ حروف زمین پر قلم سے لکھتے ہیں۔ اس طرح یہ مشق آٹھ دس روز تک جاری رہتی ہے۔ اس کے بعد انہیں نرمل کا قلم انگلیوں میں نہیں بلکہ ٹمھی میں پکڑ کر تار کے پتوں پر کوئلے کی بنی ہوئی سیاہی سے جو مٹ جاتی ہے حروف علت کو حروفِ صحیح کے ساتھ ملا کر لکھنا، حروفِ مرکب اجزائے لفظ اور لفظ بنانا، پہاڑے، رمی ہند سے اور ناب تول کے پیمانے سیکھنا، اشخاص، اقوام اور مقامات کے نام واضح طور پر لکھنے کا صحیح طریقہ معلوم کرنا ان سب چیزوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ عمل تقریباً ایک سال تک جاری رہتا ہے۔ بعد ازاں طالب علموں کو کیلے کے پتوں پر دو دو چراغ کی بنی ہوئی سیاہی سے لکھنے اور علم حساب سیکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے جو تقریباً چھ ماہ تک جاری رہتی ہے اور اس مدت میں انہیں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم نیز مختلف اشخاص کو خلوطا لکھنے کے مناسب آداب و القاب کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ بلا خوف تر وید کہا جاسکتا ہے کہ ان مدارس میں سے کسی میں بھی ملکی زبان کے ملا کی تحصیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض مدارس میں دو تین زیادہ پڑھے لکھے لڑکے ملک کی مشہور ترین فلموں کے کچھ حصے لکھ لیتے ہیں تاہم خود قلمی نسخہ اس قدر مشکل سے دستیاب ہوتا ہے کہ ان لڑکوں کو نہایت مذموم طور پر بچے کرنے کی منتقل عادت ہو جاتی ہے جس کی اصلاح امتداد اپنی اوصوری کیاقت کے باعث نہیں کر سکتا۔

* ویسی مدر سے کا انتظام | سنرا کے طریقے :- ایک لڑکے کو اس کا چہرہ زمین کی طرف کر کے جھکایا جاتا ہے پھر ایک وزنی اینٹ اس کی پیٹھ پر اور دوسری گردن پر رکھی جاتی ہے اور اگر وہ مقررہ آدمہ لکھنے کی مدت کے اندر ان میں سے کسی ایک کو گرا دے تو اسے بید سے

سزا دی جاتی ہے۔ ایک لڑکے کو آدھ گھنٹے تک ایک پاؤں پر کھڑے رہنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر وہ انقضاے مدت سے قبل ہلے یا تھکے تھکے یا اوپر اٹھا ہوا پاؤں نیچے چھوڑ دے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔

ایک لڑکے کو چند لمحوں کے لیے اس کا سر نیچے کی جانب کر کے قریب کے کسی درخت کی شاخ سے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔

گزنہ پانی میں ڈبو کر ایک لڑکے کے جسم پر مل دیا جاتا ہے جس کے باعث جسم پر خارش اور آئاس پیدا ہو جاتی ہے، درد بہت نشتا ہے اور اکثر پورے ایک دن تک رہتا ہے لیکن خارش اور درد خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مطلقاً کم ہو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ آرام کے لیے وہ اپنی جلد کو چھوئے یا سہلائے کیونکہ اسے مزید سزائے تازیانہ کا خوف دلایا جاتا ہے۔

ایک لڑکے کو گزنہ یا بلی یا کسی دوسرے موذی جانور کے ساتھ ایک تھیلے میں بند کر دیا جاتا ہے اور پھر اسے زمین سے کھینٹا جاتا ہے۔ ایک لڑکے کو خود اپنے کان کھینچنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر وہ کافی طور پر کان نہ کھینچے تو اس پر اور زیادہ سخت سزا نازل ہوتی ہے۔

شہر میں جو مدرسے کے استاد کے ساتھ کی جاتی ہیں، استاد کا حق تیار کرتے وقت لڑکوں کی یہ عام شہادت ہوتی ہے کہ تمباکو میں مرچ اور کوئی تیز مصالح شامل کر دیتے ہیں کیونکہ جب وہ حقہ پیتا ہے تو اسے سخت ٹھسا لگتا ہے اور اس پر سارا درد قہقہے سے گونج اٹھتا ہے یا اس چٹائی کے نیچے جس پر وہ بیٹھتا ہے کانٹے اور گوکھرو بچھا دیئے جاتے ہیں جن کا اثر شرمندہ اور خوف زدہ استاد کے بیچ و تاب سے جلد ظاہر ہوتا ہے، یارات کے وقت جب کبھی اس کے شاگرد اسے راستے میں جا پکارتے ہیں تو وہ کنگر، اینٹ یا پتھر اس پر برساتے ہیں یا زلی گیت گاتے ہیں جن میں وہ دیوتاؤں سے مخصوص کالی سے

یہ استدعا کرتے ہیں کہ استاد کو موت کے گھاٹ اتار دے اور یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر ان کی استدعا قبول ہوئی تو وہ شکر اور نازیل کا نذرانہ پیش کر چکے۔

گزشتہ ساٹھ سال کا تعلیمی انتظام متقدمہ کے اس مشہور مراسلے میں پیش کیا گیا تھا جو اس زمانے کے صدر مجلس انجمن سر چارلس ووڈ کے توسط سے حکومت ہند کو روانہ کیا گیا تھا۔ اس مراسلے کا مقصد یہ تھا کہ یورپی علوم کو باشندگان ہند کے تمام طبقوں میں اس طرح پھیلا دیا جائے کہ اعلیٰ طبقہ ہائے علوم میں انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم ہو اور عوام کی بڑی تعداد ہندوستان کی دیسی زبانوں میں تعلیم پائے۔ اس تعلیم کا انتظام محکمہ تعلیمات عامہ کے ذمے تھا۔ اعلیٰ علوم کی ترغیب کے لیے جامعات قائم ہونے والی تھیں اور رنجی امداد کے طریقے کے ذریعے خانگی کوششوں اور فیاضیوں سے بدرجہ غایت فائدہ اٹھانا تھا۔ نظماً نے مزید مصارف کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کر لیا لیکن انہیں یہ اعتقاد تھا کہ جو کچھ صرفہ ان پر عاید ہو گا وہ ملک کی ترقی سے کافی طور پر وصول ہو جائیگا کیونکہ عام اشاعت علوم کا لازمی نتیجہ زیادہ باقاعدہ عادات، زیادہ محنت، نقیشت، زندگی کی رغبت، ان کے حصول کی کوشش اور باشندگان ملک کی روز افزوں خوش حالی کی صورت میں ظاہر ہو کر رہے۔

تعلیمی مسلک کا بیان | ۹۔ مشرقی زبانیں، ہندو مت، ہندو متناز
علمائے مشرق کی قابل تحسین کوششوں کی کامیابی سے

ناواقف نہیں ہیں جو انہوں نے ہندو فلسفہ کے بعض حصوں میں بڑا خلاق اور زیادہ ترقی یافتہ علوم کے بنیادی مضامین شامل کرنے کے لیے کیں اور ہم ہرگز ان مفید اثرات کی تحقیر نہیں کرنا چاہتے جو اس طرح ہندوستان کے

سلسلہ یہ بعد کو لا رہی تھیں بن گیا۔

*Source.— Despatch from the Court of Directors to the Governor

General in Council. 1854, "Selections from the Records of the Government of India." (Government Press, Calcutta.)

تعلیم یافتہ طبقوں پر ان کی زندگی کی مختلف حیثیتوں میں مترتب ہوئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہماری پیش کردہ وجوہ بالا کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ انہیں یورپی مصنفین کے کارناموں سے نیز ہر قسم کے مضامین سے متعلق یورپیوں کی محنت و فکر کے نتائج سے جن کے بموجب انہیں تعلیم دینی ہے واقف کرایا جائے اور ایسی تعلیم دینے کے ذرائع وسیع کرنا ہر عام نظام تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔

۱۸۔ ذریعہ تعلیم ایسی زبانیں، ہمارا یہ مقصد ہے نہ خواہش کہ ملک کی ایسی زبانوں کی بجائے انگریزی زبان قائم کر دی جائے۔ ہمیں ہمیشہ ان زبانوں کے استعمال کی اہمیت کا بہت زیادہ احساس رہا ہے جو عوام کی بڑی تعداد کی تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہی زبانیں نہ کہ انگریزی ہم نے فارسی کی بجائے انتظام مہدلت کے لیے نیز عہدہ داران حکومت اور عوام کی باہمی مراسلت کے لیے قائم کی ہیں۔ لہذا یہ امر ناگزیر ہے کہ ہر عام نظام تعلیم میں ان زبانوں کی تعلیم پر محنت شافہ کے ساتھ توجہ کی جائے کیونکہ ترقی یافتہ یورپی علوم سے کثیر تعداد عوام کو واقفیت پیدا کرانی ہو تو وہ محض انہیں ایسی زبانوں میں سے کسی ایک کے ذریعے کرائی جاسکتی ہے۔

۱۹۔ تعلیمی انتظام۔ ہم نے ہندوستان کے مختلف احاطوں میں نظم و نسق حکومت کے ایک جزو کی حیثیت سے ایک محکمہ تعلیمات قائم کرنے کا مقصد قرار دیا ہے، چنانچہ ہماری یہ تجویز ہے کہ ہر پریسیڈنسی اور لفٹیننٹ گورنری کے لیے ایک عہدہ دار مقرر کیا جائے جس کے ذمے خاص کر تعلیمی معاملات کا انتظام رہیگا اور جو اپنے طرز عمل کے متعلق حکومت کے نزدیک براہ راست جواب دہ ہوگا۔ ایک موزوں طریق مناسب بھی مستقبل میں ہمارے نظام تعلیم کا ایک لازمی جزو ہوگا اور ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستان تعلیمات کی ایک کافی تعداد مقرر کی جائے۔

۲۰۔ جامعات۔ مجلس تعلیمات نے اس تحریک میں جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے جامعہ لندن کو اپنی اغراض کے لیے بطور نمونہ منتخب کیا ہے

اور ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ مذکورہ جامعہ کی شکل تنظیم اور کارگزاری ہندوستان کی ضروریات کے ساتھ بہترین مناسبت رکھتی ہے اور اس کی تقلید مفید ہو سکتی ہے گو تفصیلات میں بعض تغیرات لازم ہونگے۔

۴۲ و ۴۳۔ عوام کی تعلیم :- اب ہماری توجہ ممکنہ حد تک ایک ایسے معاملے کی طرف منحطف ہونی چاہیے جو نسبتاً زیادہ اہم ہے اور جس کے متعلق ہمیں لازماً اعتراف ہے اب تک بہت زیادہ غفلت برتی گئی یعنی یہ کہ مفید اور کارآمد علوم جو زندگی کی ہر منزل کے لیے موزوں ہوں کس طرح عہدگی کے ساتھ عوام کی اُس کثیر تعداد تک پہنچائے جا سکتے ہیں جو اپنی محدود کوششوں کے ذریعے کوئی قابل قدر تعلیم حاصل کرنے سے بالکل قاصر ہے، لہذا ہم چاہتے ہیں کہ اس مقصد کی جانب آئندہ زیادہ خصوصیت کے ساتھ کھوج مت کی علی تداریک سازش دیکھیں اور اس کے حصول کے لیے ہم معارف کے معتد بہ اضافے کو منظور کرنے پر آمادہ ہیں۔

ایسے مدارس ہندوستان کے ہر ضلع میں موجود ہونے چاہیں جن کا مقصد یہ نہ ہو کہ چند نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے بلکہ یہ ہو کہ موجودہ حالات کی بہ نسبت زیادہ مواقع ایسی شایستگی تعلیم کے حصول کے لیے ہیا کیے جائیں جس کے ذریعے تعلیم یافتہ اشخاص زندگی کی بہ حیثیت میں سوسائٹی کے زیادہ مفید ارکان بن سکیں۔ ان مدارس کی نگرانی مسلسل اور محنت ط طور پر ہونی چاہیے اور ان کے طلبہ کو دیگر مدارس میں ایسے وظائف مقرر کر کے تعلیمی ترغیب دی جا سکتی ہے جو ان میں سے بہترین طلبہ کو بطور صلہ قابلیت عطا کیے جائینگے۔

۵۱ و ۵۲۔ رقمی امداد :- اس امر کے عدم امکان کے لحاظ سے کہ ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے کافی ذرائع ہیا ہونے کے لیے جو کچھ کیا جانا چاہیے وہ تنہا کھوج مت ہی کرے نیز اس امر کے لحاظ سے کہ نقدی امداد کوششوں سے حاصل کی جا سکتی ہے گران کی ترغیب سلطنت کی جانب سے اب تک نہیں دی گئی ہم اس لازمی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خصوص میں ہندوستان کی

ضروریات کی فراہمی کا مفید ترین طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت کے ذریعے اس امداد کو جاری رکھا جائے جو تعلیم یافتہ اور دولت مند باشندگان ہند اور دیگر نیک نہاد اشخاص کی کوششوں اور فیاضیوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

لہذا ہم نے ہندوستان میں رسمی امداد کا طریقہ اختیار کرنے کا تصفیہ کیا ہے جو اس ملک میں بہت بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا ہے اور اس طرح سرکاری رقوم کے علاوہ مقامی ذرائع سے امداد حاصل کرنے کی بنا پر ہم اطمینان کے ساتھ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ تعلیم کی رفتار ترقی آس ترقی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہو جائیگی جو حکومت کی جانب سے جس امداد، مصارف کی صورت میں ظاہر ہوگی نیز مذکورہ طریقے سے مزید فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ مقامی اغراض کے لیے مقامی جدوجہد اور اتحاد پر اعتماد کرنے کی قوت نشوونما پائی رہیگی جو خود بنفسہ کسی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کم اہم نہیں ہے۔

۳۔ تعلیم نسواں :- ہندوستان میں تعلیم نسواں کی اہمیت کے متعلق مبالغے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ہم نے مسرت کے ساتھ ان آئنا کا مشاہدہ کیا ہے جو متعدد باشندگان ہند اپنی دختروں کو عمدہ تعلیم دینے کی روز افزوں خواہش سے ظاہر کر رہے ہیں۔ اس ذریعے سے قوم کی تعلیمی اور اخلاقی حالت میں مردوں کی تعلیم کی بہ نسبت ایک بہت زیادہ موزوں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ زنانہ مدارس ان مدارس میں شامل ہیں جنہیں رسمی امداد دی جاسکتی ہے اور ہم ان کوششوں سے جو اس خصوص میں کی جا رہی ہیں اپنی دلی ہمدردی ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۴۔ مذہب :- معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کے متعلق ہماری بورائے اس کی نسبت بہت غلط فہمیاں موجود ہیں۔ یہ درس گاہیں ہندوستان کی کل آبادی کے فائدے کے لیے قائم کی گئیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ لازم تھا اور ہے کہ جو تعلیم ان درس گاہوں میں دی جائے وہ قطعی دنیوی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سچیل گاہوں اور مدرسوں کے کتب خانوں میں

رکھی گئی ہے اور طلبہ بلاخر اجمت اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں ہماری خواہش یہ نہیں ہے کہ ہم ایسی تشریحات کو ممنوع قرار دیں یا ان سے بیزاری کا اظہار کریں جو عیسائی مذہب کے معاملے کے متعلق طلبہ اپنے استادوں سے بطور خود دریافت کریں بشرطیکہ ایسی معلومات مدرسے کے غیر اوقات میں ہیا کی جائے۔ چونکہ اس قسم کی تعلیم دونوں جانب سے بالکل اختیاری ہوگی اس لیے اس اقل بدگمانی کو بھی روکنے کے لیے ہم انہیں عیسائی بنانے کی غرض سے حکومت کے اثر کو کام میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ لازم ہے کہ اس معاملے کی طرف مہتممان تعلیمات اپنے مقررہ معائنوں کے وقت کوئی توجہ نہ کریں۔



ساتواں باب

صحافت کی آزادی

یہ فطری بات تھی کہ مغربی علوم اور تخیلات کے وارد ہوتے ہی ہندوستانی زندگی میں عام صحافت کو بڑا دخل ہو جائے۔ اس مسئلے کے متعلق جو پہلے بھی پیش تھا اور اب بھی ہے کہ حکومت کو صحافت پر کس حد تک نگرانی رکھنی چاہیے۔ آراء میں وسیع اختلافات ہیں۔ پہلا ہندوستانی اخبار موسوم بہ "کنیرگزٹ" ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا۔ مسٹر سد رگیش کی شہادت کے مطابق جو ۱۸۳۲ء میں مجلس متحدہ کے روبرو دی گئی تھی صحافت "سرکاری عہدہ داروں پر حملے کرنے میں سختی بلکہ کینٹیک کی حد تک پہنچ گئی تھی" لیکن ان قیود کے سوا جو قانون انگلستان کی رو سے آزادی صحافت پر عاید کی گئی تھیں مزید قیود غیر ضروری سمجھی گئیں۔ ہندوستانی صحافت پر سب سے پہلے مارکوہیس آف ولزلی نے فرانس کے ساتھ جنگ کے نازک زمانے میں احتساب قائم کیا۔ "اولین ضوابط نے اخباروں کو

۱۔ ملاحظہ ہو مسٹر وارڈن رکن مجلس ہٹی کی شہادت جو ۳۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو ملن متھ کے روبرو دی گئی تھی۔

عام احکام یا بحری خسروں اور جہازوں کی آمد و رفت کی اطلاعات شائع کرنے سے منع کر دیا یہ مقصود یہ تھا کہ تجارت اور سلطنت کے مفاد کو ہمارے دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ہندوستانی سمندر اس زمانے میں فرانسیسی قزاقی جہازوں سے بھرے ہوئے تھے اور یہ انکشاف ہوا کہ جہازوں کے متعلق جو اطلاعات اخبار میں طبقے کی دلچسپی کے لیے درج کی جاتی تھیں وہ ہر اس مقام تک پہنچائی جاتی تھیں جہاں ان جہازوں کے افسر ہوتے تھے جنہیں ان اطلاعات سے اس امر کا موقع ملتا تھا کہ تجارتی جہازوں کو راستے میں روک لیں اور برطانوی محافظہ جہازوں سے بچ نکلیں۔ ۱۸۳۳ء میں مسٹر آرم نے جو گورنر جنرل کی حیثیت سے عارضی طور پر لارڈ ہسٹنگز کا جانشین ہوا صحافت کی گرائی کے متعلق سخت ترین ضوابط نافذ کیے۔ ہر اخبار حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے شائع کرنا پڑتا تھا جو کسی امر کی تحقیقات یا اطلاع کے بعد یا اس کے بغیر حکومت کی ضوابط بد بدیر نسخہ ہو سکتا تھا۔ مقتدر حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ حکومت کے طرز عمل پر ”ناگوار“ نکتہ چینی کو روک دے۔ مسٹر وارڈن کو جس نے مکمل کام پندرہ سال کی مدت تک بھی میں انجام دیا تھا ایک موقع پر جبکہ اس نے لارڈ کارنوالس کے گورنر جنرل مقرر ہونے کی اطلاع اخباروں میں شائع کرنے کی اجازت دی تھی لارڈ وارڈن کی رائے اس بار سرزنش کی تھی کہ حکمرانوں کے قریب الوقوع تبدل کے قبل از وقت اظہار سے اہم معاملات کے درجہ برہم ہو جانے کا امکان تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی قسمت میں اکثر یہ رہا ہے کہ جب کبھی وہ کسی جمعے کی صبح کو ”قریب کے جزیرہ سلسی میں دفتر کی مکان دور کر کے کچھ آرام پانے کے لیے جاتا تو وہ ہمیشہ واپس طلب کیا جاتا تھا کہ وہ دارالعوام کی ان تقریروں کو شائع نہ ہونے دے جن میں مقتدر حکام ہند کے اختیار کو وہ طرز عمل پر سخت نکتہ چینی ہوتی تھی۔ یہ امر کہ حکومت سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہیں کرتی تھی ذیل کی مراسلت سے واضح ہے:-

* صحافت پر سخت نگرانی | (۱)

بجند منت مسٹر ولیم آدم مسٹر ولیرز باکر فٹس مالکان ”کلکتہ کرانیکل“
محکمہ امور عامہ

کونسل چیمبر۔ ۳۱ مئی ۱۸۲۷ء

حضرات

”کلکتہ کرانیکل“ کے مضامین کا عام طرز گزشتہ کچھ مدت سے
حکومت اور معزز مجلس نظام کے ساتھ نہایت تحقیر آمیز ہے اور خصوصاً ۲۹ تاریخ
ماہ حال کے پرچے میں لکھی فقرے صحافت سے متعلق ضوابط کی عین خلاف ورزی میں
لکھے گئے ہیں لہذا مجھے آپ کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت ہوئی ہے کہ
کونسل کے معزز نائب صدر نے یہ تصفیہ فرمایا ہے کہ جو اجازت نامہ
۲۵ جنوری گزشتہ کو اخبار ”کلکتہ کرانیکل“ طبع اور شائع کرنے کے متعلق
آپ کو دیا گیا تھا وہ منسوخ کر دیا جائے چنانچہ اسے بذریعہ ہذا آج کی تاریخ سے
منسوخ کیا جاتا ہے۔

اطاعت کیش

سی۔ بشنگٹن

اعلیٰ معتمد حکومت

بدقسمت مالکان اخبار نے جواب میں حکومت سے یہ استدعا کی کہ
وہ مخصوص مضامین بنائے جائیں جو اس کی اس سخت ناراضگی کے اظہار کا باعث
ہوئے ہیں اور اس امر پر زور دیا کہ انہیں کوئی راست تنبیہ نہیں کی گئی تھی۔

(۲)

محکمہ امور عامہ

کونسل چیمبر۔ یکم جون ۱۸۲۷ء

جناب من

آپ کا خط دیر وزہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کیے جانے پر مجھے آپ کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت ہوئی ہے کہ کونسل کے معزز نائب صدر کے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ان قابل اعتراض فقروں کے متعلق جو ۲۹ تاریخ ماہ گزشتہ کے ”کلکتہ کرائیکل“ میں درج تھے میرے مراسلہ دیر وزہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے زیادہ مخصوص طور پر ان کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ مجھے یہ بھی ظاہر کر دینے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے خط کے باقی حصے کا کوئی جواب اس کے سوا ضروری نہیں ہے کہ جو تینہیں عام طور پر دوسرے مدیران اخبارات کو دی گئی تھیں وہ آپ کی اطلاع کے لیے کافی تھیں اور یہ کہ حکومت ”کلکتہ کرائیکل“ کی اشاعت جاری رکھنے کے متعلق آپ کو اجازت دینا مناسب نہیں سمجھتی۔

اطاعت کیش
سی۔ لٹنگٹن
اعلیٰ مفید حکومت

”کلکتہ کرائیکل“ اور دیگر اخبارات کی نسبت حکومت کا طرز عمل ایک خندک جابرانہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں صحافت پر نگرانی کی ضرورت تھی جس کی پرزور نائید ماؤنٹ اسٹوارٹ الپھنستون جس نے پہلی گڑ کے مدیر مسٹر فیروز کو جلا وطن کر دیا اور سر تنھاس منرو جیسے آزاد خیال مدبروں نے کی۔ موحسرا الذکر نے اس پر زور دیا کہ آزاد صحافت سے ترقی ملک میں خدا ندازی ہوگی اور باسانی فوج میں عام بغاوت ہو سکیگی جس میں عوام کی جماعت عظیم بھی شریک ہو جائیگی۔

* ہندوستان میں آزاد صحافت کے خطرات | اگر صحافت آزاد ہو تو ہم

*Source.—(i) Evidence of Mountstuart Elphinstone before the Select

ایک ایسی حالت میں مبتلا ہو جائیگی جس کا نتیجہ اب تک کسی سلطنت کو نہ ہوا ہوگا۔ دوسرے ممالک میں صحافت ملک کی اصلاح اور عوام کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ تدریج ترقی پاتی گئی ہے لیکن ہمیں بیک وقت یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ نظریات اور ایشیا کے تقصبات و مذہبی جذبات کا مقابلہ کرنا پڑیگا اور یہ دونوں چیزیں ان اشخاص کی ادھوری تعلیم کے باعث جن سے ہر معاملے میں خطاب کیا جائیگا زیادہ جہیب ہو جائیگی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک اجنبی کچھ بہت جو علانیہ تلوار کے زور سے قائم کی گئی ہو مذکورہ حالات میں اپنی جگہ پر مدت دراز تک برقرار رکھتی ہے؟

* میں اس ملک میں آزاد صحافت کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم نے اپنی قوت کو جس اصول پر قائم رکھا ہے اس کی رو سے رعایا کو کبھی آزادی رہی ہے نہ آئندہ کبھی دی جاسکتی ہے۔ پس میں رعایا کے امن و امان اور حکومت کے قیام کے لیے یہ لازم سمجھتا ہوں کہ تمام موجودہ قیود جاری رکھی جائیں۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں صحافت کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے کوئی چیز اس آزادی سے زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتی مفید معلومات رعایا میں پھیلانے اور بہتر حکومت کی طرف مائل رہنے کی بجائے وہ رعایا میں عدول علمی بناوت اور پریشانی پیدا کر دیگی۔۔۔۔۔ آزاد صحافت اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں اور مل کر زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتیں۔ کیونکہ اس سوال کا کہ آزاد صحافت کا پہلا فریضہ کیا ہے جواب یہ ہے کہ ملک کو اغیار کی حکومت سے آزاد کیا جائے اور اس ایک مقصد عظیم کے لیے دیگر تمام کم اہم امور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی نتیجہ لازمی طور پر پیدا ہوگا اگر ہم فی الواقع صحافت کو ہندوستانوں اور یورپیوں دونوں کے لیے آزاد کر دیں۔

آزاد صحافت کے حامیوں کا بیان یہ ہے کہ وہ ہمارے نظام حکومت ہند کی نیز ہندوستانیوں کی حالت اور ان کے دل و دماغ کی اصلاح جانتے ہیں لیکن یہ پسندیدہ مقاصد مجھے یقین ہے ان کے تجویز کردہ ذرائع سے قطعاً حاصل نہیں ہو سکتے۔ دواہم امر یہیں جو ہمارے یہاں کے معاملات کے انتظام میں ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔ پہلا امر یہ ہے کہ ہماری حکمرانی طویل سے طویل زمانے تک قائم رہنی چاہیے اور دوسرا یہ کہ جب کبھی ہم اس سے بکدوش ہونے پر مجبور ہوں تو ہم ہندوستانیوں کو باہمی تعلق کے اثر سے ایسی ترقی یافتہ حالت میں چھوڑیں کہ وہ بطور خود ایک آزاد و باکمال قوم بن کر باقاعدہ حکومت قائم کرنے کے قابل ہوں۔ اگر اس مقصد کی کبھی تکمیل ہو سکتی ہے تو وہ صرف مشروط صحافت کے تحت ممکن ہے۔

آزاد صحافت اس مقصد کے حصول میں سہولت پیدا کرنے کی بجائے اسے بالکل ناقابل عمل بنا دیتی کیونکہ عمل اصلاح میں سخت کرنے سے ان تمام فوائد کا خاتمہ ہو جائیگا جو زیادہ محتاط و معتدل کارروائی سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ایسی قیود جیسی کہ تجویز کی گئی ہیں ہندوستانیوں میں علوم کی ترقی کو نہیں روکنی بلکہ اسے اپنی حقیقی رفتار پر چھوڑ کر اور فوجی فساد و شورش سے محفوظ کر کے اس کی خاص ہو جائیگی۔ اس کی حقیقی رفتار یہ نہیں ہے کہ اخبار اور رسالے ان ہندوستانیوں میں گشت کر آئے جائیں جو یورپیوں کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہوں بلکہ یہ ہے کہ تعلیم آہستہ آہستہ عوام کی ساری جماعتوں میں پھیلانی جائے اور اخلاقی و مذہبی تعلیم کی اشاعت قوم کے ہر طبقے میں کی جائے۔ آزادی اور سوراخ کی خواہش جو ہر ملک میں علوم کی ترقی کے ساتھ ہی ظاہر ہوتی ہے عوام میں پیدا ہونی اور پھیلنی چاہیے قبل اس کے کہ وہ فوج تک پہنچے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان میں عام ہو کر ریل میٹر ٹیکہ جم آئے غیر موزوں محبت سے ایسے تغیرات کو جن کے لیے لازماً پشت و پشت چاہئیں چند ہی سال میں بددے عمل لانے کی کوشش کر کے

نذر و کیس۔ چہر آمیز و منصفانہ حکومت کرنے سے ہندوستانیوں میں مفید کتب کی اشاعت کو ان کے مذاہب پر حلقے کیے بغیر فروغ دینے سے ان کے متعدد مدارس کی حفاظت کرنے سے ایسے مدارس کی جہاں بہترین نظام تعلیم قائم ہے اعزازی یا مالی امتیازات کے ذریعے قدر افزائی کرنے سے ایسے اشخاص کو جو امداد کے محتاج ہوں محاصل ملکی کی کچھ رقم کبھی کبھتے کے طور پر دینے سے اور سب سے مقدم یہ کہ ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی اصلاح عملی محنت برداشت کر کے انہیں ملک کے دیوانی نظم و نسق میں ایک بڑا حصہ دینے اور حصول علم کی ترغیب کے طور پر انہیں اعلیٰ خدمات و مناصب پر مامور کرنے کی توقع دلانے سے ہم ہندرج کی توشہات کو مٹا سکتے ہیں اور ہندوستان کے باشندوں میں وہ تمام ترقی یافتہ خیالات اور نظریات پیدا کر سکتے ہیں جو ہمارے ملک میں رائج ہیں۔

اگر ہم متضاد طریقہ اختیار کریں۔ اگر ہم چند یورپی مدیران اخبارات کے محض نفع کی خاطر ایک بے لگام صحافت کو ہندوستانیوں کے درمیان یورپی کردار و اقتدار کی بالکل تھکر کرنے کی اجازت دیں تو گویا ہم اپنی ہندوستانی افواج میں اضطراب کا بیج بوئیں گے اور بغاوت کے خدشے سے کبھی محفوظ نہ رہیں گے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی موجودہ ہنس کی بہ نسبت زیادہ سمجھ دار ہو جائیں یا افراد و اقوام کے حقوق سے واقفیت حاصل کر لیں۔ جو کچھ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دلوں سے ان کے سرداروں اور یورپی کردار کا موجودہ احترام غلط ہو جائے اور یہ صورت جب کبھی پیش آئیگی تو وہ اپنے ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ قوت اور مال غنیمت کے لیے ہمارے خلاف کھڑی ہو جائیں گی۔ ہم ایک ایسی آزمائش کر رہے ہیں جو دنیا میں آج تک کبھی نہیں کی گئی یعنی ایک غیر ملک پر دہی فوج کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں اور اس فوج کو آزاد صحافت کے ذریعے یہ سکھا رہے ہیں کہ ہیں خارج کر کے اسے اپنے ملک کو آزاد کرنا چاہیے۔ صرف ہندوستانیوں کے متعلق ہی صحافت کو خوف کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے

اور صرف اسی وقت جب وہ ہماری ہندوستانی افواج میں شورش پیدا کر دیگی اس کے خطرناک اثرات محسوس ہونگے۔ بہت سے اشخاص غالباً ہندوستانی معافیت کی کوششوں کی خوب مدح سرائی کرینگے اور بہت آرزو کئے ساتھ ہندوستانیوں میں عاجلانہ اشاعت علوم کی امیدیں باندھینگے، لیکن اس کے برخلاف اسی صحافت کی بنا پر ایک ایسے انقلاب عظیم کی تیاری ہو رہی ہے جو ہمارے اقتدار کو زور کے ساتھ قبل از وقت برخاست کر کے تمام مذکورہ امیدوں پر پانی پھیر دیگا اور ہندوستان کو ایسی ناقابل اصلاح مملکت میں ڈال دیگا جو اس حالت کی بہ نسبت جسے ہم نے ابتدا میں دیکھا تھا زیادہ ختم ہوگی۔

مذکور بالا آرا کے نظر کرتے ان اخبارات کی سرکاری فہرست کو یہاں درج کرنا جو اس زمانے میں آبادی کے تین اہم مرکوزوں سے شائع ہوتے تھے خالی از حقیقی نہ ہوگا۔

* مطبوعات ہند ۱۹۰۷ء کے اوائل میں

سکلتہ

روزنامے:-	انگریزی اخبار
بنگال ہرکوروا اینڈ کرائیکل	سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی
جان بل	جیو۔ پرنٹ چارٹرڈ
انڈیا گزٹ	جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی
انجین ناموں کے سرورہ اخبار:-	
انڈیا گزٹ	جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی
بنگال کرائیکل	سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

دوروزہ اخبار :-

گورنمنٹ گزٹ

بنگال ہیرلڈ

کلکتہ لائبریری گزٹ

اورینٹل آبزرور

دوبی اخبار :-

جام جہاں نما

سما چار جند و کا

سند تو نیز نسک

بنگادوت

سند کو مودی

ماہواری رسالے :-

کلکتہ بیگزین

گلیفنگس آف سائنس

کیلی ڈاسکوپ

کر سچین انٹیلیجنس

سہ ماہی رسالے :-

بنگال آرمی لسٹس

آرمی لسٹ ایچ ایم نورس ان انڈیا

کلکتہ کوارٹرلی رجسٹر

سال نامے :-

بنگال ایبول

بنگال سووینر

بنگال المیناک

کینیڈین اینڈ اینڈ کسٹ بنگال المیناک

جی۔ ایچ۔ پٹنن :-

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

جیو۔ پرنٹ چارڈ

ہری ہر دت

بھوانی چیم بنرجی

کشت موہن داس

بھولو ناتھ سین

گوبند چٹرجی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

ڈبلیو۔ تھیڈاکر اینڈ کمپنی

جے۔ جے۔ فلیوری

چرچ مشن پریس

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

جے۔ بی۔ اسکاٹ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی

بجکال ڈائریکٹری سیمول اسمتھ اینڈ کمپنی
 کلکتہ ڈائریکٹری جے. بی. اسکات اینڈ کمپنی
 مدراس میں تین انگریزی اخبار شائع ہوتے تھے: (۱) گورنمنٹ گزٹ
 (۲) مدراس گزٹ اور (۳) مدراس کوریئر۔ یہی میں دو اخبار تھے اور (۱) ڈی گزٹ
 اور (۲) کوریئر۔

مہر کوریئر کی روزانہ اشاعت کی تعداد تقریباً آٹھ سو تھی اور قیمت سات آنے۔ بجکال میں لارڈ ولیم بینٹنک نے ڈاک کے حصول میں بہت ہی تخفیف کر دی تھی۔ دو مقررہ شرحیں تھیں۔ (۱) حد معینہ کے اندر کے تمام مقامات کے لیے دو آنے اور (۲) اس حد کے باہر کے تمام مقامات کے لیے چار آنے۔ مدراس اور بمبئی میں ڈاک کی شرحیں نسبتاً بہت زیادہ تھیں۔ مثلاً مدراس سے کلکتہ تک ایک اخبار کے لیے ڈاک کا محصول ایک روپیہ چودہ آنے تھا۔

مسٹر آدم کے قانون صحافت کی سختی سے نیز اس کا پابندی سے جس کے ساتھ اس کی شرائط کی تعمیل کرائی گئی انگریز اور ہندوستانی دونوں طبقوں کے عوام میں بڑے غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔ رام موہن رائے نے موخر الذکر طبقے کی صداۓ احتجاج میں نمایندگی کی اور ویسی صحافت کی تائید میں ایک یادداشت پیش کی جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

* آزاد صحافت کے فوائد | یادداشت سے برطانوی حکومت کے ساتھ ہندوستانیوں کی وفاداری اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے کروڑوں روپے کی رقم حکومت کے سپرد کر دی ہے۔ زمینداروں نے حکومت پر اعتماد کر کے اپنے علاقوں کو

*Source.—Summary of Ram Mohan Roy's Memorial, reproduced in

S.D. Collet's "Life and Letters of Rajn Ram Mohan Roy." (Harold Collet.)

کمزور کرنے کی بجائے جیسا وہ پہلے کیا کرتے تھے اب انہیں ترقی دی ہے۔ انہوں نے نیولین کے معرکوں کے زمانے میں برطانیوں کی فتح کے لیے دعا کی تھی۔ وہ ادبی و سیاسی اصلاحات سے جو برطانوی اثر کے باعث عمل میں آئیں مسرور ہوئے ہیں۔ وہ مملکت میں جہاں برطانوی راج کی خوب شہرت ہے سب سے زیادہ وفادار ہیں۔ وہ کم تر محاصل کے ساتھ ساتھ ملکی اور مذہبی معاملات میں آزاد رہ کر برطانیہ نشا اور عایا سے کچھ کم وفادار نہیں ہیں۔ ان اداروں میں جو ہندوستانیوں کی ذہنیت کی اصلاح اور ان کی حالت کی بہتری کی طرف متوجہ تھے ہندوستانی صحافت بھی تھی خصوصاً چار ہندوستانی اخباروں کی طباعت جن میں سے دو فارسی میں تھے اور دو بنگالی میں۔ ان اخباروں نے حکومت کی تحقیر کرنے یا اختلاف بڑھانے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہندوستانی مصنفوں اور مدبروں نے ہمیشہ اپنے کو ”ایسے مضامین کی اشاعت سے“ باز رکھا ہے جو حکومت کے حق میں مضر ہوں۔ بریں ہم قانون نافذ کر دیا گیا ہے جس میں تمام اخبارات کے ساتھ ایسے اجازت نامے کی شرط لگا دی گئی ہے جو حکومت کی صوابدید پر منوخت ہو سکتا ہے۔

مزید براں یادداشت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جدید قانون سے ایک خاص قسم کی معلومات کی اشاعت کا ”کامل انسداد“ ہو جائے گا۔ واقف کار ہندوستانی برطانوی حکومت کے قابل ستائش نظام کی خوبیاں عوام کو سمجھانے سے قاصر رہیں گے۔ ہندوستانی اشخاص حکومت کو ان غلطیوں اور نا انصافیوں کی اطلاع دینے سے محروم رہ جائیں گے جو اس کے انتظامی عہدہ داروں کی جانب سے ملک کے مختلف حصوں میں ظہور پذیر ہوں۔ ایسے حق سے محروم کر دیے جانے کے بعد جس کا ناجائز استعمال انہوں نے نہیں کیا، آئندہ ہندوستانیوں کا برطانوی پناہ کے مخصوص حق پر فخر کرنا درست نہ ہو سکیگا۔ لیکن برطانوی حکومت یقیناً ایشیائی مطلق العنانی کی مثال کی تقلید اس توقع پر نہ کرے گی کہ عوام کو بحالت میں

بتلا رکھنے سے اقتدار برقرار رہیگا۔ تجربہ شاید ہے کہ ایک عمدہ حکومت اس وقت قومی ترین جاتی ہے جبکہ اس کی رعایا زیادہ روشن خیال ہوتی ہے۔ ہرنیک مالک کو جو انسانی کمزوریوں سے واقف ہو اور دوائی مالک کا احترام دل میں رکھتا ہو اس امر سے آگاہ ہونا چاہیے کہ ایک بڑی سلطنت کے انتظام میں غلطی کے سرزد ہونے کا امکان ہے اور نتیجہ جو شکایات پیدا ہوتی ہیں ان کی تحقیق کے فوری ذرائع کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن واحد موثر ذریعہ۔
 ”مطبوعات کی غیر مشروط آزادی“ ہے جو ملک کے باقاعدہ قانون کے تحت ہو۔
 محول بالا یادداشت صدر عدالت کے سامنے پیش کی گئی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی، لہذا ایک دوسری یادداشت جو رام موہن رائے ہی نے مرتب کی تھی ملک معظم باجلاس کونسل کے ملاخطے میں پیش کی گئی۔ حکومت وقت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان جدید انتظامات کو بدلنا جو حال میں سٹر آؤم نے جاری کیے ہیں خلاف عقل ہوگا لیکن جیسا زما نہ گزتا گیا اس سختی میں جس سے قانون کی تعمیل کرائی جاتی تھی معتد بہ کمی ہوتی گئی۔

ان تلخ حلوں کے باوجود جو عام صحافت میں لارڈ ولیم ہٹنک کی سیول اور فوجی اصلاحات کے متعلق کیے گئے اس نے صحافت کو عمدہ حکومت کی معاون خیال کیا اور اسے ممکنہ آزادی دینے کی خواہش کی۔ اگرچہ ان اصول پر حکومت عمل پیرا تھی تاہم قانونی قیود برابر جاری رہے۔ لہذا ستر چار برس تک انہوں نے قوانین صحافت کی تنبیہ کا فیصلہ کیا اور رائے عامہ کے اظہار کے لیے ایک بڑی آزادی عطا کر دی۔ ضروری احتیاط کے طور پر اس نے یہ انتظام کیا کہ ہر کتاب یا اخبار پر طابع اور ناشر کا نام ہونا چاہیے جو قانون کی کسی خلاف ورزی کی صورت میں ستر اے جرمانہ یا قید کا مستوجب ہوگا۔ اس طرح آزادی کو دہریہ سے احساس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ اس عمل کی بنا پر لارڈ ولیم ہٹنک کی خدمت میں ایک توصیفی سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ صحافت سے متعلق

اس کا طرز عمل "ان حالیہ پنجو توں میں سے ایک ہے کہ ہندوستان کی حکومت معقول و محفوظ طور پر ان اشخاص کے سپرد کر دی گئی ہے جو اس کے طریق انتظام سے بخوبی واقف ہیں۔"

مٹکالف نے اپنے جواب میں جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے جدید قانون کی نوعیت اور اس کے نفاذ کی اغراض بیان کی ہیں۔

* صحافت کی آزادی | اگر یہ استدلال ہو کہ علم کی اشاعت ہندوستان میں ہماری حکمرانی کے لیے انجام کار

مہلک ہوگی تو میں یہ بیان کر دینگا کہ نتائج خواہ کچھ ہی ہوں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم علم کے فوائد کو عام کر دیں۔ اگر ہندوستان برطانوی سلطنت کے ایک جزو کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ ہم اس کے باشندوں کو جہالت کی حالت میں مبتلا رکھیں تو ہماری حکومت ملک کے لیے ایک بلا ہوگی اور لازماً اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لیکن میں جہالت ہی میں خوف و خطر کی زیادہ معقول وجہ پاتا ہوں۔ میں علم کے فروغ جانے سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ہماری سلطنت کو مستحکم کرے گا تو ہمارے کو دور کرے گا، شقاوت قلبی کو رفع کر کے نرمی پیدا کرے گا، ہماری حکومت کے فوائد کے متعلق ایک معقول عقیدہ قائم کرے گا، حاکم اور محکوم کو ایک دوسرے کا بہتر و نیا دیکھا اور جو اختلافات انہیں جدا رکھتے ہیں ان کو بند کرے گا، کم کر کے آخر کار مٹا دے گا۔ بہر حال ہندوستان کی آئندہ حکومت کے متعلق شیشیلز دی خواہ کچھ ہی ہو ہمارا صریحاً یہ فرض ہے کہ جب تک یہ ملک ہماری تحویل میں رہے ہم رعایا کی بہبودی کے لیے اپنی انتہائی قابلیت کو کام میں لائیں۔ ترقی علم جس کا ایک نہایت موثر ذریعہ آزادی صحافت ہے ملائیہ فرض مذکور کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حکم ربانی سے ہیں یہاں رہنے کی

اجازت صرف اس لیے ہے کہ ہم محاصل ملکی جمع کریں ایسے محکموں کے مصارف جو قبضہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں ادا کریں اور گمی کو پورا کرنے کے لیے قرض وار بن جائیں۔ بے شہہ ہم یہاں بلند تر نفا صد کے لیے ہیں جن میں سے ایک اعلیٰ معلومات و تہذیب اور یورپی علوم و فنون کو اس ملک میں پھیلانا ہے تاکہ باشندگان ملک کی حالت ترقی پذیر ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے یقیناً کوئی اور چیز آزادی صحافت سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔

کال ترین آزادی عطا کرنے کے لیے جو اغراض عامہ مہول کی بنا پر پیش نظر رہی ہوگی ان کے علاوہ صحافت ہند کی حالت میں کچھ ایسے امور بھی تھے جن کے باعث وہ تجویز جواب پیش کی گئی ہے تقریباً ناگزیر ہو گئی ہے۔ صحافت ساہا سال کی مدت سے جس میں سابق گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹن کا کل دور حکومت شامل ہے علاوہ آزاد رہی ہے اور اگرچہ بنگال میں قیود کے متعلق ایسے قوانین موجود تھے جن کی رو سے حکومت کو نہایت زبردست اختیارات حاصل تھے تاہم ان کا استعمال عملی طور پر کسی غرض کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہایت نفرت انگیز تھے۔ ان سے حکومت کو ایسے من مانے اختیارات مل گئے جنہیں برطانوی رعایا خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کوئی حکومت اب عالمگیر رائے کو مانگتے کیے بغیر ان کا نفاذ نہیں کر سکتی۔ لارڈ ولیم بینٹن نے صبر و تحمل سے کام لے کر جو آزادی عطا کی تھی اس کے بعد کسی حکومت کو ان قوانین کے نفاذ کی جرأت ہی نہ ہو سکتی تھی بجز اس صورت کے کہ تفحیک و تحقیر سے انتہائی بے حسی اس کے حصے میں آئی ہو۔ اگر ان کو مفید بھی فرض کیا جاتا تو بھی وہ بالکل بیکار تھے اور چونکہ ان سے لازمی طور پر حکومت کی تحقیر ہوتی تھی اس لیے زیادہ مدت تک ان کو برقرار رکھنا ایک لغو فعل ہوتا۔^۱

ان قوانین کا ذکر کرتے وقت میں اس شخص کی طرف رجوع کرنے سے

باز نہیں رہ سکتا جو ان کی منظوری کے زمانے میں برسر حکومت ہوئے کے باعث ان کا بانی ہونے کا پورا الزام اپنے سر لیتا ہے۔ وہ دنیا کی بنائیت اعلیٰ پاک طینت اور نیک ہندو ہستیوں میں سے ایک تھا۔ ان قوانین کی تحریک کرتے وقت وہ یقیناً نہایت راست بازانہ و صادقانہ اغراض سے متاثر ہوا ہوگا جیسا کہ وہ ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ اب زندہ اور برسر حکومت ہوتا تو غالباً سب سے پہلے وہ ان قوانین کی منیج کی تحریک کرتا جو اس نے باقی میں ضروری خیال کیے تھے مگر جو اب غیر مفید اور نفرت انگیز نظر آتے ہیں۔ اس امر کو کہ ان قوانین کے خلاف رائے عامہ کس حد تک پھیلی ہوئی ہے کوئی اور چیز اس رسوائی کی بہ نسبت زیادہ نمایاں طور پر ظاہر نہیں کر سکتی جسے قوانین مذکور نے ایک ایسے شخص کی یاد سے منسوب کر دیا جو ہر طرح کی تالیف کا کامل مستحق اعلیٰ قابلیتوں اور اہم ترین سرکاری خدمتوں سے محنت ازاور نیک و شرافت کا پتلا تھا۔ اس سے تمام واقف حال اشخاص محبت رکھتے تھے اور اس کی تعریف و تعظیم کرتے تھے لیکن عوام نے جو اس کے اوصاف سے لاعلم تھے محض ان قوانین کی بنا پر جن سے وہ نفرت کرتے تھے اسے بدنام کیا۔

بجائے اور اگرہ کے احاطوں میں سوال یہ تھا کہ آیا ان قوانین کو برقرار رکھا جائے یا منسوخ کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ قوانین اس قدر ملعون تھے کہ ان پر عمل نہ ہو سکتا تھا اور ان کا استعمال ہر لحاظ سے منزوک ہو چکا تھا۔ بمبئی کے محکوم صوبوں میں بھی سوال مذکور اٹھا تھا لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پس اب سوال یہ تھا کہ آیا ان قوانین کو ان مقامات پر نافذ کیا جائے جہاں اب تک ان کا نفاذ نہیں ہوا ہے؟ کیا ان نفرت انگیز قیود کو وہاں عاید کیا جائے جہاں پہلے ہی سے کال آزادی ہے؟ کیا قانون کی بجائے مطلق العنانی قائم کی جائے یا قانون ہی سے آزادی پر قیود عاید کر دی جائیں؟ ہر اس میں کوئی مقامی قانون تھا نہ کوئی ذریعہ ایسا تھا جس سے کسی شائع شدہ چیز کے متعلق کسی شخص کو ذمہ دار قرار

دیا جائے۔ اچانک بمبئی میں پہلے ہی سے ایک قانون موجود تھا جو ایسا ہی آزادانہ تھا جیسا اب تمام ہندوستان کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ بمبئی اور مدراس میں ایسے قوانین بنانا جو کامل آزادی کے حامی نہ ہوں گویا ان پر ایسی قیود عائد کرنا تھا جو پہلے سے موجود نہ تھیں۔ یہ طریق کار یقیناً غلط ہونا اور بالکل غیر ضروری تھا، البتہ مدراس میں جہاں آزادی ذمہ داری کے بغیر موجود تھی ایک قانون کی شدید ضرورت تھی۔ اس قسم کی صورت حال کے متعلق ہم جزوی طور پر قانون نہیں بنا سکتے تھے اور ہمارے غور و خوض کی حقیقت یہ ہے کہ جو قانون اب پیش کیا گیا ہے وہ بہترین ہونے کے علاوہ انتہا اطمینان بخش ہے جتنا ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ پوری آزادی عطا کرتا ہے اور اس کی تمام ذیلی شرائط کا متناصف مناسب ذمہ داری پیدا کرنا ہے۔ کسی مقام کے حالات یکساں طور پر قائم نہیں رہ سکتے، لہذا کسی مزاحم قانون کا نفاذ قانون سازی میں افسوس ناک ترقی معکوس سے موسوم ہونا اور زمانے کے اقتضا کے بالکل مخالف ہوتا۔

مٹکانے کے عمل کے بالواسطہ نتائج خواہ کچھ ہی نکلے ہوں لیکن اس عمل کا فوری اثر یہ ہوا کہ صحافت کے بھاری کام میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مسٹر مارشمن جس نے سیرامپور کالج میں ایک عیسائی مبلغ کی حیثیت سے برسوں کام کیا تھا ایک ہفتہ وار رسالہ فرینڈ آف انڈیا کا مدیر تھا اور کیتان کیٹی نے جو بعد کو سر جان کیٹی ہو گیا سرکاری جاری کیا۔ انہوں نے الگزینڈر ڈف کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ کے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ایک ایسے رسالے کی شدید ضرورت ہے جس میں مفکرانہ خیالات خواہ ان کی رائیں سیاست اور مذہب کے متعلق کچھ ہی ہوں انہیں خیال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ کلکتہ ریویو کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا پہلا نمبر مئی ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔

* کلکتہ ریویو کی پہلی اشاعت

اس کے (کئی کے) مکان میں ایک روز

شام کا وقت بسر کرنے کے کچھ ہی
 مدت بعد مجھے اس کا ایک طویل خط ملا جس میں اس نے ہندوستان میں ایک
 اعلیٰ درجے کا سہ ماہی رسالہ جاری کرنے کی ضرورت کے متعلق اپنے خیالات
 ظاہر کیے تھے۔ صرف سر ہنری لارنس، مسٹر جان مارٹن اور کپتان مارشل وہ
 اشخاص تھے جن سے اس نے مشورہ کیا تھا اور اب اس امر کا یقین کرنے کے
 بعد کہ اشخاص مذکور اس تجویز سے متفق ہیں اس نے یہ معلوم کرنے کی
 خواہش کی کہ آیا میں ان کا شریک کار ہو کر باقاعدہ مضمون نگار ہو سکتا ہوں۔
 میں ہمیشہ ایک ایسے زوردار رسالے کی شدید ضرورت محسوس کرتا رہا ہوں
 جو ہماری سلطنت ہند کے اہم مسائل کا حق ادا کر سکے۔ لہذا مجھے فوراً یہ جواب
 دینے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوا کہ میں ایسے رسالے کی شدید ضرورت
 سمجھتا ہوں۔ میں نے صرف اتنا اور لکھا کہ سب کچھ اُن اصول پر منحصر ہو گا
 جن پر رسالہ جاری کیا جائیگا۔ اگر یہ اصول سیاسی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی
 اور مذہبی تمام حیثیتوں سے معقول ہونگے تو جو فائدہ ان سے حاصل ہوگا
 وہ نہایت عظیم الشان ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وہ ان امور اور دیگر
 افتتاحی مضامین کے اعتبار سے غیر معقول ہونگے تو اسی مناسبت سے
 ان کا برا اثر بھی زیادہ ہوگا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کے ساتھ
 خوب متحد ہو کر اس جدید رسالے کو چلانے میں بخوشی شریک رہوں گا بشرطیکہ
 وہ اولاً یہ عہد کر لیں کہ اس رسالے میں کوئی چیز ایسی شائع نہ ہوگی جو
 عیسائیت یا عام عیسائی رعایا کے مخالف ہو، اور ثانیاً یہ کہ جب کبھی مناسب
 موقع قدرتی طور پر پیدا ہو تو صحیح عیسائیت اور ہندوستان میں مبلغین کے
 ذریعے اس کی اشاعت کے متعلق صاف و صریح تشریحات کی جائیں گی۔

*Source.— "Life of Alexander Duff." Vol. II., P. 92. George Smith.

مسٹر کبھی نے فوراً مجھے یقین دلایا کہ یہ امور بجسٹہ اس کے خیالات کے منظر میں اور اگر میں پہلے نمبر کے لیے کوئی مضمون لکھنا چاہوں تو نفیس مضمون کا انتخاب وہ کلمۃ مجھ پر چھوڑ دینگا۔ چونکہ پہلی ہندوستانی یا ولندیزی تبلیغی انجمن سے متعلق نفیس نادر دستاویزات میرے یہاں موجود تھیں اس لیے میں نے تبلیغی انجمنوں کے کل معاملات پر ایک نہایت مفصل مضمون لکھا جس میں کوئی اہم پہلو ترک نہیں کیا گیا۔



انکھوال باب

کپنی کا آخری زمانہ

۱۸۵۳ء میں سب سے آخری قانون منشور لارڈ ڈالہوزی کے ہندو حکومت میں منظور ہوا۔ یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ کپنی کا زمانہ ختم ہونے کے قریب تھا کیوں کہ حسب سابق منشور کی تجدید پیش سال کی مدت کے لیے نہیں ہوئی بلکہ ”محض اس وقت تک جبکہ پارلیمنٹ کوئی دوسرا انتظام کرے“ تنازع کے اختیارات میں اضافہ ہوا اور یہ تھے پایا کہ نظما میں سے چھ کا تقرر تاج کی طرف سے عمل میں آئے اور ہندوستانی تقررات کے بارے میں مجلس نظما کو جو اقتدار حاصل ہے وہ منسوخ ہو جائے اور آئندہ مجلس نگراں کے وضع کردہ ضوابط کے مطابق اقتدار مذکور کام میں لایا جائے۔ ان ضوابط کی رو سے سول ملازمان متہد کا انتخاب عام مقابلے کے ذریعے ہونے لگا۔ صوبہ بنگال پر ایک لفٹینٹ گورنر کا تقرر کر کے جسے صوبہ جات شمال مغربی کے لفٹینٹ گورنر کے مائل اختیارات دیے گئے حکومت ہند کو بنگال کی براہ راست نگرانی سے سبکدوش کر دیا گیا۔

۱۸۵۲ء کے قانون سے جو اہم ترین تغیر ہوا وہ یہ تھا کہ قوا عد و ضوابط مرتب کرنے کی غرض سے گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا دی گئی۔ یہ ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ ابتدا میں رکن قانونی کو کونسل کے عام اجلاس میں شریک ہونے اور رائے دینے کا حق حاصل نہ تھا البتہ اس کی شرکت و رائے دہی صرف ان اجلاسوں میں ہو سکتی تھی جو قانون سازی کے معاملات سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ اصول اب ہنگال کے مجلس ایک رکن عدالت عالیہ اور ہنگال مدرس بمبئی و صوبہ جات شمال مغربی کی مقامی حکومتوں کے ایک ایک نامزد کردہ رکن کو شامل کر کے وسیع کر دیا گیا۔ سوالات کرنے اور جماعت عامہ کے کاموں پر تنقید کرنے کے بارے میں کونسل کو بہت کچھ آزادی دی گئی جس سے جدید ارکان نے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۱ء کے قانون کی رو سے ان حقوق میں کمی کر دی گئی۔ ۱۸۵۳ء کے قانون کی منتخب وہم و نہات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۸۵۳ء کا قانون منشور | ۱۵۔ صوبہ اگرہ کی شکست و ریخت۔

صوبہ جات شمال مغربی کے لیے ایک لفٹیننٹ گورنر کا تقرر۔۔۔ ہنگال کے احاطہ فیض ولیم کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے متعلق شاہ ولیم چارم کے تیسرے اور چوتھے سال جلوس کے قانون مذکور کی دفعات متعلق میری تانا کو مجلس نظام مجلس مامورین برائے معاملات ہند کے زیر نگرانی و ہدایت کوئی دو سراسر حکم صادر نہ کرے اور قانون مذکور بالا کی ان دفعات کے دوران متعلق میں صوبہ جات شمال مغربی کے لیے جو اس وقت احاطہ فورٹ ولیم ہنگال کے زیر حکومت تھے ایک لفٹیننٹ گورنر کے تقرر کی اجازت دینے والی دفعہ بحال رہی اور اس کے تحت جو تقررات اور انتظامات ہوئے وہ بھی قائم رہ گئے۔

۱۶۔ بنگال کے لیے ایک گورنر بالفینٹ گورنر کا تقرر :- مذکور بالا نگرانی و ہدایت کے تحت مجلس نظام کے لیے یہ قانوناً جائز ہو گا کہ قانون ہذا کے منظور ہو جانے کے بعد کسی وقت اگر وہ مناسب سمجھے تو اعلان کر دے کہ ہندوستان کا گورنر جنرل احاطہ فورٹ ولیم بنگال کا گورنر نہ ہو گا بلکہ اس احاطے کے لیے ایک علیحدہ گورنر مقرر ہو گا اور ایسی صورت میں احاطہ مذکور کے لیے وقتاً فوقتاً ایک علیحدہ گورنر کا تقرر ہوتا رہے گا۔ گورنر کے وقت تقرر سے نیز اس کے بعد قانون مذکور کی بنا پر ہندوستان کے گورنر جنرل کو احاطہ فورٹ ولیم بنگال کے لیے ڈپٹی گورنر مقرر کرنے کا جو اختیار حاصل تھا وہ منسوخ سمجھا جائیگا اور جب تک مذکور بالا بیج پر اس احاطے کے لیے ایک علیحدہ گورنر مقرر نہ ہو اس وقت تک مجلس نظام کے لیے یہ قانوناً جائز ہو گا کہ ہند کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو اختیارات عطا کر کے یہ ہدایت کر دے کہ وہ وقتاً فوقتاً کمپنی مذکور کے کسی ملازم کو جو ہندوستان میں دس سال ملازمت کر چکا ہو احاطہ فورٹ ولیم بنگال کے علاقوں میں سے اس حصے کا لفینٹ گورنر بنا دے جو فی الوقت مذکور بالا صوبہ جات شمال مغربی کے لفینٹ گورنر کے زیر حکومت نہ ہو اور اس طرح جو لفینٹ گورنر مقرر ہو اس کے اختیارات کی تصریح و تشریح کر دے ۔

۱۸۔ مقامی حکومتوں کی جغرافیائی حدود و بدلے کا اختیار :- مذکور بالا نگرانی و ہدایت کے تحت مجلس نظام کے لیے یہ قانوناً جائز ہو گا کہ وہ وقتاً فوقتاً اعلان کے ذریعے اس امر کا تعین کرتی رہے کہ کمپنی مذکور کی حکومت کے موجودہ ماتحت علاقوں میں سے کونسا حصہ یا کونسے حصے ان احاطوں اور لفینٹ گورنروں میں سے ہر ایک کے زیر اقتدار رہیں یا رہیں گے جو فی الحال ان علاقوں میں قائم ہیں نیز اس کے لیے یہ جائز ہو گا کہ مجلس نظام اپنی سہولیت و صوابدید پر ان احاطوں اور لفینٹ گورنروں کے علاقوں کی کوئی تقسیم و انتظام بیان کے متعلق جدید تقسیم و انتظام عمل میں لائے

۲۰۔ ملکہ مظہر سے کونسل کی رکنیت کی منظوری :- ہندوستان کی کونسل یا کسی احاطے کی کونسل میں جب کسی رکن معمولی کا تقرر مجلس نظام کی طرف سے

عمل میں آئے تو اس کی منظوری لازماً ملکہ معظمہ سے حاصل کرنی ہوگی جس کا اجراء شاہی ہر کے ساتھ بہ ثبت پستقل صدر مجلس مایورین برائے معاملات ہند ہوگا۔

۲۱۔ مکن قانونی کو کونسل میں شرکت و رائے زنی کی اجازت: بشاہ ولیم چہارم کے سال جلوس سوم و چہارم کے قانون مذکور کا وہ حصہ جس کی رو سے ہندوستان کی کونسل کے چوتھے مکن معمولی کو کونسل مذکور میں بجز ان اجلاسوں کے جو قوانین و ضوابط وضع کرنے کے لیے منعقد ہوں شریک ہوں اور رائے دینے کا حق حاصل نہ تھا منسوخ کیا جاتا ہے۔

۲۲۔ قانون سازی کا انتظام: ہند کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو قوانین و ضوابط وضع کرنے کے جو اختیارات اب حاصل ہیں انہیں بہتر طریقے پر کام میں لانے کے لیے گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کے علاوہ مندرجہ ذیل مختلف اشخاص شاہ ولیم چہارم کے سال جلوس سوم و چہارم کے قانون مذکور کے تحت ہندوستان کی کونسل کے ارکان قرار پائینگے اور ان کا تعلق قوانین و ضوابط وضع کرنے کے جملہ اختیارات مذکور بالا سے ہوگا اور وہ مشیران قانونی کے نام سے موسوم ہونگے (یعنی)

ا۔ ہر احاطے اور لفٹ گورنر کے علاقے سے جو فی الوقت مذکور بالا علاقوں میں قائم ہوا ایک ایک مکن جس کا تقرر وقتاً فوقتاً ہر احاطے کے گورنر اور ہر علاقے کے لفٹ گورنر کی طرف سے علی الترتیب عمل میں آئے اور ایسے مکن کا انتخاب ان اشخاص میں سے ہو جو کسی احاطے یا لفٹ گورنر کے علاقے میں کمپنی کی سیول ملازمت میں رہ چکے ہوں یا اس وقت موجود ہوں جبکہ تقرر مذکور ہو رہا ہوا و جنہیں کمپنی کی ملازمت میں دس سال گزر چکے ہوں:

ب۔ فورٹ ولیم کالج کی عدالت عظمیٰ کا میجر جس یا ایسی صدر عدالت کا میجر جس یا چیف جج جو مذکور بالا علاقوں میں جنہیں صدر عدالت کے اختیارات عطا کیے جائیں بعد کو قائم ہو:

ج۔ مذکور بالا صدر عدالت کے دیگر ججوں میں سے ایک یا اسی قسم کی آئینہ قلم ہونے والی صدر عدالت پر ملکہ معظمہ کے مقرر کردہ ججوں میں سے ایک جس کی

نامزدگی گورنر جنرل موصوف کی طرف سے عمل میں آئی ہو۔

نیز مجلس نگلہا کے لیے یہ قانوناً جائز ہو گا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو مجلس مامورین برائے معاملات ہند کی نیگوانی و حکم کے تحت ہندوستان کے گورنر جنرل کو اختیارات عطا کر کے یہ ہدایت کر دے کہ وہ وقتاً فوقتاً مذکور بالا مشیران قانونی کے علاوہ ایسے دو شخص کا انتخاب کرے جو کمپنی کی ملازمت میں دس سال رہ چکے ہوں اور انہیں قانون ہذا کے تحت کونسل مذکور کے مشیران قانونی کی حیثیت سے مقرر کرے بشرطیکہ ان مشیران قانونی کو جو قانون ہذا کے تحت ہندوستان کی کونسل میں منتخب ہونگے کونسل مذکور میں بجز ان اجلاسوں کے جو قوانین و ضوابط وضع کرنے کے لیے منعقد ہوں شرکت کرنے اور رائے دینے کا حق نہ ہو۔

۲۴۔ ضلع کروہ قوانین کے لیے گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت بشرطیکہ کوئی قانون یا ضابطہ جو کونسل مذکور نے وضع کیا ہو اس وقت تک نافذ یا شائع نہ ہو سیکے جب تک کہ اسے گورنر جنرل موصوف کی منظوری حاصل نہ ہو جائے خواہ وہ اس کے وضع ہونے وقت کونسل میں موجود رہا ہو یا نہ ہو۔

۳۵۔ تنخواہیں :- مندرجہ ذیل مختلف عہدہ داروں کو سالانہ تنخواہیں ایصال ہونگی جو علی الترتیب ان عہدہ داروں کے ناموں کے محاذی درج ہیں لیکن ان تنخواہوں میں مجلس نگلہا مجلس مامورین کی منظوری سے ایسی تخفیف کر سکیگی جسے وہ وقتاً فوقتاً مناسب سمجھے:

۱۔ سپر سالار افواج ہند کو اس کے مشاہرے اور سبھتے کی بجائے ایک لاکھ روپیہ سکے کمپنی؛

ب۔ ہر لفٹننٹ گورنر کو ایک لاکھ روپیہ سکے کمپنی؛

ج۔ ہند کی کونسل کے ہر رکن معمولی کو آٹھ ہزار روپیہ سکے کمپنی؛

د۔ ہند کی کونسل کے ہر مشیر قانونی کو (جو کسی اور خدمت پر مامور نہ ہو)

سچاس ہزار روپیہ سکے کمپنی؛

مذکور بالا تنخواہیں شاہ ولیم چارم کے سال جلوس سوم و چارم کے قانون مذکور کے ان قواعد و ضوابط کی پابند ہونگی جو تنخواہوں کے تین سے

متعلق ہیں لیکن کسی ایسے عہدہ دار کی تنخواہ جو اس قانون کے نفاذ سے قبل مامور ہو چکا ہو انہیں ہذا کے تحت کم نہ کی جائیگی۔

کچھ مدت سے ہر دو سیاسی جماعت کے رہنما خصوصاً ڈسٹر ایکٹل اس بات کو محسوس کرنے لگا تھا کہ اب ہندوستانی معاملات کے انتظام کو براہ راست تاج اور پارلیمنٹ کے تحت لے لینے کا وقت آگیا ہے۔ کمپنی کی حکومت اور حکومتِ دہلی کے نظام پر گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ لہذا ہم نے کمپنی کی اس عرضداشت کو جو اصل گورنر نے دارالامرا میں پیش کی تھی اور لارڈ پامرسٹن کی اس تقریر کو جس میں اس نے حکومتِ دہلی کے نظام کے نقائص کا ذکر کیا تھا نیز مسٹر مل کے اس مضمون کو جس میں اس نے حکومتِ کمپنی کی حمایت کی ہے ذیل میں جگہ درج کر دیا ہے۔

***نظامِ حکومتِ دہلی کی تائید | (ایسٹ انڈیا کمپنی کی عرضداشت)**

بلاخطہ عزرائکان دارالامرا و دارالعوام سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ پابلز پارلیمنٹ
بہ عرض عالی می رسانند

سائلمین نے ابتدا میں اپنے ذاتی مصارف سے اور اپنے ہی سیول و فوجی ملازموں کی مدد سے اس ملک کے واسطے مشرق کی عظیم الشان سلطنت حاصل کی۔ اس سلطنت کی بنیاد جس زمانے میں سائلمین نے ڈالی اس وقت سائلمین پارلیمنٹ کی نگرانی میں تھے نہ اس سے انہیں کوئی اعانت حاصل ہوئی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جبکہ پارلیمنٹ کے زیر نگرانی حکومتی جماعتوں کی مسلسل تبدیلی کے باعث سحر و قیاس کی دوسری طرف ایک زبردست سلطنت تاج برطانیہ عظمیٰ کے قبضے سے نکل رہی تھی۔

اس وقت سے اب تک تقریباً ایک صدی کا زمانہ گزرا ہے اس دوران میں اس ملک کے ہندوستانی مقبوضات کی حکومت و حفاظت کے تمام معارف انہیں مقبوضات کے محاصل سے پورے ہوئے ہیں اور برطانوی خزانے پر مطلق کوئی

بار نہیں پڑا ہے۔ اس قسم کی شہادت سائلیں کے علم و یقین کی حد تک تاج کے دیگر متغیر و غیر ملکی مقبوضات میں سے کسی کے متعلق نہیں پیش کی جاسکتی۔

اس امر کو صریحاً نامناسب خیال کر کے کہ برطانوی مقبوضات میں سے کسی علاقے کی حکومت اپنی مرکزی حکومت کے لیے نیاز نہ ہونی چاہیے پارلیمنٹ نے ۱۸۵۳ء میں یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت انگلستان کے ایک شعبے کو سائلیں کی حکومت ہند کی جملہ کارروائیوں پر نظر ڈالنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا کامل اختیار ہونا چاہیے چنانچہ اس وقت سے حکومت ہند کے اس شعبے میں جس کا فلق انگلستان سے ہے سائلیں اور تاج کے ایک وزیر کے باہمی مشورے اور مشترک ذمہ داری پر کام چل رہا ہے۔

اس انتظام پر مختلف اوقات مابعد میں جماعت مغتنہ نے مکرر غور و خوض کیا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اس کے عملی نتائج کے متعلق متغیر و مرتبہ احتیال کے ساتھ مکمل تحقیقات کی گئی جس کا نتیجہ ہر مرتبہ بھی نکلا کہ ہند کے نظم و نسق میں سائلیں جو اختیارات استعمال کرتے تھے ان کی تجدید ہوتی گئی۔ اس قسم کی تجدید کا آخری موقع جسے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ۱۸۵۳ء میں پیش آیا جبکہ اس انتظام کو جو تقریباً تین چوتھائی صدی سے جاری تھا بغض تیزات کے ساتھ قانوناً منظور کیا گیا اور وہ اب تک قائم ہے۔

بائیں ہمہ سائلیں کو ملکہ منظمہ کے وزرائے اپنے اس ارادے کی اطلاع دی ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون اس غرض سے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ملکہ منظمہ کے مشرقی مقبوضات ہند کی حکومت براہ راست تاج کے زیر اقتدار ہو جائے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہوگی جس کے باعث یقیناً ایسٹ انڈیا کمپنی آلہ حکومت کی حیثیت سے قائم نہ رہ سکیگی۔ سائین کوآن وجہ سے مطلع نہیں کیا گیا جن کی بنا پر ملکہ منظمہ کے وزرائے

کسی جدید تحقیقات کے بغیر ایسے نظام حکومت کے موقوف کرنے کی تجویز کی ہے جس کی توثیق اور منظوری پارلیمنٹ کی طرف سے کامل غور و خوض اور تحقیقات کے بعد مل میں آئی ہے اور اسے پانچ سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ چونکہ اس

ترمیم شدہ نظام کو نافذ ہوئے پورے چار سال سبھی نہیں گزرے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں اس کی کافی آزمائش نہیں ہوئی ہے۔

سائین کو اس امر کا علم نہیں کہ ملکہ مظہر کے وزرانے ترمیم شدہ نظام کو ناکام ثابت کیا ہے یا سائین پر کوئی سنگین یا معمولی الزام قائم کیا ہے۔ لیکن جس زمانے میں مذکور بالا تجویز پیش کی گئی ہے اس کے لحاظ سے سائین یہ خیال کرنے پر مجبور ہیں کہ اس تجویز کا باعث وہ افسوس ناک حادثات ہیں جو حال ہی میں ہندوستان میں واقع ہوئے ہیں۔

سائین ہر طرح اس بات پر آمادہ ہیں کہ بنگال کی فوج کی بغاوت کے متعلق پوری تحقیقات کی جائے اور جن اسباب قریب یا بعید کے باعث بغاوت مذکور پیدا ہوئی ان کا نینہ لگایا جائے۔ سائین نے حکومت ہند کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ برسر موقع تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کرے اور سائین کی یہ دلی خواہش ہے کہ اسی قسم کی تحقیقات اس ملک میں بھی معزز دارالامرا کی طرف سے عمل میں آئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا منظمی حکومت ہند کے دستور میں یا اس کے انتظامی ہمدہ داروں کے طرز عمل میں کوئی خرابی ایسی ہے جس سے بغاوت کے پیدا ہونے میں مدد ملی ہو یا اس کو فرو کرنے کی تدابیر میں کسی طرح کی مزاحمت ہوئی ہو نیز یہ معلوم ہو سکے کہ آیا خود بغاوت یا اس سے متعلق کوئی صورت حال ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت کے ناکام ہونے کی کوئی شہادت پیش کرتی ہے۔

اگر یہ صحیح سمجھی ہو کہ مذکور بالا نظام حکومت ناکام رہا تو یہ ناکامی اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایٹ انڈیا کمپنی کو اس کے مناصب سے محروم کر کے انہیں ملکہ مظہر کی حکومت کو منتقل کر دیا جائے کیونکہ موجودہ نظام میں ملکہ مظہر کی حکومت ہی کا حکم ناطق ہے۔ مجلس فلما کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجلس مذکور متجاویز پیش کرے اور رسومات ہدایات مرتب کرے۔ اگر وہ اس کام میں کوتاہی کرے تو یہ کوتاہی خواہ اس کے لیے کیسی ہی ذلت کا باعث ہو ملکہ مظہر کی حکومت کو کسی طرح بری الذمہ نہیں کر سکتی کیونکہ وزیر ہند کو

یہ اختیار حاصل ہے اور اس نے اکثر اسے استعمال بھی کیا ہے کہ مجلس نظام سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ کسی مسئلے پر بھی غور و خوض کر کے قرارداد یا ت کا مسودہ اس کی منظوری کے لیے تیار کرے۔ پس کلہ مضمرہ کی حکومت پر ان تمام امور کی جو انجام پا چکے ہیں یا انجام پانے سے رہ گئے ہیں کامل ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف سائیلین صرف اسی حد تک ذمہ دار ہیں جس حد تک انہوں نے کسی کام کے مکمل یا متروک ہونے میں مدد دی ہے۔

ان حالات کے تحت اگر ہندوستان کی حکومت کو ناکامی ہوئی ہے تو سائیلین کی گزارش یہ ہے کہ اس امر کی توقع کسی قدر غیر معقول ہوگی کہ ناکامی کا علاج، مقتدر حکومت کی اس شاخ کو جو تنہا زیادہ خطا دار نہیں گردانی جاسکتی اور جو ممکن ہے بے خطا رہی ثابت ہو معذوم کرنے سے ہو سکتا ہے کیونکہ جملہ اختیارات اس شاخ میں جمع ہو جائینگے جو پہلی یا فرضی خطا میں لازمی و یقینی طور پر شریک رہی ہے۔ اس امر کا باور کرنا کہ اگر کوئی وزیر ناچار مجلس نظام کی اعانت کے بغیر حکومت ہند کا کام چلاتا تو حکومت مذکور خطا سے نسبتاً زیادہ مبرا ہوتی گویا یہ باور کرنا ہے کہ وزیر موصوف نے حسب خواہش حکومت ہند کے کامل اختیارات رکھنے کے باوجود اچھی طرح حکومت نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ کار اور ذمہ دار مشیروں کی اعانت حاصل تھی۔

بہر صورت سائیلین کا نشانہ نہیں ہے کہ دیگر شہر کا یہ حکومت کو ذمہ دار گردان کر خود کو بری الذمہ ثابت کریں۔ ہندوستان کی حکومت جس عملی طریقے پر چلائی جاتی رہی ہے اس کی پوری ذمہ داری کو سائیلین قبول کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری سائیلین کے لیے خفت کی نہیں بلکہ فخر و مباہات کی شے ہے۔ سائیلین کو اس امر کا احساس ہے کہ معاملات ہند کے انصرام میں ان کے مشورے اور ان کی تحریکیں عظیم و قوی عنصر بنی رہی ہیں جیسا کہ ان کو ہونا بھی چاہیے تھا۔ سائیلین کو اس امر کا بھی یقین کامل ہے کہ ہندوستان اور اس کی حکومت پر جس قدر زیادہ توجہ مبذول کی جائیگی اور جس قدر زیادہ روشنی اس پر ڈالی جائیگی اسی قدر یہ زیادہ واضح ہونا جائیگا کہ جس حکومت میں سائیلین نے

شکرت کی ہے وہ نہ صرف نیت کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ رہی ہے بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی نہایت فیاض واقع ہوئی ہے اور اس کی شہرت اقوام عالم میں ہمیشہ رہی ہے۔ یہ حکومت گزشتہ اور خاص کر موجودہ قرن میں ہر شعبہ کے لحاظ سے دنیا کی بہت جلد ترقی کرنے والی حکومتوں میں شمار کی گئی ہے اور اس وقت جبکہ تفریق تخریک پیش کی جا رہی ہے اس حکومت میں کسی سابق دور کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم اصلاحات تیز تر رفتار کے ساتھ عمل میں آنے والی ہیں۔ سائیلین اس امر سے مطمئن ہیں کہ ہندوستان میں جو کچھ مزید اصلاحات آئندہ نافذ کی جائیں گی وہ صرف یہی ہوں گی کہ سائیلین کے اختیارات بلکہ بڑی حد تک ان کی خاص ہدایات کے تحت ان اصول کو جو انہیں مقرر ہو چکے ہیں وسعت دی جائے اور ان بنیادوں پر جو پہلے ہی ڈالی جا چکی ہیں عمارتیں قائم کی جائیں۔

لیکن مذکور بالا اثرات انگلستان یا ہندوستان میں عوام کے قلوب پر پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے اگر سائیلین کو ہندوستان کی حکومت سے خارج کر دیا جائے۔ مدبرین کا یہ دستور نہیں رہا ہے کہ کسی ایسے نظام حکومت کو کلیتہً منسوخ کرنے کی تحریک کریں جس کے عملی نتائج پر عین طعن نہ ہوئی ہو۔ اگر اس وقت پیش شدہ سجاویر کا نفاذ عمل میں آئے تو اس سے عام طور پر یہی نتیجہ اخذ ہو سکیگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جسے ہندوستان کی حکومت کا اہم حصہ سونپا گیا تھا اپنے فرائض اس بد اسلوبی سے انجام دیے کہ ایک سنگین بغاوت برپا ہو گئی اور ہندوستان برطانوی سلطنت کے قبضے سے نکلنے کے قریب تھا اور یہ کہ جب طویل مدت کی بد انتظامی کا یہ انجام ہوا تو عوام کے غیظ و غضب کا لحاظ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی بد عنوانیوں کے باعث انصافاً برخاست کیا گیا ہے۔

اگر محض ایسٹ انڈیا کمپنی کا طرز عمل معرض بحث میں ہوتا تو سائیلین تاریخ کے فیصلے کا انتظار کرنے کے لیے رضا مند ہو جاتے کیونکہ وہ مطمئن ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کے ساتھ انصاف کریں گی اور انہیں یقین ہے کہ

اب سبھی ان کے ساتھ انصاف نہ صرف ملکہ منظمہ کے وزراء بلکہ ان تمام اشخاص کے دلوں میں ہو رہا ہے جو معاملہ زیر بحث کے موزوں حکم ہوئے کا کوئی حق رکھتے ہیں۔ لیکن سائلین اگرچہ اس امر کا انتظار کر سکتے ہیں کہ معزولی کا فیصلہ جس کے تعلق دنیا بھر میں یہ سمجھا جائیگا کہ برطانوی قوم نے ان کے اور ان کی حکومت کے لیے صادر کیا ہے منسوخ ہو جائے تاہم اس کا جو اثر ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر پڑنے کا امکان ہے اسے سائلین انتہائی بیقراری کے ساتھ محسوس کیے بغیر نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک خواہ نام سے حقیقت کا کیسا ہی غلط اظہار ہو ہندوستان کی برطانوی حکومت کو یا الیٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہے۔ ان کے خیال میں کمپنی کی معزولی آئندہ کچھ مدت تک اس سارے نظام حکومت کی معزولی ہوگی جس کے ساتھ کمپنی وابستہ ہے۔ اس معزولی کے ساتھ ہی جو جدید انتظام زبردست برطانوی قوت کے اثر سے نافذ کیا جائیگا اس سے ایک عام شورش جس کے خطرات بنفسہ نہایت وحشت انگیز ہونگے اس ملک میں اکثر اخباروں کے ذریعے اور ہندوستان میں انگریزوں کی طرف سے پیدا ہوگی اور اس بین دیل پر حکومت کے گزشتہ طرز عمل کو ملعون کیا جائیگا کہ اس میں ہندوستانیوں کے ساتھ بہت صبر و تحمل اور پیاس و لحاظ سے کام لیا گیا ہے۔

باشندگان ہند کو پہلے پہل اس امر کا یقین نہ آئیگا کہ خود جدید حکومت یا جدید نام کی حکومت جس کے قیام کی تجویز کی گئی ہے اپنے پیش رووں کے عہد و پیمان کی پابند رہیگی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات جلد نہ آئیگی کہ ایک حکومت کو صرف اس لیے معزول کیا گیا ہے کہ اس کی بجائے دوسری حکومت ایسی قائم ہو جو انہیں اصول اور انہیں انتظامات پر کاربند رہے۔ وہ یہ خیال نہیں کر سکتے کہ موجودہ نظام حکومت کو اس کے مسلک میں کسی قسم کی تبدیلی کا منصوبہ کیے بغیر برخواست کیا جائیگا۔ وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے وطن میں نیز ہندوستان میں اربابِ عمل و عقد کو ایسے اشخاص گھیرے ہونگے جو اس مسلک کے متقدمہ اجزاء کو کلینہ بدل دینے پر زور اصرار کریں گے۔ اس طرح آلہ حکومت میں جو تبدیلی ہوگی اس کی تاویل وہ یہ کرینگے جیسی کہ انہیں کرنی چاہیے کہ مذکورہ تبدیلی انہیں اشخاص کی رایوں اور مشوروں کے لحاظ سے

کی گئی ہے اور یقیناً وہ یہ خیال کرینگے کہ دیگر منصوبوں میں حکومت کے مذہب اور اس کی ہندوستانی رعایا کے مذہب کے درمیان آئندہ وہ سخت غیر جانبداری ملحوظ نہ رکھی جائیگی جو اب تک اس کی خصوصیت رہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ ان کے قومی ترین و عمیق ترین جذبات کا آئندہ اتنا لحاظ نہ کیا جائیگا جتنا اب ہمک کیا جاتا تھا اور انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو جائیگا کہ ان کی عادات یا رسوم و معمولات سے متعلق ہر شے پر جسے انگریز قابل اعتراض تصور کرینگے براہ راست حملہ کرنا آئندہ افراد و خانگی مجالس ہی تک محدود نہ ہوگا بلکہ حکومت کی ساری قوتیں بھی ان کی پشت پناہ ہوں گی۔

سائین اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ باشندگان ہند کے مذہبی رسم و رواج میں بجز ان کے جو انسانیت سوز ہوں ہر قسم کی مداخلت سے باز رہنے میں انہوں نے نہ صرف عدل و معصمت سے متعلق اپنے ذاتی خیالات کے تحت بلکہ جماعت عقائد کے اُن واضح مقاصد و صریح خیالات کے مطابق عمل کیا ہے جن کی بنا پر یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ ”ہندوستانیوں کے سیول اور مذہبی امور کا لحاظ رکھا جائے“ نیز یہ کہ ”ہندوستانیوں کے خلاف دیوانی یا فوجداری مقدمات ایسے قواعد کے مطابق چلائے جائیں جو ان مقدمات کو ہندوستانیوں کے مذاہب و اطوار کے لحاظ سے جائز قرار دیں“ اس خصوص میں سائین کے مسلک کی کامیابی کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ ایک فوجی بغاوت کے دوران میں جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مذہب سے متعلق بے بنیاد خوف و خطر کے باعث وہ برپا ہوئی تھی عوام اور ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی برطانوی حکومت کے ساتھ وفادار رہے ہیں۔ سائین کو یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ہندوستانی حکمران بغاوت کے فرد کرنے میں مدد دینے کی بجائے خود اس کی رہنمائی کرتے یا عام آبادی اس بغاوت میں شریک ہو جاتی تو گزشتہ واقعات کا نتیجہ کس قدر زیادہ مختلف ہوتا اور یہ گمان کس قدر غالب ہوتا کہ مذکورہ دونوں صورتیں وقوع پذیر ہو جاتیں اگر کوئی اصل وجہ اس امر کے ذہن نشین کرانے کے لیے پیش کی جاسکتی کہ برطانوی حکومت تبلیغ مذہب

میں شریک ہونا چاہتی ہے۔ سائیلین کا یہ مسلم عقیدہ ہے کہ اس مسلک میں کسی اہم تبدیلی کے خوف سے ٹھوڑی ہی مدت کے اندر سارے ہندوستان میں عام شورش پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

سائیلین نے انتہائی تکلیف کے ساتھ یہ مشاہدہ کیا ہے کہ ان کے ہم وطن ہندوستان نیز انگلستان میں باشندگان ہند کے خلاف اندھا دھند عدوت کے مظاہرے کر رہے ہیں جن میں گزشتہ ناگوار واقعات کے بعد سے زیادہ شدت ہو گئی ہے۔ سائیلین کو یقین کامل ہے کہ یہ مظاہرے اسی طرح ہی سبباً نہیں ہیں اور انہیں یہ علم ہے کہ ہندوستان میں عہد حکومت کے وجود کے لیے وہ ہم قائل ہیں۔ سائیلین یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس قسم کے مظاہرے جاری رہیں اور ان کے سانحہ پروا ختم اثرات کے تحت وضع قانون میں خصوصیت کے ساتھ انہیں اچھبت دی گئی تو محکوموں کو اپنے حاکموں کے منصوبوں پر جو اعتماد ہے اسے کسی قسم کی دانشمندی اور ردیاری برقرار نہ رکھ سکیں اور اس اعتماد کے بغیر باشندگان ملک کی ترقی کی کوششیں بھی بے سود ہوں گی۔

سائیلین ہر وقت کے بغیر اس یقین کا تصور نہیں کر سکتے جو آج کل مشہور و مد کے ساتھ اس امر کے متعلق کی جا رہی ہے کہ ہندوستان پر وہاں کے مقیم انگریزوں کے مفاد کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی جائے یا ہندوستان کی حکومت میں مکمل مفہم کی یورپ نژاد رعایا کے لیے ہر طرح کا فائدہ ہم پہنچایا جائے۔ بجز اس کے کہ جو اپنی دماغی برتری باشندوں کی روز افزوں مرفہ الحالی پیداوار ملک کے ذرائع کی ترقی اور تجارتی تعلقات کی توسیع سے لازماً وہ خود حاصل کرے۔ سائیلین کے خیال میں انگلستان کی حکومت ہند کی نہایت قابل احترام خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم قوم کی تفریق روا نہیں رکھی بلکہ یہ قرار دیا ہے کہ اس کا اولین فرض باشندگان ہند کی بہبودی سے متعلق ہے۔ سائیلین یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ان کی جو زیادہ مخالفت کی جا رہی ہے اس کا سبب یہی خیال ہے کہ وہ اصول مذکور کے

خاص طور پر نگہبان ہیں اور جب تک حکومت ہند میں ان کا کوئی دخل ہے اس کی ناسانی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ سائملین اپنے اس عقیدے کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے کہ حکومت کے کسی شعبے سے ان کی بے دخلی کو ہندوستان میں فی الوقت یہی تصور کیا جائے گا کہ اس اصول پر پہلی کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

نیا بریں سائملین معزز اراکان دارالامرا کی خدمت میں نہایت صدق و وفا کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ اگر زیر غور تبدیلہ بجائے خود مناسب ہی سمجھی جائے تو موجودہ زمانہ اس کے نفاذ کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ سائملین معزز اراکان دارالامرا سے بعد ادب و متحی و مستدعی ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کو کم از کم اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنے کی ضرورت ہے جبکہ اس کا نفاذ ایسے زمانے میں ہو سکے کہ باشندگان ہند کے دلوں سے یہ خیال محو ہو جائے کہ اس کا براہ راست تعلق حال کے تکلیف دہ واقعات سے اور ان جذبات سے ہے جو واقعات مذکور کے باعث پیدا ہوئے یا جن کے اظہار کے مواقع پیش آئے۔ سائملین کا یہ معروضہ ہے کہ اس قسم کے التوا سے حکومت ہند کی تنظیم سے متعلق مختلف سائل پر اس رائے کی بہ نسبت جواب تک قاضی کی گئی یا عوام کی موجودہ حالت انتشار میں قسیم کی جاسکتی ہے زیادہ سچتہ رائے لی ہر کرنے کی مہلت ملے گی اور قوم کے قابل ترین افراد کو اس امر پر المینان سے غور کرنے کا موقع مل سکے گا کہ آیا انگلستان کی حکومت ہند کے لیے کوئی ایسی جدید تنظیم جو موجودہ حکومت کی بہ نسبت خوش انتظامی کے کثیر تر لوازم کی حامل ہو عمل میں لائی جاسکتی ہے اور اگر اس قسم کی تنظیم ممکن اہل ہو تو اس متعدد و بیزاریں سے جو پیش کی جا چکی ہیں یا کی جاسکتی ہیں کس میں لوازم مذکور بدرجہ غایت پائے جاتے ہیں۔

سائملین نے ہمیشہ بہ رضا و رغبت ان تقریرات سے اتفاق کیا ہے جو پارلیمنٹ میں بحث و تجویس کے بعد عام فلاح و بہبود کے لیے مناسب تصور کیے گئے خواہ ان کی وجہ سے سائملین کو اہم قربانیاں ہی کیوں نہ کرنی پڑی ہوں۔ سائملین کا اشارہ ان امور کی طرف ہے کہ مسئلہ میں انہوں نے تجارت سے جزو انکار کبھی اختیار کر لیا

۱۸۳۳ء میں اسے کلکتہ ترک کر کے اپنے منشور تجارت کو پس پشت ڈال دیا۔ اپنے تجارتی اثاثے کو جس کی مقدار ۸۵۰۰۰ لپونڈ تھی ہندوستان کے خزانے میں داخل کر دیا۔ یہ رقم اس رقم سے بہت زیادہ ہے جو ملکی حقوق و مطالبات کے ماسوا سرمائے کے لحاظ سے سائین کو بالآخر واجب الوصول ہے اور ۱۸۳۳ء میں سائین نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا جس کی بنا پر مجلس نظام کی جدید تشکیل عمل میں آئی اور ان نظام کی موجودہ تعداد قرار پائی۔ انھیں جذبات و فاداری کو برقرار رکھتے ہوئے سائین نہایت خندہ پیشانی سے ملکہ مظہر کی حکومت کے ساتھ ان تفاسس کی اصلاح میں تعاون کریں گے جو موجودہ نظام حکومت کے اجزا میں پائے جاتے ہوں اور اگر ہندوستان کی حکومت پر نگرانی کا کوئی بہتر نظام تجویز کیا جاسکے تو وہ چون و چرا کے بغیر اس بارامنت سے کلکتہ سبکدوش ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن چونکہ سائین کو اس امر کا یقین واثق ہے کہ اس قسم کے نظام کی تقسیم بعض ایسی شرائط بھی ہیں جنہیں نہایت خطرناک نتائج کا سامنا کیے بغیر ترک نہیں کیا جاسکتا اس لیے سائین بصداد و احترام ان شرائط کے متعلق اپنے خیالات معزز ارکان دارالامرا کے فیصلے کے لیے پیش کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اگر معزز ارکان دارالامرا ان خیالات سے اتفاق کرنے کی وجہ پائیں تو ہندوستان کی حکومت سے متعلق کسی ایسے انتظام کی قانوناً منظوری صادر نہ ہوگی جو زیر بحث شرائط کو کم از کم موجودہ انتظام کے مساوی درجے پر پورا نہ کرتا ہو۔

سائین اس توقع کی جرات کرتے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت کے اس حصے کو جس کا تعلق انگلستان سے ہے تاج کے کسی وزیر کے سپرد کرنے کی تجویز ایک ایسی مجلس کے اضافے کے بغیر نہ کی جائیگی جو معاملات ہند کا تجربہ رکھنے والے مدبرین پر مشتمل ہو۔ ملکہ مظہر کے وزراء سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ کسی غیر ملک خصوصاً ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے علم اور خاص معلومات کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کسی اور پیشے کے لیے ہو اگر قی ہے اور یہ معلومات ممکن نہیں کوئی ایسا شخص حاصل کر سکے جس نے اپنی زندگی کا مقصد حصہ اس کی

تکمیل میں صرف کر لیا ہو۔

تجربہ کار مشیروں کی ایک ایسی مجلس قائم کرنے میں جو وزیر ہند کی شریک کار ہوگی اس امر کو ذہن نشین رکھنا سائلیمن ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ مجلس نہ صرف وزیر موصوف کو مشورے دینے کے قابل ہو بلکہ اپنے مشوروں سے ایک حد تک اخلاقی دباؤ بھی ڈال سکے۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستان کے متعلق وزیر ہند بذات خود معلومات حاصل کر سکا جبکہ اس کے پاس اُن جماعتوں اور لوگوں کے متواتر معروضات پہنچنے جنہیں اس ملک کے حالات سے قطعاً واقفیت نہ ہوگی یا صرف اس قدر ہوگی کہ وہ اپنے سے بھی کم واقفیت رکھنے والوں کو فریب دے سکیں گے اور ان کے پیش نظر اکثر و بیشتر ایسے مقاصد ہونگے جن کو ہندوستان کی عمدہ حکومت سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ رائے عامہ کے اظہار کے ذرائع سے جو اثرات وزیر موصوف پر ڈالے جاسکتے ہیں وہ بھی اکثر صورتوں میں گمراہ کن ہونگے۔ انگلستان کے عوام جو معاملات ہند سے قطعاً واقف نہیں ہیں صرف انہیں اشخاص کی تحریکات کا اتباع کر سکیں گے جو ان کی رائے کو متاثر کرنے کی ان تھک کوشش کرینگے اور یہ اشخاص عام طور پر وہی ہونگے جن کے پیش نظر ذاتی اغراض کی تکمیل ہوگی۔ لہذا سائلیمن کے خیال میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ انگلستان کی حکومت ہند کی شریک کار مجلس ہو اسے اپنے ارکان سے کافی مدد ملے اور وزیر ہند کے ساتھ اس کا ایسا تعلق قائم ہو جس سے اُن حلوں کی بخوبی روک تھام ہو سکے جو اس ملک کے عوام کی خود غرضی و لاعلمی کے باعث ہوا کرتے ہیں۔ ان حلوں سے حکومت ہند اب تک مصئون و مامون رہی ہے لیکن ان کے متعلق یہ توقع بجا ہوگی کہ خود پارلیمنٹ کافی حفاظت کا بندوبست کرے۔

سائلیمن حکومت ہند کی اس سے بدتر کسی صورت کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ ایک وزیر ہند اور ایسی مجلس پر مشتمل ہو جس سے مشورہ کرنے یا نہ کرنے کی خاطر خواہ آزادی وزیر موصوف کو حاصل رہے یا جس کے مشورے کو وہ اپنی تحریری وجوہات میں آفیس طریقے پر پیش کیے بغیر کر سکے۔ سائلیمن یہ گزارش

کرتے ہیں کہ اس قسم کا انتظام ان کی رائے میں فی الواقع انہیں اعتراضات کا ہدف بن جائیگا جو غلط فہمی سے موجودہ انتظام پر وارو کیے گئے ہیں۔ سائین ادب کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ وزیر ہند کی شریک کار کوئی مجلس جو متفقہ کام نہ کرے محض پردہ دار ہوگی۔ جب تک مجلس اس طرح قائم نہ کی جائے کہ وہ ذاتی طور پر وزیر موصوف کے اثر سے آزاد ہو جائے جب تک اسے اپنی اہم دہاری کا احساس نہ ہو کہ وہ ہندوستان کے ہر معاملے پر رائے زنی کرے اور اس رائے کے قبول کرنے پر وزیر موصوف کو مجبور کرے خواہ وہ رائے وزیر کے پسند خاطر ہو یا نہ ہو اور جب تک وزیر اس امر کا یا بند نہ ہو کہ مجلس کی رائے سے اختلاف کرنے کی صورت میں وہ اپنی وجوہ قلمبند کرے اس وقت تک مجلس وزیر کی ذمہ داریوں کو کمزور کرتی رہیگی اور جن تنجاویز کے مرتب کرنے میں فراست اور تجربے سے کام نہ لیا گیا ہوا نہیں بڑا ہران اوصاف سے متصف کر کے وہ منظور کرتی جائیگی۔

یہ توقع عبث ہوگی کہ کسی نئی مجلس میں اس قدر اخلاقی اثر اور قوت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی رائے مجلس نظم کی طرح زور کے ساتھ ظاہر کر سکے۔ ایک نئی مجلس ان احساسات و اختیارات کی وارث نہیں ہو سکتی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی قدامت اور تاریخی فوقیت کی بنیاد پر تھیں۔ یہ صورت بعینہ ایسی ہے کہ اگر کوئی جماعت مقننہ ایک نئے نام سے سنٹ سنٹر میں قائم ہو تو اس میں وہ اخلاقی فوقیت نہیں ہو سکتی جو دارالامرا اور دارالعوام کو حاصل ہے۔ پس ہندوستان کے لیے جو نئی مجلس سبھی بنائی جائیگی وہ لازماً موجودہ نظام کے متقابل میں اہم ترین فوائد کے عنصر سے خالی رہیگی۔

سائین کو یہ تصور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں سبھی جس کے کل ارکان تاج کے نامزد کردہ ہوں قول و فعل کی وہی آزادی پائی جائیگی جو مجلس نظم کی امتیازی خصوصیت ہے۔ چونکہ ان ارکان کی نامزدگی ایک ہی حکومت کے زیر اقتدار ہوگی اور ان میں سے اکثر غالباً خود اسی واحد وزیر کے نامزد کردہ ہونگے جس پر نگرانی کی غرض سے وہ مقرر کیے جائینگے اور جس کی جانب وہ اپنے دوبارہ

تقرر کے لیے رجوع کر چکے اس لیے ان کی خواہش یہ ہو گئی کہ وہ اپنے کو اس کے نزدیک اہل ثبات کر دکھائیں اور اس کی ناراضی سے گریز کریں جو اس کی رایوں سے ان کے کسی پُر زور اختلاف کے باعث پیدا ہوگی۔ یہ منصوبے اس قدر زبردست ہوئے کہ ان کے قومی و مضر اثرات ارکان مجلس کے طرز عمل پر حاوی رہ گئے۔ سائین کسی ایسے طریقے سے واقف نہیں ہیں جس کے ذریعے ان مضر اثرات کو دور کیا جاسکے جو ان کے کچھوں کے تفرقات کی طرح ارکان مذکور کے تفرقات کو عمدہ کارگزاری پر موقوف رکھا جائے لیکن ایسی صورت میں کسی غلطی کو جو ایک مرتبہ سرزد ہو جائے ناقابل اصلاح قرار دینا واقعی قابل اعتراض ہوگا۔

سائین یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ اگر نگران کار مجلس کی ذریک نامزد کردہ ہو تو جماعت بندی اور پارلیمنٹ کے اثرات سے اس خوش آئند استغنا کے جاری رہنے کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے جو اب تک ہندوستان کے نظم و نسق میں نیز اس ملک کی ذمہ دار و اہم خدمات کے تفرقات میں نمایاں رہا ہے۔ سائین کا یہ اعتقاد ہے کہ کسی حکومت نے جس کے حالات تاریخ میں مذکور ہوں اپنے عہدوں پر خصوصاً اعلیٰ عہدوں پر جو ہر ذاتی کے سوا کسی اور لحاظ سے تفرقات نہیں کیے ہیں یہ امتیازی خصوصیت اگر ہندوستان کو حاصل نہ ہوتی تو ایک مدت قبل ہی وہ یقیناً انگلستان کے قبضے سے نکل چکا ہوتا۔ سائین کا یہ بھی خیال ہے کہ خصوصیت مذکور بالکلیہ اس صورت حال پر مبنی ہے کہ مقتدر حکام ایسے اشخاص رہے ہیں جو کسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے نہ جنہیں پارلیمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں عہدوں پر تفرقات حسب دستور مقامی حکام کے غیر جانبدارانہ فیصلے پر چھوڑ دیے گئے اور سیول و فوجی خدمات کے لیے علی العموم متوسط طبقے کے افراد نامزد کیے گئے۔ اس نامزدگی میں کسی سیاسی خیال کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور زیادہ تر انھیں اشخاص کے اعزہ و اقارب نامزد کیے گئے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی خدمات سے شہرت حاصل کی تھی۔

باایں وجہ سائلین اس امر کو ناگزیر خیال کرتے ہیں کہ مجلس اپنے مشوروں سے وزیر ہند کی اعانت کرے اس کے بیشتر ارکان کی نشستوں کا تھیں وزیر موصوف کے اختیار سے بے نیاز ہو۔

سائلین کی رائے میں یہ امر بھی کم اہم نہیں ہے کہ اجرائے کار کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی حکومت میں مجلس مذکور حقیقی طور پر ہاتھ بٹا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سائلین کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جو مراسلات ہندوستان بھیجے جائیں انہیں وزیر تیار کر کے مجلس کے سامنے پیش نہ کرے بلکہ مجلس انہیں تیار کر کے وزیر کے سامنے پیش کرے۔ یہ انتظام اس فطری و بدیہی اصول کے مطابق ہوگا کہ جو اشخاص کسی معاملے کا علم رکھنے کی بنا پر منتخب ہوں وہی اس کی انجام دہی کی صورت بھی تجویز کریں بجائے اس کے کہ دوسروں کی پیش کردہ تجاویز پر صرف اظہار رائے کر دیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کی بنا پر مجلس کے ارکان اپنی وقعت کو اور اپنے پیش نظر معاملات پر کافی غور و خوض کرنے کی اہم ذمہ داری کو محسوس کر سکتے ہیں۔ سائلین کے لیے یہ بیان کرنا تقریباً غیر ضروری ہے کہ محض پیش شدہ تجویز سے اتفاق کرنے کی بجائے خود کسی تجویز کو پیش کرنے میں دماغ سے بہت زیادہ زور کے ساتھ کام لینا پڑتا ہے۔ آخری فیصلہ تو یقیناً وزیر پر موقوف ہوگا۔ اگر وہ تحریکات بھی کرنے لگے تو اسے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے جو عملاً اہم سمجھے جاتے ہیں۔ کسی مجلس کا مسئلہ کام صرف نکتہ چینی کرنا ہو تو وہ اس کام سے بہت جلد کنارہ کش ہو جائیگی۔ اس کے ارکان یہ محسوس کریں گے کہ ہندوستان کی حکومت چلانے میں ان کا تعاون فی الحقیقت درکار نہیں ہے بلکہ کاروبار کی انجام دہی میں ان کے وجود سے رکاوٹ ہی ہوتی ہے۔ جب کوئی امر ان کے منتفعہ مشورے کے بغیر مصل کر لیا جائیگا تو اس پر ان کی نکتہ چینی بے محل تحلیل انداز اور فزاحم سمجھی جائیگی اور یہی اغلب ہے کہ ان کے اس عہدے کے لیے آئندہ وہ لوگ بھی خواہش نہ کریں جو اس کے اہم ترین فرائض کے برائے نام ہی قائم رہنے پر رضا مند تھے۔

مراسلات ہند کی تیاری کے کام میں وزیر ہند کے محلے کی نافر دگی و نگرانی کے فرائض بھی لازماً شامل رہینگے۔ یہ صورت سائین کے نزدیک مجلس کی اہمیت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔ اگر وہ عہدہ دار جن کی وساطت سے مجلس کام کرے گی کسی ایسے حاکم کے براہ راست ماتحت ہوں جو مجلس سے بالادست ہو تو تمام اہم کارروائیوں پر فی الواقع وزیر اور عملہ ماتحت کے درمیان غور و خوض ہوا کریگا اور مجلس کو بالکل نظر انداز کر دیا جائیگا۔

ایک تیسرا امر جو سائین کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ ہے کہ مجلس کے ارکان کی تعداد بہت زیادہ محدود نہ ہونی چاہیے۔ ہندوستان ایک ایسا وسیع خطے جس کے معاملات کے ہر جزو سے ارکان مذکور کی ایک قلیل تعداد عملی واقعیت حاصل نہیں کر سکتی۔ مجلس میں ایسے ارکان ہونے چاہیں جنہیں دنیا کا عام تجربہ اور علم ہو نیز اس میں ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جنہیں مالیات، انگریزی عدالت، سیاست اور فوج کا خاص تجربہ حاصل ہو۔ مجلس میں ایسے اشخاص بھی ہوں جنہیں بنگال، مدراس، بمبئی، صوبہ جات شمال مغربی پنجاب اور ویسی ریاستوں کے گونا گوں معاشری تعلقات اور مختلف النوع اداوات کا بخوبی علم ہو۔ موجودہ مجلس نظام میں جس کی تنظیم جدید ۱۸۵۳ء کے قانون سے ہوئی تھی علم اور تجربے کے لحاظ سے وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ہیں جو اس قسم کی مجلس میں ہونی چاہئیں۔ سائین کا یہ معروضہ ہے کہ تمام تقررات کو بہترین تصور کرنے پر بھی ارکان مجلس کی اس تعداد کو جو بالکل کافی سمجھی جائے محدود کر دینا قرین عقل نہ ہوگا۔ بخوشخبری اس ناکامی کے خیال سے بھی رکھنی چاہیے جو بہترین انتخاب کے باوجود بعض اوقات پیش آ جاتی ہے۔ علاوہ بریں سائین اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اگر نافر و گیاں ایسے وزرا کی جانب سے عمل میں آئیں جو کسی سیاسی جماعت کے سردار ہوں تو وہ ہمیشہ شخصی غلبہ کی مخصوص بنا پر نہ ہوگی، لہذا اس امر کا انتظام ناگزیر ہے کہ نافر و کرنے والے حاکم کی ایسی غلطیاں یا خامیاں جب کبھی محض اتفاقی طور پر رونما ہوں تو ان کا مضرت مجلس مذکور کی کارکردگی پر نہ پڑے۔

مذکور بالا خیالات جہاں ایک ایسی مجلس کی پرزور تائید کرتے ہیں جس کے ارکان کی تعداد موجودہ مجلس کے مقابلے میں کم نہ ہو خواہ یہ ارکان وزیر کے محض مشیر ہی سمجھے جائیں وہاں وزیر پران کی بھگوانی کے فرائض کے لحاظ سے سائیلین کا خیال ہے موجودہ تعداد میں کسی بڑی تخفیف پر سخت اعتراض وارد ہوگا۔ چھ یا آٹھ ارکان والی مجلس اٹھارہ ارکان والی مجلس سے خود اعتمادی کے اس آزادانہ جذبے میں ہمسری نہیں کر سکتی جو ایک عام مجلس کو اس امر کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وزیر کو اپنی اس رائے سے متاثر کرے جسے وہ ناقابل قبول سمجھتا ہے۔ ایسی چھوٹی مجلس کے لیے خواہ دیگر حقیقتوں سے وہ صحیح اصول ہی پر قائم کیوں نہ ہو اس امر کا امکان بہت کم ہے جو خاص خاص صورتوں کے اس کے ارکان کے دلوں میں ایسے خیالات پر جمے رہنے کی خواہش کی بجائے وزیر کی ناراضی سے گریز کرنے کی عام رغبت غالب رہے گی۔

بائیں ہمہ اگر معزز ارکان دارالامرا کی رائے میں ایسی مجلس قائم کی جاسکتی ہے جس میں شائستہ حکومت کی مذکور بالا صفات مجلس نظام کی بہ نسبت بدرجہ اتم موجود ہوں تو سائیلین بہ عجز و نیاز صرف یہ توقع ظاہر کر سکتے کہ اس مقصد میں معزز ارکان کی مساعی کامیاب ہوں۔ لیکن انگلستان کی حکومت ہند کی خوش انتظامی کے حالات بیان کرنے میں اگر سائیلین نے فی الواقع ان صفات کو گنایا ہے جو موجودہ نظام حکومت میں پائی جاتی ہیں تو سائیلین کا یہ معروضہ ہے کہ معزز ارکان دارالامرا مجلس نظام کے موجودہ اختیارات کو برقرار رکھیں۔

سائیلین کو اس امر کا علم ہے کہ انگلستان کی موجودہ حکومت ہند کو دو عملی حکومت سے تعبیر کر کے قطع کیا جاتا ہے اور ہر ایسا انتظام جس کے ذریعے وزیر کے اختیار تیزی پر بھگوانی کی جاسکے اسی طرح نشانِ لامت ہوگا۔ لیکن سائیلین کا خیال ہے کہ یہ لٹن لٹن بالکل یہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے جو انگلستان کی حکومت ہند کے مفوضہ فرائض کے متعلق نیز اس حکومت پر ان اصول کے اطلاق کے بارے میں پھیلی ہوئی ہے جو خالص انتظامی صیغوں کے لیے موزوں ہیں۔ ہندوستان کی حکومت عاملانہ کام کر ہندوستان ہی میں ہے اور ہمیں اسے ہونا بھی چاہیے۔

مجلس نظم کو کسی امر کے انتظام سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا اسے اس کی جانچ سے ہے۔ اس کا نیز حکومت انگلستان کا بڑا فرض علی العموم انتظام کی تفصیلات کے متعلق ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ حکومت ہند کے گزشتہ اعمال کو جانچنے کے بعد ان کی اصلاح کی جائے اس کی آئندہ رہنمائی کے لیے اصول مقرر کر کے عام ہدایات جاری کی جائیں اور ان اہم سیاسی تباہ و تباہ کو جو بغیر من فیصلہ انگلستان روانہ کی جائیں منظور یا مسترد کیا جائے۔ یہ فرائض مجلس علانہ کے فرائض کی بہ نسبت پارلیمنٹ کے فرائض سے زیادہ مشابہ ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پارلیمنٹ نیز حکومت ہند کو ان اصول پر قائم ہونا چاہیے جو کسی مجلس علانہ کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ حکومت کا نہ صرف دو عملی بلکہ سہ عملی ہونا پارلیمنٹ کے دستویریں ایک خوبی تصور کی جاتی ہے نہ کہ خامی۔ سائین کا یہ معروضہ ہے کہ لمبا طاعت مجلس علانہ کے اختیارات اکثر ایک شخص کے تفویض کیے جاسکتے ہیں کیونکہ فوری کارروائی کرنا اس کا اولین فرض ہے۔ لیکن گزشتہ کارروائیوں پر صائب رائے دینا اور آئندہ طرز عمل کے متعلق اصول مقرر کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے سائین کے خیال میں ایک سے زائد اشخاص کے اتفاق آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کی مجلس کا دو عملی ہونا اس کی کوئی خامی نہیں اور اس کے اختیارات ایک شخص کو عطا کرنا اس کی کوئی خوبی نہیں خاص کر جبکہ یہ مجلس اس طرح تشکیل پائے کہ اس سے ان اشخاص کو ملجود کر دیا جائے جو سابق تجربے کی بنا پر ہر وقت موزوں ترین ثابت ہو سکتے ہیں اور جو اس مجلس کے مخصوص فرض کی انجام دہی کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔

سائین نے یہ بیان بھی سنا ہے کہ اس حکومت کے باعث جو دو عملی کے نام سے موسوم ہے حکام ہند پارلیمنٹ اور قوم کے نزدیک اس قدر جواب دہ نہیں ہیں جس قدر سلطنت کی حکومت کے دوسرے شعبے ہیں کیونکہ یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ حکومت انگلستان کی دو شاخوں میں سے کس پر ذمہ داری عائد ہونی چاہیے۔ سائین بلا خوف تردید اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ خیال نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ صداقت کے بالکل خلاف ہے۔ انگلستان کی حکومت ہند سلطنت کی حکومت کے کسی دوسرے شعبے سے کچھ کم ذمہ دار نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے کیونکہ مجلس امورین کا

صدر جو وزیر ہند ہے ملکہ معظمہ کے دوسرے وزرا کی طرح برابر کا ذمہ دار ہے اور مزید برآں اس کے مشیر بھی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں اس امر کا ہمیشہ یقین رہتا ہے کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ صدر مجلس مامورین کے حکم یا اس کی منظوری سے ہوا ہے۔ اس سے زائد ذمہ داری سائین کے خیال میں ملکہ معظمہ کی حکومت کے کسی شعبے میں بھی نہیں پائی جاسکتی کیونکہ یہ ممکن نہیں اور نقل بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ ملکہ معظمہ کا کوئی وزیر اپنے قابل اعتماد مشیروں کے بغیر اپنا کام انجام دیتا ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ملکہ معظمہ کے کسی دوسرے وزیر کی بہ نسبت وزیر ہند کو ان اشخاص کے مشوروں پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی اُس شعبے کے لیے وقف کر دی ہے جس میں ان کے مشورے لیے گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے لیے وزیر موصوف کو جو مشیر دیے جاتے ہیں ان کا تقرر حکومت کے دستور کے مطابق عمل میں آتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے مشوروں کے اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنا ان کا وزیر اپنے استحکام کا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے شعبوں میں وزیر کو جو مشیر حکومت کی طرف سے دیے جاتے ہیں وہ اس سے رتبے میں کم ہوتے ہیں۔ یہ مشیر اکثر اپنے فن میں بڑے ماہر اور تجربہ کار ہوتے ہیں لیکن عوام میں ان کی وقعت نہیں ہوتی اور عوام اکثر ان کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے۔ دفتری لاز واری کی وجہ سے ان کے مشوروں کا کسی کو علم ہونا خارج از امکان ہے اور وہ صرف وزیر ہی کے نزدیک جواب دہ ہوتے ہیں۔ اتنا عرض کرنے کے بعد سائین یہ سوال غیر ضروری خیال کرتے ہیں کہ کس اصطلاح میں اس حکومت کو ذمہ دارانہ اور سائین و مجلس ہند کی متحدہ حکومت کو غیر ذمہ دارانہ کہا جاسکتا ہے۔

چونکہ سائین کو اس اصول کا علم نہیں ہے جس کی بنا پر ملکہ معظمہ کے وزرا کمپنی کے ملازمین کو راست تاج کے تحت لانے کا خیال رکھتے ہیں اس لیے سائین ہندوستانی فوج کے نازک مسئلے پر اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتے کہ فوج مذکور کے عہدہ داروں کی اعلیٰ فوجی قابلیتیں ایک بڑی حد تک بے شہم اس بنا پر معرض نظر میں آئی ہیں کہ یہ فوج ایک خاص اور منظم فوج ہے جس میں

ملکہ منگلہ کے کمیشن یافتہ عہدہ دار ہیں جو ملکہ مدوحہ کے دیگر عہدہ داروں کے ہم مرتبہ ہیں اور اس مساوات میں کسی تغیر کو سائلین بہت بُرا سمجھتے ہیں۔

پس مذکور بالا جملہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے سائلین معزز ایوان سے یہ عاجزانہ استدعا کرتے ہیں کہ موجودہ ناخوشگوار حالات کی موجودگی میں حکومت ہند کے دستور میں کسی قسم کی تبدیلی کی منظوری اس وقت تک صادر نہ فرمائی جائیگی جب تک موجودہ نظام حکومت کی کارروائیوں کے متعلق قبل از وقت کافی تحقیقات نہ کر لی جائے۔ علاوہ بریں سائلین کی یہ بھی استدعا ہے کہ اس قسم کی تحقیقات حکومت ہند کے ہر شعبے کے متعلق کی جائے۔ سائلین ادب کے ساتھ اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ اس تحقیقات سے نہ صرف سائلین کے حق میں انصاف ہوگا بلکہ اس لحاظ سے کہ اس صدی میں پہلی مرتبہ اس ملک کے ہر عام شخص کی نظر ہندوستان پر پڑی ہے یہ تحقیقات زیادہ مکمل ہوگی اور زمانہ ماقبل کی کسی تحقیقات کے مقابلے میں اس کے نتائج پارلیمنٹ اور اہل ملک کے لیے زیادہ مفید ہونگے۔

*** نظام حکومت دو عملی پر تبصرہ** | مجھے یقین ہے کہ ایٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں بہت سے اچھے کام انجام دیے ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ اس کے نظم و نسق سے اس کی محکوم آبادی کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ تاریخ انسانی کا غالباً یہ ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہے کہ جزائر برطانیہ کو کرہ ارض کے ایک دور و دراز حصے پر ایک وسیع حکومت حاصل ہو جائے یعنی وہ حکومت جو ہم براعظم ہندوستان پر کر رہے ہیں۔ یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ یہ خطے جن کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہاں انسان پہلی مرتبہ علوم و فنون سے روشناس ہوا ہے اب ایسے جزائر کے باشندوں کے زیر حکومت ہوں

*Source.—Viscount Palmerston. Speech in the House of Commons, February 12, 1858, in introducing the First Bill for the Government of India. (Hansard)

جو اس وقت کامل بربریت کی حالت میں تھے جبکہ یہ مشرقی خطے بہ لحاظ تمدن و آسودہ حالی اپنے فتنائے عروج پر تھے۔ یہ صورت حال حیرت افزا ہے لیکن ماس سے بھی عجیب تر امر جو اپنی نوعیت میں بالکل نرالا ہے یہ ہے کہ یہ قوم جس کے یہاں حکومت کا فن غالباً دوسری سب قوموں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے اور جس کے یہاں اصول نیابت مدتوں سے قائم ہے اس قدر وسیع حصص ملک، عظیم مفاد اور کثیر آبادی کے انتظام کو دیدہ و دانستہ تجارتی اشخاص کی ایک جمہوری سی جماعت کے تفویض کر دے۔

لیکن مذکور بالا اعلیٰ اس ملک سے عدا کبھی نہیں ہوا۔ موجودہ صورت حال ایک حقیر بنیاد سے تدریج ترقی پذیر ہوئی ہے۔ پہلے پہل وہاں بسنے والوں نے ایک کارخانے کی بنیاد لی، یہ کارخانہ بڑھ کر بندرگاہ بن گیا، بندرگاہ ترقی کر کے ضلع ہو گیا، ضلع جلد صوبہ بن گیا اور اس کے بعد نیم مہذب ہمسایوں سے تصادم ہوا جس میں نقصانات کی تلخی کی فکر ہوئی، محلوں کی مداخلت کی تدریج کی گئی اور ان تنازعات کا انجام ہمیشہ فتح اور توسیع علاقہ پر ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے جو معاملات پیش آئے ان سے وہ صورت پیدا ہوئی جس کی بدولت ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت سے تجارتی حقوق مل گئے اور وہ نہایت اہم سیاسی فرائض کی ذمہ دار قرار پائی۔ یہ صورت حال مسئلہ تک جاری رہی جب کہ مجلس نگراں کا قیام عمل میں آیا اور کمپنی کے کاروبار میں سیاسی انتظامی فرائض کی ذمہ داری بھی شامل کر دی گئی۔ چند سال تک اس جدید انتظام کے تحت کام چلتا رہا اور اس دوران میں کمپنی مجلس نگراں کی معمولی مداخلت کے ساتھ اپنے سیاسی فرائض انجام دیتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے تمام تجارتی حقوق کا استعمال بھی کرتی رہی۔ یہاں کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں پہلا قدم اٹھانے کے بعد کام زنی جاری رکھی جائیگی اور کوئی دوسرا کام شروع کرنے سے قبل دور اندیش برطانوی قوم اسی راستے پر جو مسئلہ میں اختیار کیا گیا تھا چلتی رہے گی اور چونکہ اس وقت کے اختیار کردہ قانون کا مشا کمپنی کے سیاسی فرائض میں ایک حد تک کمی کرنا تھا اس لیے دوسرے قدم پر اسے ان فرائض سے بالکل سبکدوش کر دیا جائیگا

اور اس کی اصلی تجارتی حیثیت برقرار رکھی جائیگی۔ باایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک میں سیاسی معاملات کی بنیبت تجارتی معاملات میں زیادہ توجہ اور گہری دلچسپی کا اکثر اظہار کیا جاتا ہے چنانچہ دوسرے قدم پر یہ طے ہوا کہ آئندہ کمپنی کے سیاسی فرائض میں دخل نہ دیا جائے بلکہ اس سے تمام تجارتی حقوق لے لیے جائیں جو اس کے وجود میں آنے کا حقیقی سبب بنے تھے۔ بنا بریں ۱۸۴۳ء میں کمپنی کی تجارتی حیثیت قطعاً باقی نہ رہی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصلی کمپنی کا صرف ڈھانچہ رہ گیا۔ اس کی وہ تجارتی حیثیت جاتی رہی جس کی بنا پر ابتدا میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور وہ محض ایک سیاسی آلہ کار بن کر رہ گئی جس کے ذریعے ہندوستان کا نظم و نسق چلنے لگا۔

جناب عالی میں اب یہ خیال ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس طرح جو انتظام کیا گیا وہ ایک نہایت گراں و غیر موزوں انتظام تھا۔ ہمارے نظام سیاسی کا اصل اصول یہ ہے کہ جملہ انتظامی فرائض کے ساتھ وزارت کی ذمہ داری بھی ہونی چاہیے یعنی یہ وزارت پارلیمنٹ رائے عامہ اور تاج کے سامنے جواب دہ ہو، لیکن اس معاملے میں حکومت ہند کے اعلیٰ فرائض ایسی مجلس کے سپرد کیے گئے ہیں جو پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق تاج کی طرف سے ہوا ہے بلکہ اسے ان اشخاص نے منتخب کیا ہے جن کا تعلق ہندوستان سے صرف اس بنا پر ہے کہ وہ ایک بڑے سرمائے کے مالک ہیں۔ میرے خیال میں یہ انتظام بنفسہ بہت زیادہ قابل اعتراض ہے۔ اس ملک میں ہم مجتہد کے ساتھ تبدیلیاں نہیں کرتے ہیں۔ تغیر و تبدل کی جانب راغب نہ ہونا ایک دانشمندانہ و مفید طرز عمل ہے جو عام اصول کے لحاظ سے دانائی پر مبنی ہے اور مذکور بالا قسم کے اداروں میں تو میں جلد جلد اور کافی غور و خوض کے بغیر تبدیلیاں کر کے بہت کچھ نقصان اٹھاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ غیر دانشمندانہ و مضر طریقہ ہو گا کہ موجودہ نظام حکومت کو محض اس بنا پر سجال رکھا جائے کہ وہ قائم ہو چکا ہے اور ایسی تبدیلیاں نہ کی جائیں جو قوم کے لیے سود مند ہو سکتی ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت ہند کے موجودہ نظم و نسق کی نسبت جو حکومت دو عملی کے نام سے موسوم ہے اور کوئی انتظام نہ پایا وہ گراں ہو سکتا ہے؟ مسئلہ کے مباحثوں میں جبکہ آخری مسودہ قانون ہند منظور ہوا تھا تب بکننگھم سٹار کے معزز رکن (مسٹر ڈسہرائیلی) نے سوال کیا تھا کہ حکومت ہند کا تعلق کس سے ہے اور وہ کس کو مقتدر گردانے جس پر اس وسیع سلطنت کے نظم و نسق کی ذمہ داری عائد ہو سکتی ہے۔ جناب عالی میرے نزدیک اس کا کوئی ذمہ داری نہیں اور اگر ہے تو اس کی ذمہ داری منقسم ہے۔ نظم کو یہاں کہ معزز رکن نے کہا تھا ہر امر پر اختیار رکھنے والے ہے چنانچہ وہ گورنر جنرل کو واپس بلا سکتے ہیں جس کی وجہ سے ہر بڑے سے بڑے نظام عمل میں فوری عمل واقع ہو سکتا ہے۔ اگرچہ گورنر جنرل کا تقرر تاج کی طرف سے ہوتا ہے اور نظم اس تقرر کو قبول کرتے ہیں تاہم انہیں اختیار مذکور حاصل ہے۔ حکومت کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کو نظم مجلس نگراں اور گورنر جنرل ہند کے مابین تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مجلس نگراں حکومت وقت کی نمائندگی کرتی ہے اور اس دارالعوام اور رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کا تقرر تاج کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتی ہے۔ نظم کا انتخاب وہ خواتین اور اصحاب کرتے ہیں جن کا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے اور جن میں سے اکثر و بیشتر معاملات ہند سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ اشخاص غالباً کلکتہ، بمبئی یا مدراس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ تاجر اس کے کہ کسی احاطے کے بارے میں امیدوارانہ نظامت سے انہیں یہ علم حاصل ہو جائے کہ وہاں جو فوجی خدمات تقرر طلب ہیں وہ ان کی آرا کے عوض انہیں مل سکیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ نظام عالی العموم ایسے افراد ہوتے ہیں جو ہندوستان کا کافی علم اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں لیکن ان کا انتخاب ایک ایسی جماعت کرتی ہے جسے مشرق کی عظیم اہل سلطنت پر حکومت کرنے کے لیے موزوں افراد منتخب کرنے کا کوئی خاص سلیقہ نہیں ہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل کا رتبہ ہے جسے وسیع جلا گانہ اور آزادانہ اختیارات حاصل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام حکام کے درمیان کاروبار کی فوری کیسوئی اور

اغراض کی یکسانی نہیں ہو سکتی۔ پس مجھے یہ سوال اٹھانے کی اجازت دی جائے کہ اس دارالعوام میں ملکہ معظمہ کی حکومت کو کیا حیثیت حاصل ہے جب مسائل ہند پر بحث ہوتی ہے تو جو لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں ان کی یہ متقل عادت ہے کہ جو کچھ ملے پا جاتا ہے اس پر کتہ چینی اور اعتراض کرتے ہوئے ہر وقوع پذیر امر کے لیے ملکہ معظمہ کی حکومت کو ذمہ دار گردانتے ہیں۔ لیکن انصاف کا اطمینان یہ ہے کہ ملکہ معظمہ کی حکومت کو جن امور پر پورا اختیار حاصل نہیں اور جن کا مکما حقہ انتظام اس کے امکان میں نہیں ان کے لیے وہ ذمہ دار نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ یہ واقعہ ہے کہ اکثر موقوفوں پر حکومت وقت کو ان امور کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جو اس کی رضا مندی کے بغیر عمل میں آتے ہیں اور جن سے بعض صورتوں میں وہ غالباً مطمئن بھی نہیں ہوتی۔

*** محکوم ملک پر حکمرانی کا بہترین انتظام حکومت چینی کی حمایت میں**

ہندوستان

جیسے ملک پر

براہ راست حکومت کرنی کی بجائے اس کے لیے اچھے حکمران منتخب کر کے انگریزی قوم اس ملک سے متعلق اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ اس قوم کی جانب سے اس ملک کے لیے بدترین حکمران انگریزی کا بیٹہ کا وزیر ہو گا جو ہندوستانی سیاسیات کی بجائے انگریزی سیاسیات کو پیش نظر رکھیں گے اور جو اپنے جہد سے اپنی مدت تک قائم نہیں رہ سکتا کہ اس قسم کے چھپیدہ معاملے میں دلچسپی کے ساتھ وہ دلچسپی لے سکے۔ مزید براں پارلیمنٹ میں جہاں دو یا تین فصیح البیان مقرر ہوں مصنوعی رائے عامہ اس پر ایسا قوی اثر دلاتی ہے کہ گویا وہ کوئی اجتہادی رائے ہے اور وہ تربیت و حیثیت کا ایسا اثر محسوس نہیں کرتا جو اسے خود اپنی کوئی مستقل رائے قائم کرنے میں مدد دے سکے۔ اگر ایک آزاد ملک کسی دور و دراز ملک کے مختلف الموضع باشندوں پر اپنے ایک صیغہ انتظامی کے ذریعہ حکومت کرنے کی کوشش کرے تو اس میں اسے

تعلقی ناکامی ہوگی۔ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حکومت ایک نیا بنی مجلس کے توسط سے کی جائے جسے تقریباً مستقل حیثیت حاصل ہو اور سلطنت کی تغیر پذیر حکومت کو صرف نگرانی و تفسیح کا اختیار رہے۔ اس قسم کی مجلس ہندوستان کے لیے موجود تھی اور مجھے اندیشہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں کو اس کو ناہ نظری کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑیگا جس کی وجہ سے اس موزوں طریق حکومت کو خیر باد کہہ دیا گیا۔

یہ کہنا کچھ سودمند نہیں ہے کہ ایسی نیا بنی مجلس میں عہدہ حکومت کے تمام لوازم موجود نہیں ہوتے اور مزید براں یہ کہ اس مجلس میں کامل طور پر محکومین کے ساتھ یکسانی عمل کا میلان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے حصول کی توقع اس وقت بھی مشکل سے ہو سکتی ہے جبکہ خود محکوم لوگ ایک حد تک اپنے معاملات کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واقعی عہدہ حکومت موجودہ صورت حال کے باعث ناممکن ہے۔ ایک غیر مکمل نظام حکومت ہی کا انتخاب کرنا ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک ایسی حکمران مجلس قائم کی جائے جو صورت حال کی دشمنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی خوبیوں کی جانب زیادہ سے زیادہ اور برائیوں کی جانب کم سے کم راغب ہو۔ ان شرائط کو ایک درمیانی مجلس بہترین طور پر پورا کر سکتی ہے۔ براہ راست حکومت کے مقابلے میں ایک نیا بنی حکومت کو ہمیشہ یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ اسے بہ صورت ان فرائض کے سوا جو محکومین سے متعلق ہوں اور کوئی فرائض انجام نہیں دینے پڑتے اور انھیں کے مفاد کے سوا دیگر مفاد کا اسے لحاظ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے حکومت کی بدانتظامی سے فائدہ اٹھانے کا جو قوی امکان ہے اسے حیرت انگیز طور پر اقل درجے تک کم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ایٹ انڈیکس کے آخری دستور میں کیا گیا ہے اور اسے کسی انفرادی یا جماعتی مفاد کی بجائے فطری سے بالکل الگ رکھا جاسکتا ہے۔ جب انگلستان کی حکومت نیز پارلیمنٹ اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے وقت جو آخری چارہ سازی کے لیے محفوظ ہوتا ہے ایک طرف اثرات سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اس موقع پر بھی درمیانی مجلس شاہی عدالت کے سامنے محکوم ملک کی بہترین ترجمان اور وکیل

ہو سکتی ہے۔ علاوہ بریں رفتار حالات کے لحاظ سے درمیانی مجلس خصوصیت کے ساتھ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنہوں نے اپنے ملک کے اس علاقے کی خاص معلومات حاصل کی ہئے جن کی تربیت خود اسی مقام پر ہوئی ہے اور جو اس کی حکومت کو اپنی زندگی کا اہم مشغلہ قرار دے چکے ہیں۔ ان اوصاف سے منصف ہو کر اور اس یقین کے ساتھ کہ وطن کے سیاسی واقعات کے باعث وہ اپنے عہدوں سے برطرف نہیں ہو سکتے وہ اپنی خاص امانت کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہیں اور انہیں اپنی حکومت کی کامیابی نیز اپنے زیر انتظام ملک کی مرفہ الحالی میں مستقل طور پر جتنی زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اتنی نیابتی دستور کے تحت کسی کاہنہ کے رکن کو کسی ملک کی عہدہ حکومت میں نہیں ہو سکتی بجز اس ملک کے جس کی خدمت وہ کر رہا ہو۔ جس حد تک برسر موقع انتظام کرنے والوں کے انتخاب کی ذمہ داری اس مجلس پر چاند ہوتی ہے وہاں تک ایسے تقررات کو جماعت اور پارلیمنٹ کے عیارانہ طریقوں سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور انہیں ان تحریکات کے اثر سے آزاد کیا جاتا ہے کہ اختیارات کا بیجا استعمال کیا جائے والستہ اشخاص کو انعام دیا جائے یا ان لوگوں کو رشوت دی جائے جو بصورت دیگر مخالف ہوئے کیونکہ یہ تحریکات متوسط درجے کے دیانت دار مدبروں پر اس ایما اندازہ احساس کی بہ نسبت زیادہ غالب رہتی ہیں جو موزوں ترین شخص کے تقرر سے متعلق ہوتا ہے۔ اس قسم کے تقررات کا متضرر اثرات سے ممکنہ حد تک محفوظ رہنا اس صورت کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے کہ سلطنت کے دیگر تمام عہدوں میں قبائح پیدا ہو جائیں کیونکہ ہر وہ سر نے شبہ میں اگر عہدہ دار نا اہل ہو تو جماعت کی رائے عامہ ایک حد تک اس کے فرائض کی انجام دہی میں مدد دیتی ہے لیکن ایک ایسے محکوم ملک کے حکام کی صورت میں جہاں لوگ بطور خود اپنے معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتے حکومت کے حسن و قبح کا کامل انحصار صرف ان حکام کی اخلاقی و دماغی قابلیتوں پر ہوتا ہے۔

اس امر کو بار بار بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان جیسے ملک میں ہر شے حکومت کے کارکنوں کی ذاتی خوبیوں اور قابلیتوں پر منحصر ہے۔ یہ

صد ا ق ت ہندوستان کی حکومت کا ایک اصول عظیم ہے۔ جس روز یہ سمجھا جائیگا کہ ہندوستان میں آزادی کے ساتھ اہم خدمات پر اشخاص کا تقرر رسمہولت کے خیال سے کیا جاسکتا ہے وہاں حالیکہ یہ خیال خود انگلستان میں ایک مجرا نہ صورت اختیار کر چکا ہے اسی روز سے وہاں ہماری سلطنت کے انحطاط اور زوال کا آغاز ہو جائیگا۔ اگرچہ بہترین امیدوار کو منتخب کرنے کی نیت خالص ہی کیوں نہ ہو تاہم ایسے لائق اشخاص کے متعلق یہ خیال کرنا مناسب نہیں کہ وہ اتفاقاً فراہم ہو جائینگے۔ خود نظام حکومت ایسا ہونا چاہیے جو قابل افراد پیدا کر سکے۔ موجودہ نظام حکومت نے اب تک یہی کیا ہے اور چونکہ اس کا ایسا مل رہا ہے اس لیے ہندوستان میں ہماری حکومت جاری ہے اور ملک کی آسودہ حالی اور خوش انتظامی میں گویا زیادہ محبت کے ساتھ نہ بھی مسلسل ترقی ہوتی رہی ہے۔ اب اس نظام حکومت کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا جا رہا ہے اور اسے الٹ دینے کے لیے اس قدر زیادہ سرگرمی کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا حکومت کے عہدہ داروں کو ان کے فرائض کے متعلق تعلیم و تربیت دینا ایک بالکل نامناسب اور ناقابل تائید امر ہے جس سے نادانوں اور ناجائز بہ کاروں کے حقوق میں بیجا مداخلت ہوتی ہے۔ ایک خفیہ سازش ان اشخاص کے درمیان معلوم ہوتی ہے جو اپنے اعزہ و اقارب کے لیے ہندوستان کے بہترین عہدے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود ہونے کی بنا پر نیل کے کارخانے یا وکیل کے دفتر کا کام چھوڑ کر معدلت کا انتظام یا ان محاصل کا تعین کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں جو حکومت کو لاکھوں اشخاص سے واجب الوصول ہیں۔ سیول سروس پر قبضہ جس کی بہت کچھ مذمت ہو چکی ہے ایسا ہی ہے جیسا تمام عدالتی عہدوں پر طبقہ وکلاء کا قبضہ ہوا اور اس کی منوخی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وکلاء مندرجہ بالا کے اجلاس کو ہر ایسے نووارد کے لیے کھول دیا جائے جس کے احساب یہ تصدیق کر دیں کہ اس نے گاہے گاہے سرولیم بلاک اسٹن کی شرح قوانین انگلستان کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر کبھی یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس ملک سے

لوگ سمجھے جائیں یا انہیں یہ ترغیب دی جائے کہ وہ بیرون ملک جا کر اعلیٰ عہدوں پر
 ممکن ہو جائیں اور ان حائیکہ ذیلی خدمتوں پر کار گزار رہ کر انہیں اپنے فرائض کا
 علم نہ ہوا ہو تو اہم ترین عہدوں پر ہمارے اسکاچ بھائی اور جاہل لوگ
 فائز ہو جائیں گے اور پیشہ ورانہ جذبات کا لحاظ کرتے انہیں ملک یا مفوضہ کام
 سے کوئی تعلق ہو گا نہ پہلے ہی سے کوئی معلومات ہوگی اور ان کی خواہش صرف
 یہ ہوگی کہ جلد دولت پیدا کر کے وطن واپس ہو جائیں۔ ملک کی بہبودی اس امر
 میں مضمر ہے کہ جن اشخاص کو وہاں حاکم بنانا مقصود ہو انہیں عالم شباب میں
 صرف امیدوارانہ حیثیت سے بھیجا جائے تاکہ وہ ذیلی امور سے ابتدا کریں اور
 ایک مناسب مدت کے بعد جب وہ قابل ثابت ہوں تو اعلیٰ فرائض ان کے
 تفویض کیے جاسکیں۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے نظام حکومت میں یہ نقص تھا کہ
 اہم ترین خدمات پر بہترین اشخاص کا انتخاب احتیاط کے ساتھ ہونے کے
 باوجود اگر کوئی عہدہ دار اپنی خدمت پر فایم رہتا تو ترقی کسی نہ کسی شکل میں
 گو دیر سے ہی انجام کار بہر کس و ناکس کو مل جاتی تھی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے
 کہ ان عہدہ داروں میں ادنیٰ درجے کی قابلیت رکھنے والے بھی ایسے اشخاص
 تھے جنہیں اپنے فرائض سے کامل واقفیت تھی اور جو کم از کم کسی بذامی کے
 بغیر اپنے بالادست کے زیر نگرانی و اقتدار سالہا سال تک ان فرائض کو
 انجام دے چکے تھے۔ اس طرح اگرچہ نقص مذکور میں کمی ہو گئی تاہم وہ
 بڑی حد تک باقی رہا۔ ایک شخص جو مدوکار کے فرائض سے زیادہ کام انجام
 دینے کی قابلیت نہیں رکھتا اسے تمام عمر مدوکار ہی رہنا چاہیے اور اس کے
 مقابلے میں جدید الخدمت شخص کو ترقی دینی چاہیے۔ اس استثناء کے سوا
 مجھے ہندوستانی تفرقات کے قدیم نظام میں اور کوئی خاص نقص نہیں معلوم ہوتا۔
 اس نظام میں جو بہترین اصلاح کی جاسکتی تھی وہ پہلے ہی کر دی گئی یعنی امتحان
 مقابلہ کے ذریعے اہل امیدواروں کا انتخاب ہونے لگا۔ اس طریق انتخاب
 کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کے محنت کش و قابل اشخاص مل جاتے ہیں
 اور اس کی وہ سری خوبی یہ ہے کہ بجز اتفاقی صورت کے امیدوارانہ خدمات

اور عہدہ داران مقتدر کے درمیان کوئی ذاتی روابط نہیں ہوتے۔

یہ امر کسی طرح بعید از انصاف نہیں ہے کہ جو سرکاری عہدہ دار طریق مذکور پر منتخب ہوں اور تعلیم و تربیت پائیں صرف وہی ان عہدوں کے قابل سمجھے جائیں جن کے لیے ہندوستان سے متعلق علم اور تجربے کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اعلیٰ خدمات کا دروازہ خواہ موقتی غرض کی بنا ہی پر کیوں نہ ہو ان اشخاص کے لیے کھول دیا جائے جو ذیلی خدمات پر کار گزار نہ رہے ہوں تو پھر جس درجہ پر یکے بعد دیگرے با اثر اشخاص کا ایسا ہجوم ہو گا کہ اسے کسی وقت بھی بند رکھنا غیر ممکن ہو جائیگا۔ مذکور بالا اصول سے صرف اس عہدے کو مستثنیٰ رکھنا چاہیے جو سب سے اعلیٰ ہے۔ برطانوی ہند کا وائسرائے ایسا شخص ہونا چاہیے جو پوری انگریزی قوم میں سے منتخب ہو اور جس میں حکومت کرنے کی بہت بڑی عام قابلیت موجود ہو۔ اگر اس میں ایسی قابلیت ہوگی تو وہ دوسروں میں بھی اس کی جانچ کر سکیگا اور منطقی معاملات میں اس خاص علم اور قوت فیصلہ کو جس کے حاصل کرنے کا خود اسے موقع نہ ملے تو خاطر خواہ کام میں لاسکیگا۔ اس امر کی معقول وجہ یہ کہ وائسرائے کا انتخاب (بجربستہ صورتوں کے) مستقل ملازموں میں سے نہیں ہونا چاہیے۔ تمام ملازمتوں میں کم و بیش طبقہ واری تعصبات ہوتے ہیں جن سے اعلیٰ حکمران کو بالاتر درجہ پر چاہیے۔ علاوہ بریں جو اشخاص ایشیا میں اپنی عمر میں گزار چکے ہیں خواہ وہ کیسے ہی قابل و تجربہ کار ہوں ان میں عام تدبیر کے متعلق یورپ کے ایسے ناز و ترقی یافتہ خیالات نہیں پائے جاسکتے جنہیں اعلیٰ حکمران اپنے ساتھ لے جا کر بھارت ہند میں شامل کر کے عہدہ نتائج پیدا کریگا۔ مزید برآں یہ کہ جب یہ حکمران مختلف طبقے کا ہوگا اور خاص کر اس کا انتخاب مختلف حکومت کی طرف سے ہوگا تو اسے جانب داری سے کام لے کر کسی عہدے پر ناجائز تقرر کرنا نہ پڑیگا۔ یہ بڑی ضمانت جو مسدوں پر جائز تقررات سے متعلق تھی تاج اور ایڈمنڈ ایڈامز کی مشترکہ حکومت میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اعلیٰ مقتدر حکام یعنی گورنر جنرل اور گورنروں کے تقررات جو باضابطہ نہ تھے دراصل تاج کی طرف سے ہوتے تھے یعنی یہ تقررات مملکت کی عام حکومت کی طرف سے مل میں آتے تھے نہ کہ درمیانی مجلس کی طرف سے اور تاج کے ایک بڑے

عہدہ دار کو غالباً مقامی ملازمین کے ساتھ کسی قسم کا ذاتی یا سیاسی تعلق نہیں ہوتا تھا بلکہ
 بیانیہ مجلس جس کے اکثر ارکان خود ملک میں ملازم رہ چکے ہوں ایسا تعلق پہلے بھی رکھتی تھی
 اور اس کے لیے اب بھی اس تعلق کا امکان ہے۔ غیر جانبداری کی اس مناسبت میں
 بہت فرق واقع ہو جائیگا اگر حکومت کے سہول ملازمین کو انہیں لڑکپن میں اسید واران
 ملازمت ہی کی حیثیت سے بھیجا جائے زیادہ تر اس طبقے سے منتخب ہونے لگیں
 جس سے والیسراہوں اور گورنروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ابتدائی
 امتحان مقابلہ بھی کافی ضمانت ثابت نہ ہوگا۔ اس امتحان سے صرف جاہل اور نااہل
 لوگ خارج ہو جائیں گے اس کی وجہ سے خاندانی لڑاکے اسی قدر تعلیم و قابلیت کے ساتھ
 جس قدر دوسرے لوگوں نے حاصل کی ہو مقابلے میں شرکت پر مجبور ہونگے البتہ نہایت
 بیوقوف لڑاکا جس طرح ملازمت کلیسا میں باسانی داخل ہو سکتا ہے اس طرح ملازمت ہند
 میں داخل نہ ہو سکیگا لیکن ایک دفعہ اس کے داخل ہو جانے کے بعد غیر معمولی اثر
 کو روکنے کی کوئی صورت باقی نہ رہیگی۔ حاکم مقتدر کو آئندہ جملہ ملازموں سے
 یکساں طور پر ناواقفیت نہ رہیگی بلکہ ان ملازموں کی ایک معقول تعداد سے وہ
 ذاتی طور پر خوب واقف ہوگا اور اس سے بھی زیادہ تعداد سے اس کے سیاسی
 تعلقات ہو گئے۔ بعض خاندانوں اور اعلیٰ طبقوں کے افراد نیز با اثر اشخاص
 علی العموم اپنے ہمسرؤں کے مقابلے میں بہت جلد ترقی کر جائیں گے اور اکثر یہ ہوگا کہ
 وہ ایسے عہدوں پر بھی مامور ہو جائیں گے جن کے وہ اہل نہ ہوں یا جن کے لیے ان سے
 زیادہ اہل لوگ موجود ہوں۔ اسی قسم کے اثرات فوج میں ترقی حاصل کرنے
 کے لیے بھی استعمال کیے جائیں گے اور صرف سادہ لوح اشخاص ہی جو ان کارروائیوں
 کو غیر جانبدارانہ خیال کرینگے ہندوستان میں انصاف کی توقع رکھیں گے۔ میرا خیال
 ہے کہ یہ نقص موجودہ نظام حکومت کے تحت معمولی تدابیر کے ذریعے ہرگز دور
 نہیں ہو سکتا کسی جدید انتظام سے اس قدر اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا جس قدر
 اس حکومت کی بدولت جو دو عملی کہلاتی ہے اس وقت تک کسی وقت کے بغیر
 حاصل ہوتا رہا ہے۔

انڈیا میں انگریزی نظام حکومت کی جو غلط نشان خوبی بیان کی جاتی ہے

دہی ہندوستان کے لیے تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ نظام مذکور کی ترقی کسی پیش بندی کے باعث نہیں بلکہ مسلسل تداویج سے نیران ذرائع کے حسب حال ہونے سے رونما ہوئی ہے جو ابتدا میں مختلف اغراض کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ چونکہ انگریزی نظام حکومت کے نشو و نما کا انحصار اس ملک نہیں تھا جس کی ضروریات کی بنا پر وہ ترقی پذیر ہوا ہو اس لیے اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں اس کے عملی فوائد جاگزیں نہ ہوئے۔۔۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی قسمت میں یہی تھا کہ ایک نیم ہندب محکوم ملک پر ایک ہندب ملک کی حکومت کا صحیح نظر یہ پیش کرنے کے بعد وہ خود فنا ہو جائے۔ یہ قسمت کی نیرنگی ہوگی اگر یہ خیالی نتیجہ اور دو تین پشت کے بعد ہندوستان پر ہمارے تسلط کا واحد ثمرہ بن کر رہ جائے اور ہمارے متعلق آنے والی نسلیں کیوں کہ حسن اتفاق سے ہم نے حکومت کا ایسا بہتر انتظام کیا تھا جس تک ہماری عقلیں رہبری نہ کر سکتی تھیں مگر بیداری کے بعد ہم نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اس نظام کو درہم برہم کر دیا اور جس بہبودی کے حاصل ہونے کی توقع کی جا رہی تھی اسے ہم نے ان اصول کی ناواقفیت کے باعث جن پر اس کا انحصار تھا معدوم ہو جانے دیا۔ یہ غیر ضروری ہے کہ ان تین قوانین پر مفصل بحث کی جائے جو مشاعرہ میں ہندوستان کی بہتر حکومت کے لیے مرتب ہوئے تھے۔ ہماری غرض کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ لارڈ ڈوربن کی حکومت نے ہر دو جماعت کے اکثریات دانوں کی رضا مندی سے جو تیسرا اور آخری قانون منظور کیا تھا اس کی زیادہ اہم دفعات پیش کر دیں۔ ہم نے ذیل میں جان برائٹ کی اس تقریر کا ایک حصہ سبھی درج کر دیا ہے جس میں اس نے کسی قدر غیر رسمی مگر ایسے دلچسپ سیاسی حکاکا اظہار کیا ہے جو ہندوستانی طریق حکومت کی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔

* ہندوستان کی آئندہ حکومت | ہندوستان کی حکومت کے متعلق ہماری

*Source.— Speech of John Bright in the House of Commons, June

جو خواہش ہے اسے عام بول چال میں یوں کہیں گے کہ اس پرنٹھوڑی سی اور روشنی والی جائے۔ ہم حکومت میں زیادہ سادگی اور زیادہ ذمہ داری چاہتے ہیں۔ میں نے اس تجویز پر جو وزیر مال (ڈسٹر ایبل) نے ابتدا میں پیش کی تھی اس لیے اعتراض کیا تھا کہ اس میں صفات مذکور موجود نہ تھیں۔ یہ تجویز اس نظام حکومت سے جسے ہم ختم کر دینا چاہتے تھے اس قدر قریبی مشابہت رکھتی تھی کہ میں اس کی تائید کے لیے آمادہ نہ ہو سکا۔

میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہندوستان میں مرکزی حکومت اور اس کے لیے ایک گورنر جنرل برقرار رکھنے کی بجائے ہم دونوں کو ختم کر دیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے عوض ہم احاطے قائم کر دیں۔ اگر میں وزیر ہوتا (اس مفروضے کو دارالعوام ایک بے لطف صنعت کلام کے طور پر تسلیم کریگا) اور اگر دارالعوام کو مجھ سے اتفاق ہوتا (یہ کبھی ایک ضروری امر ہے) تو میں ہندوستان میں کم از کم پانچ احاطوں کے قیام کی تجویز کرتا اور ان احاطوں کی حکومتوں کو ٹبے اور مشاہرے میں بالکل یکساں رکھتا۔ ان احاطوں کے صدر مقامات غالباً کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور قرار پاتے۔ میں احاطہ مدراس کو بطور مثال پیش کروں گا۔ مدراس کی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے۔ ہم سب کو نقشے پر اس کا محل وقوع معلوم ہے۔ اسے دیگر احاطوں کے مقابلے میں جغرافی حدود کے اعتبار سے زیادہ ترجیحاً دہیوت ہونے کا وصف حاصل ہے۔ اس کے لیے ایک گورنر اور ایک مجلس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر ایک گورنر اور ایک مجلس مقرر کروں گا لیکن ان کے جملہ فرائض کو احاطہ مدراس ہی تک محدود رکھوں گا اور میں مدراس کے ساتھ اس طرح ہر اسلٹ کروں گا کہ گویا مدراس ہی ہندوستان کا واحد خطہ ہے جو اس ملک (یعنی انگلستان) سے متعلق ہے۔ میں اس کے مالیات، اس کے محاصل، اس کی عدالت اس کی پولس نیز اس کے امور عامہ اور فوج کے محکموں کو اس حیثیت سے رکھوں گا کہ گویا وہ ایک ریاست ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے حصے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور انگلستان کی محض تابع تسلیم کی جاتی ہے۔ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہر احاطے کی حکومت انگلستان کے وزیر ہند سے مرسلت کرے اور ہندوستان میں جملہ احاطوں

کے درمیان سلسلہ تار برقی قائم ہو کیونکہ میں معزز لارڈ (لارڈ اسٹانی) کے دفتر اور ہر اس احاطے کے درمیان جس کے وہ صدر ہیں بہت جلد سلسلہ تار برقی کے دیکھنے کی توقع رکھتا ہوں۔ بے شک مجھ سے یہ کہا جائیگا کہ اس قسم کے انتظام میں لائیو و شواریاں حائل ہیں اور مجھے یقین ہے کہ فوجی دشواری کا تذکرہ ضرور کیا جائیگا۔ اس وقت میں فوجی معاملات میں ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ فوجی اشخاص اکثر بڑی غلطیاں کیا کرتے ہیں۔ میں فوج کو اس طرح منقسم کر دوں گا کہ ہر احاطے کی ایک خاص فوج ہوگی جیسی اب ہے البتہ یہ احتیاط کی جائیگی کہ یہ فوجیں الگ الگ رہیں اور مجھے بوقت ضرورت ان تمام فوجوں کو حکومت کے نشان کی تعمیل کے لیے اکٹھا کرنے میں کسی قسم کی چیمپیدگی یا غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہیں معلوم ہوتا۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے جسے ذہن نشین رکھنا ضروری ہے اور وہ مسئلہ ہندوستان کی مجلسوں سے متعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر احاطے کے گورنر کے لیے ایک معاون مجلس ہونی چاہیے لیکن ان سب مجلسوں کی ہیئت ترکیبی موجودہ صورت سے مختلف ہوگی۔ میں ایک ایسی مجلس چاہتا ہوں جس کی کارروائی راز میں نہ رہے۔ معزز لارڈ نائیدہ لندن (یعنی لارڈ جان ریل) نے ایک رات کو بعض جگہ ایسے استعمال کیے تھے جن سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کی سبیل سروس کے انتظام کو اس کی ساری خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے میں مجھے معزز لارڈ سے قطعی اختلاف ہے۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ احاطوں کی حکومت احاطوں کے باشندوں کے لیے ہو اور یہ حکومت تاج کے سبیل ملازموں کے لیے نہیں بلکہ انگلستان کے ان غیر سرکاری تجارتی طبقوں کے لیے جو وہاں بس گئے ہیں نیز ہر احاطے کے دو یا تین کروڑ باشندوں کے لیے ہو۔

اب فرض کیجئے کہ گورنر جنرل کا عہدہ باقی نہیں رہا، احاطے قائم ہو گئے، تمام گورنر عہدے اور رتبے کے لحاظ سے مساوی ہیں اور میرے بیان کردہ طریقے کے مطابق ان کی مجلسیں بھی قائم ہو گئی ہیں تو کیا یہ فرض کرنا

بعید از عقل ہو گا کہ تعویق جواب تک آپ کی ہندوستانی حکومتوں کے حق میں ایک بہت بڑھی لغت سمجھی گئی ہے تقریباً پوری طرح معدوم ہو جائیگی۔ کلکتہ یا شملہ میں ایک گورنر جنرل رہنے کی بجائے جو کبھی سارے ملک کا دورہ نہ کرتا ہو، ملک کے متعلق جس کا علم بہت محدود ہو اور وہ تھوڑا سا علم بھی دیگر سرکاری ذرائع کی بدولت حاصل ہو کیا یہ خیال معقول نہ ہو گا کہ حکومت مذکور بالا صورت میں اس نظام کی بہ نسبت جواب تک جاری و ساری ہے اپنے تمام فرائض اور تمام شعبہ ہائے ملازمت میں زیادہ تر براہ راست کار فرما رہیگی؟ آپ کے شعبہ عدالت کا نظم و نسق جو بہت زیادہ بدنام ہے اس حالت میں ہرگز زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکتا تھا اگر آپ کے احاطوں کے گورنر مختار ہوتے۔ یہی حالت پولس تعلیم، امور عامہ اور ہر اس شے کی ہے جو صنعت و حرفت کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے اور یہی حالت آپ کے انتظام محاصل کی ہے۔ اب آپ ہر احاطے میں خوش انتظامی کے لیے مثل رقابت دیکھینگے۔ مدراس کا گورنر جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گا تو وہ مسرت کے ساتھ ان امور کا اظہار کرے گا کہ اس کے احاطے کے باشندے آسودہ حال ہیں سارے احاطے میں تہذیب و تمدن ترقی پذیر ہے، مگر اس اور رفاه عام کی صورتیں بڑھتی جا رہی ہیں، لوگوں میں صنعت و حرفت کی طرف زیادہ توجہ ہو رہی ہے اور درآمد و برآمد میں متوازن اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی قسم کے جذبات بھی اور باقی احاطوں کے گورنروں پر بھی غالب رہیں گے اور اس طرح آپ سارے ہندوستان میں جیسا کہ میں نے پیشتر بھی کہا ہے خوش انتظامی کے لیے رقابت دیکھینگے۔ ہوا و ہوس کے اس شدید جذبے کا آپ سدباب کر دینگے جس نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ کوئی گورنر اس قدر قوی نہ ہو گا کہ آپ کے قابو سے باہر ہو جائے اور نہ کسی میں اتنی طاقت ہوگی کہ جب چاہے لڑائی چھیڑ دے۔ جنگ اور کسی علاقے کے الحاق کی موافقی اگر طبعاً عمل میں نہ آئے تو بڑی حد تک یہ دونوں چیزیں ضرور رک جائیں گی اور میں اپنے ایقان کی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ ہندوستان

کے لیے ایک ایسی بہتر اور پائیدار حکومت کی بنیاد ڈال دیں گے جو اسے انگلستان کے زیر اقتدار آنے کے بعد سے اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے ۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے معاملے میں میری ذاتی تجویز یا معزز لارڈ (لارڈ اسٹانی) کی تجویز کے متعلق محض حکومت کے کل پرزے کافی نہیں ہیں۔ ہمیں اہلکاروں دفتر کی ضروری چیزوں اور مراسلوں کے علاوہ کچھ اور بھی درکار ہے۔ ہم جو چیز چاہتے ہیں اسے میں انگلستان کے لیے ایک نیا جذبہ اور ہندوستان کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی مسلک کہوں گا۔

ہندوستان پر ہماری حکومت آئندہ کتنی بھر انگریزوں کے لیے ہونی چاہیے نہ سبوں لازموں کے لیے جن کی تعریف کے گیت اس ایوان میں ہمیشہ سننے جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ ہندوستان پر انگلستان کی فلاح کے لیے حکومت کریں لیکن فلاح انگلستان فلاح ہند کی راہوں سے حاصل ہونی چاہیے۔ ہندوستان سے ہمارا جو تعلق ہے اس سے متمتع ہونے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹا جائے اور دوسرا یہ کہ ان کے ساتھ تجارت کی جائے۔ میں ان کے ساتھ تجارت کر کے فائدہ اٹھانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن تجارت کے ذریعے ہندوستان سے انگلستان کو مالدار بنانا ہے تو خود ہندوستان کو کبھی مالدار ہونا چاہیے اور ہندوستان صرف اسی وقت مالدار ہو سکتا ہے جبکہ دیانت کے ساتھ عدل گتری عمل میں آئے اور جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے۔

* * *

اب غالباً مجھ سے یہ کہا جائیگا کہ میں عجیب و غریب ایویشن کر رہا ہوں جو کسی طرح بھی حکومت کی عام روش کے مطابق نہیں۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں مگر ہم اب ایسی حالت پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں اس عام روش سے علیحدگی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر ملک کی تاریخ میں افراد کی زندگیوں کی طرح ایسے حالات اور مواقع پیش آتے ہیں جہاں ہمت اور عمل کے ذریعے مشکلات سے نجات ملی حاصل ہوتی ہے اور اب میرے خیال میں تاج انگلستان کو ذمہ دار و زرا کے

مشورے پر کار بند ہو کر ایک ایسا زبردست و غیر معمولی طریق عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ پریشانی رفع ہو جائے جو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے لوگ ہیں پسند نہیں کرتے لیکن ہم انہیں چھوڑ دیں تو وہ یہ نہیں جان سکتے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ان کی حالت ایسی سمیٹوں کی مانند ہوگی جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آپ نے مغلوب کر لیا ہے۔ آپ پر ان کے زبردست حقوق ہیں جنہیں آپ فراموش نہیں کر سکتے اور اگر آپ ان حقوق سے بے اعتنائی کریں تو یقیناً جانیں گے کہ افراد کی طرح اگر اقوام پر کوئی عدالت مقرر ہو اور میرا عقیدہ ہے کہ ضرور ہوگی تو زمانہ قریب میں ہماری آنے والی نسلیں لازماً اس کو ناہمی کا خمیازہ کھائیں گی جو ہندوستان کے باشندوں سے متعلق فرائض کی انجام دہی میں ہم سے سرزد ہوئی ہے۔

اس مسئلے پر میں نے اپنے خیالات و آراء جس طریقے پر ظاہر کیے ہیں اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مسئلے کا پورا حق ادا نہیں ہوا۔ مجھے اس کے متعلق غور کرنے میں وقت محسوس ہوئی ہے اور اب اس پر تقریر کرنے میں بھی وقت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ یہ مسئلہ اس قدر وسیع ہے کہ ایک شخص ایک معمولی تقریر کے دوران میں اس کے تمام پہلوؤں پر خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا خواہ وہ سیاسی مسائل پر غور و غوض اور بحث و محصل کرنے کا کتنا ہی عادی کیوں نہ ہو۔ سارے ہندوستان میں اب جو خطرناک شورش پھیلی ہوئی ہے اسے رفع کرنے کے لیے اور جو لوگ آپ کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں ان کی اطاعت حاصل کرنے کے لیے میرے نزدیک جن فوری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے انہیں میں نے بیان کر دیا ہے۔ اب میں نہایت مدق دل کے ساتھ اپنے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ایک مزید فوج کی فراہمی کے عوض تدابیر مذکور کے اعلان سے امن و امان کی بحالی میں زیادہ مدد ملے گی اور انہیں تدابیر کو کامل طور پر دیانت کے ساتھ بروئے عمل لانے سے آپ ہندوستان میں اپنی قوت برقرار رکھ سکیں گے۔ میں نے اس حکومت کا خاکہ پیش کر دیا ہے جس کی بنا پر میں ہندوستان کے نظم و نسق کو کامل ذمہ دار اور

ترقی پذیر بنانا چاہتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی حکومت صرف جزوی طور پر حاصل ہو سکتی ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ جس حکومت کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ اُن اغلاط اور قبائح سے بری ہوگی جو آپ کی گزشتہ حکومت بند میں نمایاں رہی ہیں اور جن سے آپ کی بدنامی ہوئی ہے۔ میں نے اس اہم و سنجیدہ مسئلے پر بہت غور و خوض کیا ہے۔ میں ایوان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے پر نہ صرف اب اس مسودہ قانون کی منظوری کے دوران ہی میں غور کرے بلکہ اس اجلاس کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے آئندہ سال کے اجلاس تک غور کرتا رہے جبکہ اس موضوع عظیم سے متعلق مزید قوانین ضرور وضع ہونگے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس مسئلے کے حل پر اس ملک انگلستان کی جس کے ہم باشندے ہیں اور جس سے ہم سب کو بہت محبت و انس ہے آئندہ بھلائی یا برائی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مشرقی مبادیوں میں آپ اپنی فوجی قابلیت کی بہت دعووم چاہتے ہیں اور اس کا کافی ثمرہ بھی آپ نے حاصل کر لیا ہے خواہ وہ قابل قدر ہو یا نہ ہو۔ اب میں اس سے بہتر بلند تر اور مقدس تر شے کی جانب آپ کی توجہ منقطع کرانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اس شان و شوکت کی طرف مدعو کرتا ہوں جو فتح و ظفر کے سرخ بازوؤں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس کی بنیاد ان ٹھوس اور مستقل فوائد پر قائم ہوتی ہے جن کی نسبت مجھے یقین ہے کہ اگر انگلستان کی پارلیمنٹ چاہے تو وہ ہندوستان کی بے شمار آبادی کو ان سے متمتع کر سکتی ہے۔

* ہندوستان زیر حکومت تاج | تاج کو حکومت کی منتقلی چھلاتے

اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں ہیں یا اس کی حکومت کے تحت ہیں ان سب کی حکومت اور اس حکومت سے متعلق جملہ اختیارات جو من ماب ملک مظہر کمپنی مذکور کو حاصل ہیں یا جنہیں وہ استعمال کرتی ہے آئندہ کمپنی

کو حاصل رہینگے نہ وہ ان کا استعمال کر سکیں گے۔

نیز وہ تمام علاقے جو کمپنی مذکور کے قبضے میں ہیں یا اس کی حکومت کے تحت ہیں اور ان علاقوں کے متعلق جملہ حقوق جو قانون ہند کی نامنظوری کی صورت میں کمپنی مذکور کو حاصل رہتے یا جنہیں وہ کام میں لاسکتی تھی اب ملکہ مغلہ کے تفویض کیے جاتے ہیں اور محدودہ کے نام سے انہیں استعمال کیا جائیگا۔

۳۔ وزیر ہند: ملکہ مغلہ کے خاص وزیروں میں سے ایک وزیر کو جو اس صورت کے کہ قانون ہذا میں کوئی نیا انتظام کیا جائے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے اور ان تمام فرائض کو وہ انجام دیگا جو ہندوستان کی حکومت یا محال سے کسی طرح بھی متعلق ہوں اور قانون ہذا کے تحت جو عہدہ دار مقرر ہوں یا برقرار رہیں ان سب پر اسے وہ جملہ اختیارات حاصل رہینگے جو ایٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظام یا کمپنی مذکور کی مجلس سرمایہ داران تنہا یا مامورین برائے معاملات ہندی ہدایت یا ان کی منظوری یا رضا مندی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور جن کا تعلق ہندوستان کی حکومت یا محال سے اور کمپنی مذکور کے عہدہ داروں اور ملازموں سے تھا نیز اسے وہ تمام اختیارات حاصل رہینگے جو محض مامورین مذکور استعمال کر سکتے تھے۔

۴۔ مجلس ہند: قانون ہذا کی اغراض کے لیے ایک مجلس کا قیام عمل میں آئیگا جو بندہ ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس مجلس کا نام مجلس ہند ہوگا۔

۱۰۔ ارکان مجلس کی زیادہ تعداد کے لیے سکونت ہندی لازمی شرط اور جو اشخاص مجلس نظام کی طرف سے منتخب ہوں اور جو اشخاص قانون ہذا کے نفاذ کے بعد ملکہ مغلہ کی طرف سے پہلے پہل بحیثیت ارکان مجلس مقرر ہوں ان کی زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی ہوگی جو ہندوستان میں کم از کم دس سال تک ملازمت کر چکے ہوں یا سکونت پذیر رہے ہوں اور تاریخ تفرز سے قبل انہیں ہندوستان چھوڑے ہوئے دس سال سے زائد نہ گزرے ہوں۔

۱۱۔ مجلس کے فرائض: مجلس وزیر ہند کی ہدایت اور قانون ہذا کی شرائط کے تحت ان امور کے اجرا کا انتظام کریگی جو سلطنت متحدہ (برطانیہ عظمیٰ) میں ہندوستان کی حکومت اور اس کی مراسلت کے متعلق طے پائیں لیکن ہر حکم

یامراسلے پر جو ہندوستان بھیجا جائے خاص وزیروں میں سے کسی نہ کسی کے دستخط ثبت ہونے لازم ہیں اور اس صورت کے سوا جو قانون ہذا میں صریحاً بیان کی گئی ہو ہندوستان کی حکومت سے متعلق سلطنت متحدہ (برطانیہ عظمیٰ) کے ہر حکم پر قانون ہذا کے تحت وزیر مذکور کے دستخط لازماً ثبت ہونگے اور ہندوستان کی حکومتوں اور احاطوں کی طرف سے جملہ مراسلات اور ہندوستان کے دیگر مراسلات جو قانون ہذا کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں مجلس نظم یا اس کی مجلس راز کے نام موسوم ہوتے تھے اب اس وزیر کے نام موسوم ہونگے۔

۲۴۔ طریق کار: ہر حکم یا مراسلہ جسے ہندوستان بھیجنے کی تجویز کی گئی ہو اور سلطنت متحدہ کے اندر قانون ہذا کے تحت وزیر ہند کا ہر حکم جس کا جاری ہونا قرار پایا ہو اگر مجلس کے اجلاس میں پیش نہ کیا گیا ہو تو اس کی روانگی یا اجرا سے قبل تمام ارکان مجلس کے ملاحظے کے واسطے مجلس کے کمرے میں سات روز تک رکھا جائیگا پھر ان صورتوں کے جو بعد کو مذکور ہونگی اور ہر رکن مجلس کے لیے یہ قانوناً جائز ہوگا کہ مذکور بالا ہر حکم یا مراسلے کے متعلق اپنی رائے ایک کتاب المائے میں جو اسی غرض کے لیے رکھی جائیگی درج کرے اور ہر ایسی درج شدہ رائے کی ایک نقل بہت جلد وزیر ہند کے پاس بھیجی جائیگی۔

۲۵۔ وزیر ہند کے خاص اختیارات: اگر وزیر ہند کے کسی مجوزہ امر کے خلاف ارکان مجلس کی زیادہ تعداد اپنی آرا کا حسب بیان بالا اندراج کرے اور وزیر ہند کو غلبہ آرا سے اتفاق نہ ہو تو وہ اس کے خلاف عمل کرنے کی نسبت اپنی وجوہ قلمبند کریگا۔

۲۶۔ اشد ضروری کارروائیاں: بشرطیکہ جہاں وزیر ہند کو یہ معلوم ہو کہ کسی مراسلے کی روانگی یا ایسے حکم کا اجرا جس کے لیے مجلس کے اجلاس میں غلبہ آرا لازم نہیں ہے فوری درکار ہے تو مراسلہ بھیجا جاسکتا ہے یا حکم نافذ کیا جاسکتا ہے بغیر اس کے کہ اس مراسلے یا حکم کو مجلس کے کسی اجلاس میں پیش کیا جائے

یاسات روز تک اسے رکھا جائے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس مراسلے یا حکم کی روانگی یا اجراء کی ناگزیر وجوہ وزیر ہند ضبط و تحریر میں لائیکا اور ہرنگن مجلس کو ان وجوہ کی اطلاع دی جائیگی بجز ان حالات کے جو آئندہ معرضِ تحریر میں آئیں گے۔

۲۷۔ راز کی کارروائیاں: نیز بشرطیکہ کوئی حکم جس کے لیے مجلس کے اجلاس میں غلبہ آرا لازم نہیں ہے اور جو قانون ہذا کے نافذ نہ ہونے کی صورت میں من جانب مامورین برائے معاملات ہند مجلسِ نظام کی مجلسِ راز کے توسط سے ہندوستان کی حکومتوں یا احاطوں یا کمپنی مذکور کے عہدہ داروں یا ملازموں کو بھیجا جاسکتا تھا قانون ہذا کے نفاذ کے بعد ان حکومتوں یا احاطوں یا ہندوستان کے عہدہ داروں یا ملازموں کو وزیر ہند کی طرف سے بھیجا جاسکتا ہے بغیر اس کے کہ اس حکم کو مجلس کے اجلاس میں پیش کیا جائے یا ارکانِ مجلس کے ملاحظے کے واسطے رکھا جائے اور بغیر اس کے کہ وجوہ قبضہ کی جائیں یا حسبِ بیان بالا کوئی اطلاع نامہ جاری کیا جائے۔

۲۹۔ انگلستان میں تقررات: ہندوستان کے گورنر جنرل اور احاطوں کے گورنروں کا تقرر جواب مجلسِ نظام کی جانب سے ملکہ معظمہ کی منظوری کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مختلف احاطوں کے لیے ایڈولٹ جنرلی کا تقرر جواب مامورین برائے معاملات ہند کی رضا مندی سے عمل میں آتا ہے آئندہ من جانب ملکہ معظمہ نہا ہی جبر و دستخط کے ساتھ ہوا کریگا۔

صوبوں یا علاقوں کے لفٹیننٹ گورنروں کا تقرر ہندوستان کا گورنر جنرل ملکہ معظمہ کے ایسا سے کریگا اور یہ تمام تقررات ان شرائطِ قابلیت پر منحصر ہونگے جو اب قانون کی رو سے اس قسم کے عہدوں کے لیے ضروری تصور ہوں۔

۳۰۔ ہندوستان میں تقررات: ہندوستان میں عہدوں، فوجی خدمتوں اور دیگر ملازمتوں کی ساری ماموریاں نیز تمام ترقیاں جو اب قانون کی رو سے یا کسی ضابطے، عہدہ یا مہتمم و رواج کی بنا پر ہندوستان کے کسی حاکم مجاز کی طرف سے عمل میں آ رہی ہیں آئندہ بھی ہندوستان میں

ایسے ہی حاکم کے ذریعے انھیں شرائط قابلیت، قیود اور حدود کے تحت ہوتی رہیگی جو اب اس قسم کے تقررات کے لیے ناگزیر ہیں :

۳۲۔ ہندوستان کی سیول سروس میں داخلہ، قانون ہذا کے نافذ ہو جانے کے بعد ممکنہ جملت سے وزیر ہند باجلاس کونسل سر دست مامورین برائے معاملات ہند کے مشورے اور مدد کے ساتھ ملکہ مظہمہ کے حکم باجلاس کونسل معصومہ ۲۱ مئی ۱۹۵۵ء کی تعمیل میں ضوابط اس غرض سے مرتب کرے گا کہ تاج کی سیول سروس میں اشخاص کے داخلے کا باقاعدہ انتظام عمل میں آئے اور ملکہ مظہمہ کی ملک نژاد رعایا میں سے ایسے تمام اشخاص کو (ایسی عمر اور قابلیت کی بنا پر جس کا اس مخصوص میں یقین ہو) تسلیم کیا جائے جنہیں ہندوستانی سیول سروس کے جملوں کے امیدوار بننے کی خواہش ہو اور جن کا بحیثیت امیدوار امتحان لیا جائے نیز علوم کے وہ شعبے جن میں ان امیدواروں کا امتحان لینا ضروری ہوگا مقرر کیے جائیں اور علی الاعوام اس طرح کے امتحانات کا انتظام، انعقاد آخری مذکور بالا مامورین یا ایسے قابل افتخار شخص کے زیر نگرانی کیا جائے جو فی الوقت ان ضوابط کو بروئے عمل لاتا ہو جنہیں ملکہ مظہمہ کی طرف سے تاج کی سیول سروس کی ادنی خدمات کے تقررات سے متعلق امتحان صداقت نامے یا قابلیت کی دیگر آزمائش کے بارے میں وقتاً فوقتاً نافذ کیا جائے۔ جن امیدواروں کی نسبت مامورین مذکور یا مذکور بالا دیگر اشخاص یہ تصدیق کر دیں کہ اس قسم کے ضوابط کے سخت وہ مستحق خدمات ہو سکتے ہیں تو ان کے اس معیار قابلیت کے مطابق جو امتحان سے ظاہر ہوا ہے ان کے تقرر کی سفارش کی جائیگی اور وزیر ہند باجلاس کونسل کی جانب سے صرف ایسے ہی اشخاص کا جن کی حسب بالا تصدیق ہو چکی ہو ہندوستان کی سیول سروس میں داخلہ یا تقرر ہوا کرے گا۔

۳۱۔ محاصل ہند پر وزیر ہند کی نگرانی، ہندو سرحدیں ہند کا صرف وزیر ہند باجلاس کونسل کے زیر نگرانی رہے گا اور کونسل کے اجلاس میں بلند آواز کے بغیر ایسے محاصل کے یا کسی اور جائیداد کے جو قانون ہذا کی رو سے وزیر ہند باجلاس کونسل کے قبضے میں آئے کسی حصے کا عطیہ یا تقصیر نہیں کی جائیگی۔

۵۳۔ پارلیمنٹ میں حساب کی سالانہ پیش کشی، ہر سال یکم مئی کے بعد

ابتدائی چودہ یوم کے اندر جبکہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہونا ہو وزیر ہند باجلاس کونسل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے محاصل ہند کی سالانہ آمدنی کا حساب اُس مالی سال کی بابت پیش کرے گا جو آخری ختم شدہ سال کے ماقبل ہو اور اس حساب میں مختلف امارتوں یا محکومتوں کے لحاظ سے مدات متعلقہ کی تفریق ہوگی نیز انگلستان و بیرون انگلستان میں حکومت ہند سے متعلق کل سالانہ جمع و خرچ کا حساب مدات متعلقہ کی تفریق کے ساتھ بتایا جائیگا اور اس میں گزشتہ مالی سال کے حساب کا جدید ترین موازنہ، قرضے کی رقم جو محاصل ہند پر عائد ہوتی ہیں ان رقم میں سے ہر ایک کی شرح سود اس سود کی سالانہ رقم، ہر حالے یا حکومت کے اٹائے اور قرضے کی حالت اسے اُن تازہ ترین ہدایات کے مطابق جو اس بارے میں وصول ہوئی ہوں انگلستان یا بیرون انگلستان میں حکومت ہند کی اغراض کے لیے کام میں لانے کی کیفیت نیز وزیر ہند باجلاس کونسل کے محلے کی فہرست اور اس محلے کے اشخاص کے مشاہرے اور سمجھنے والوں کے مدارج کے لحاظ سے واجب الادا ہوں یہ سب امور مذکور ہونگے، اور اگر سالانہ پچاس پونڈ یا زائد کے جدید یا اضافہ شدہ مشاہرے یا وظیفے ایک سال کے اندر منظور یا زمرہ نو مقرر کیے گئے ہوں تو ایسے ہر سال کے حساب کے ذیل میں شرح و بسط کے ساتھ ان کی تفصیلات خاص طور پر درج کی جائیں گی نیز اس حساب کے ساتھ ہندوستان کے ہر حالے و ضلع کی تفصیلی رُو وادوں سے ایک تخمینہ کیفیت مرتب کر کے ایسی شکل میں رکھا جائیگا جو ہندوستان کے ہر حالے کی اخلاقی و مادی ترقی اور عام حالت کی بہترین منظر ہو۔

۵۵۔ محاصل ہند واقعی محلے کی مدافعت کے سوا بیرون ہند کی فوجی کارروائیوں کے لیے استعمال نہ ہونگے، بلکہ منظمہ کے ہندوستانی مقبوضات پر واقعی محلے کی روک تھام یا اس کی مدافعت کے سوا یا دیگر ناگہانی و شدید ضرورت کے تحت محاصل ہند پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی رضا مندی کے بغیر کسی ایسی فوجی کارروائی کے عائد کردہ مصارف پورے کرنے کے لیے استعمال نہ ہونگے جو مقبوضات نوکرو کی سرحد سے باہر افواج کلہ منظمہ کی طرف سے عمل میں آئے۔

